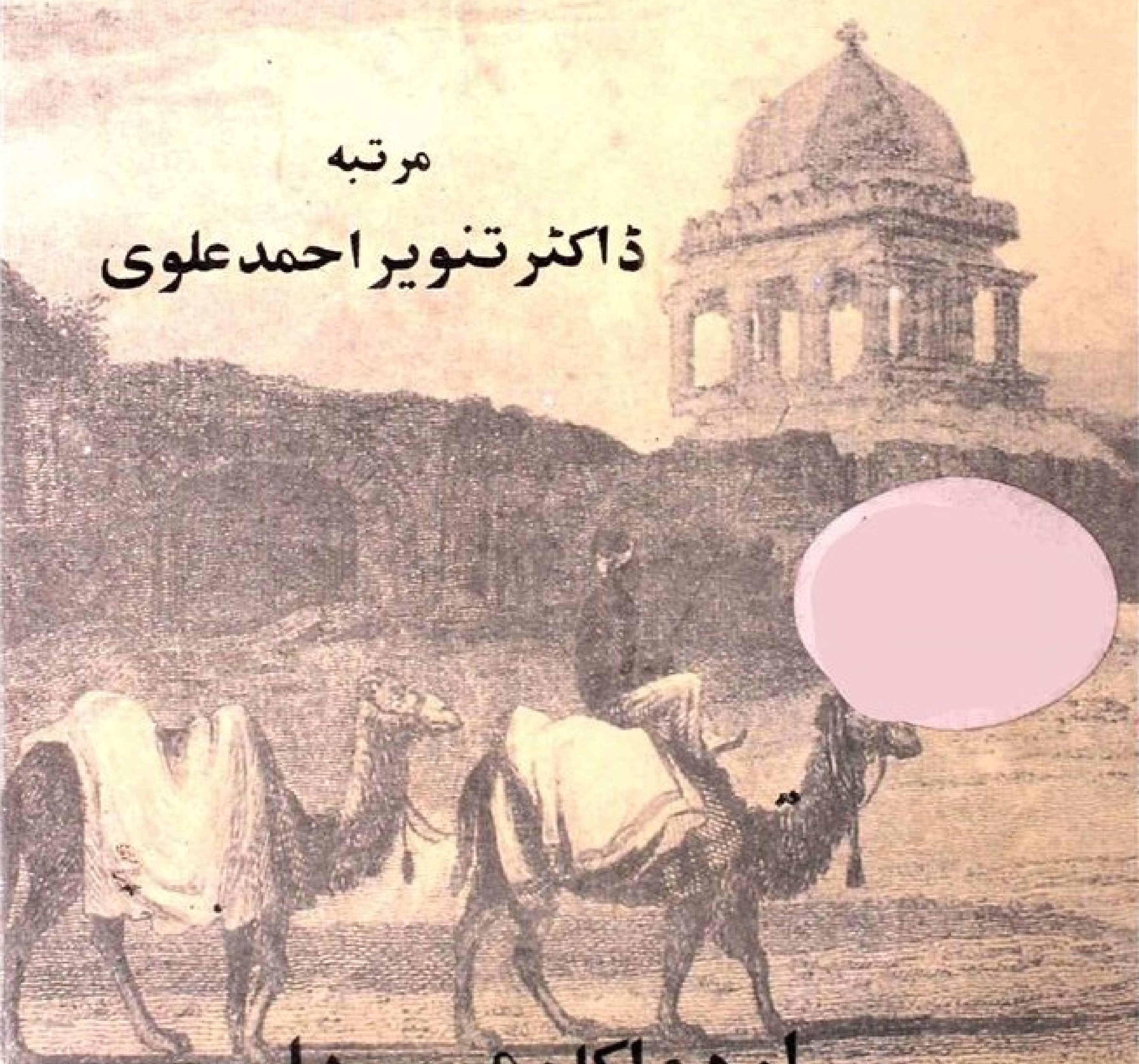
سفرناموں میں دہلی

(جلد دوم)

مرتبہ

ڈاکٹر تنویر احمد علوی



اردو اکادمی، دہلی

سفرناموں میں دہلی

جلد دوم

مرتبہ
ڈاکٹر تنویر احمد علوی

اردو اکادمی دہلی

سلسلۂ مطبوعات اردو اکادمی دہلی ۵۸

SAFAR NAMON MEIN DELHI
EDITED BY - DR. TANVEER AHMED ALVI
PUBLISHED BY - URDU ACADEMY, DELHI
PRINT - 1994
PRICE - RS. 90.00

سنہ اشاعت : ۱۹۹۴ء
قیمت : ۹۰ روپے مکمل سیٹ (دو جلدوں میں)
طباعت : سیما آفسیٹ پریس، دہلی
ناشر و تقسیم کار : اردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

ISBN 81-7121-092-9 VOL. II

نگارشات

جلد دوم

شاہ جہاں آباد کی سیاحت

(نومبر۔ دسمبر ۱۷۹۴ء)

ٹیو ننگ

(ڈاکٹر محمد عمر)

(ان صفحات میں اُس شاہ جہاں آباد کی تصویر پیش کی گئی ہے جس کی عکاسی ٹیو ننگ نے اپنے سفر نامہ میں ذاتی مشاہدہ کے تحت کی ہے۔ ٹیو ننگ نے اپنے بیان میں بعض تاریخی باتوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی تاریخی واقعات میں اہمیت ہے لیکن تاریخی باتوں کو یہاں اس لیے پیش نہیں کیا گیا تھا کہ وہ باتیں اس نے دہلی کے باشندوں سے سنی تھیں مزید برآں اُن واقعات کا نہ تو وہ شاہد تھا اور نہ وہ اس زمانے میں وقوع پذیر ہوئے تھے جس زمانے میں اس کا قیام دہلی میں (لہٰذا ان واقعات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے) جہاں تک اس کے تاثرات کا سوال ہے۔ انہیں حتی الامکان من و عن قلم بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ان بیانات کی روشنی میں قارئین کے سامنے دلّی کی صحیح تصویر آجائے)

تھومس ٹیو ننگ، ریچارڈ ٹیو ننگ کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ اسٹرانڈ کا باشندہ تھا جو انگلستان (لندن) میں ایک مقام ہے تھومس ٹیو ننگ کی ولادت ۱۷۷۶ء میں ہوئی تھی۔ اس نے "رگبی کالج" میں تعلیم و تربیت پائی تھی ۱۷۹۲ء میں ہندوستان کی ایسٹ انڈیا کمپنی میں وہ ملازم ہوا اور اس حیثیت سے ہندوستان آیا۔ ۴ر اگست ۱۷۹۳ء کو وہ کلکتہ پہنچا اور وہاں سے شانتی پور گیا جہاں اس کو افسر اعلیٰ کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔ یہ مقام صوبہ بنگال میں واقع ہے۔ بحیثیت سفیر وہ ۲۹ر نومبر ۱۷۹۴ء کو دہلی پہنچا اور ۵ر دسمبر ۱۷۹۴ء تک اس کا یہاں قیام رہا۔

اس نے اس دوران دلی شہر اور قدیم دہلی اور اس کے قرب و جوار کے علاقے کا دورہ کیا اور قابل دید عمارتوں، باغوں، بازاروں، گلیوں، محلّوں، مدرسوں، مسجدوں، حویلیوں وغیرہ کو دیکھا اور

اُن سب چیزوں کا اس نے مجملاً اپنے سفر نامے میں ذکر کیا ہے۔
چونکہ ٹیونگ آگرہ ہوتے ہوئے دہلی پہنچا تھا۔ اس لیے شاہ جہاں آباد آنے کے راستے میں سب سے پہلے اسے ہمایوں کا مقبرہ اور سرائے عرب نظر پڑی اس نے ان عمارتوں کی سیر کی۔ جب وہاں سے آگے بڑھا تو دور سے ہی اُسے شاہجہاں آباد نظر آیا۔ جب وہ شہر پناہ کے ایک دروازے کے قریب پہنچا تو کئی محافظ سپاہی آکر جمع ہو گئے اور اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ان میں سے ایک شخص جو عہدہ دار تھا، آگے آیا اور ٹیونگ سے یہ بات کہی کہ گورنر کی اجازت کے بنا شہر میں داخل ہونا منع ہے۔ گورنر دہلی کی قیام گاہ شہر سے تھوڑی دور باہری علاقے میں تھی۔ لہٰذا ٹیونگ نے اپنے محافظ دستے کے جمعدار کو گورنر کی خدمت میں بھیجا اور اس کے ہمراہ دو چپراسی کر دیے جو سرکاری وردی پہنے ہوئے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہونے کی بنا پر ان کے بازوؤں پر بلّے لگے ہوئے تھے۔ بہت دیر تک ٹیونگ مع اپنے ہمراہیوں کے دھوپ میں کھڑا رہا کیوں کہ دھوپ سے بچنے کے لیے وہاں کسی سائبان کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کافی دیر کے بعد جمعدار واپس آیا۔ اس کے ساتھ ایک افسر تھا جس نے آکر گورنر کی طرف سے بہت بہت سلام عرض کیا اور ایک اجازت نامہ اس کی خدمت میں پیش کیا فوراً انھیں شہر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔
اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ انھیں کس مقام پر ٹھہرایا جائے اور ایک عہدہ دار اس خدمت کے لیے مامور ہوا تھا کہ وہ ٹیونگ کو جائے قیام تک پہنچا دے غرض وہ شہر میں داخل ہوا۔ بہت سی گلیوں اور کوچوں سے ہوتا ہوا وہ اس محل کے دروازے کے قریب پہنچا جو اس کے قیام کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ ٹیونگ نے اس محل کا نام نہیں دیا۔
یہ کسی شہزادے کی حویلی تھی جو شہر میں واقع تھی۔ بہر حال اس محل کے سامنے ایک چوک تھا جہاں ایک عمدہ باغ تھا۔ اس باغ کے ایک سرے اور اس عمارت سے ملحق ایک خوبصورت بارہ دری یا شہ نشین تھی جس میں ایک بڑا عالی شان کمرہ تھا جس کے سامنے باغ کی سمت ایک بڑا ورانڈہ تھا۔ اس سے ملحق کئی چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ چونکہ چار ماہ اور دس دن کے طویل اور تھکان پیدا کرنے والے سفر کے بعد وہ اس مقام پر پہنچا تھا اس لیے یہ قیام گاہ

بقول اس کے بہت سکون بخش ثابت ہوئی۔

اس شاہانہ عمارت میں وہ بڑے اطمینان اور آرام سے ٹھہر گیا۔ سید رضی خاں نامی ایک عہدہ دار ان کی خدمت کے لیے مقرر ہوا جو اس محل میں سکونت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے حکم سے مہمان اور اس کے ہمراہیوں کے لیے ہندوستانی چارپائیاں اور دوسری ضروری چیزیں فراہم کر دی گئیں۔ اس بڑے کمرے کے بائیں سمت ٹیونگ نے اپنی چارپائی بچھوائی سفری کرسی اور میز کو وسط میں رکھوایا۔ اس کمرے کے بیشتر حصے پر ایک بیش قیمت قالین بچھی ہوئی تھی۔ دالان کی طرف رخ کر کے وہ وہاں بیٹھ گیا جہاں سے اسے باغ کا منظر نظر آتا تھا درختوں میں پھل لدے ہوئے تھے جن کے چھلکے سنہری تھے یہ جائے قیام بہت دلفریب تھی۔ مہمان کے ہمراہی ان درختوں کے خیابانوں میں چہل قدمی کر کے بہت محفوظ ہو رہے تھے کیوں کہ اتنے طویل سفر کی بنا پر وہ تھکے ہوئے تھے۔ ان میں بعض ٹیونگ کے قریب اور بعض باغ کے جانے کی راستے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

۳۰ رنومبر کو صبح سویرے ایک معزز شخص، زرق برق لباس پہنے اور کئی خدمت گاروں کو ہمراہ لیے مہمان کی قیام گاہ پر آیا۔ اس بات سے مہمان کو مطلع کیا گیا۔ وہ اس کے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھے۔ باہمی علیک سلیک کے بعد مہمان اس شخص کو اپنے ہمراہ کمرے میں لائے اور اپنے قریب بٹھایا اس شخص نے کہا کہ وہ صرف تسلیمات کے لیے حاضر نہیں ہوا اسے مزید کچھ خدمات بتائی جائیں تاکہ وہ ان سے متعلق ضروریات کو پورا کرے۔ یہ سید رضی خاں اعلیٰ ذہانت اور فراست اور اپنے عہدے کی مناسبت سے عمدہ موقر اطوار کا حامل ایک شخص تھا۔ اس سے پہلے اس نے بہت اہم اور نازک سفارتی فرائض انجام دیے تھے اور اب وہ مادھوراؤ سندھیا کے شاہی دربار میں برطانوی سفارت کے نمائندہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ مہمان نے یہ بات سوچی کہ بادشاہ سے اس کی ملاقات کرانے اور گفتگو میں ترجمانی کرنے کے لیے اس شخص سے مناسب کوئی دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں مہمان نے سید رضی خاں سے اپنی خواہشات ظاہر کیں اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کی آمد کے سلسلے میں مناسب اقدام کریں۔ بادشاہ کو یہ بتایا جائے کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک عہدہ دار

ہے اور کمانڈر انچیف کے ایما پر وہ دہلی پہنچا ہے۔ جس کے پس پردہ بعض سیاسی مسائل ہیں جن کو وہ بادشاہ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہے۔ مہمان نے خان موصوف سے اس بات کی بھی درخواست کی کہ وہ دہلی کے کسی تعلیم یافتہ شخص سے اس کی ملاقات کرادیں جو شہر کے گرد و نواح میں سیر و تفریح کے لیے جب وہ جائے تو وہ اس کے ہم رکاب ہوسکے اور دربار میں بادشاہ کی خدمت میں پیشی کے وقت ہمراہ ہوکر اس کی توقیر میں اضافہ کرے۔

ابھی یہ لوگ ملاقات کے بارے میں گفتگو کر ہی رہے تھے کہ دہلی کے گورنر (شاہ نظام الدین) کی طرف سے ایک پیامبر کی آمد سے اسے مطلع کیا گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گورنر نے اپنے خادم کو بھیج کر مہمان کی خیر و عافیت دریافت کی ہے۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی معلوم کرنے آیا ہے کہ آج یا کسی اور دن وہ گورنر سے ملاقات کرنا پسند کریں گے۔ مہمان نے سید رضی خاں سے درخواست کی کہ وہ گورنر صاحب کی خدمت میں جاکر مہمان کی طرف سے عرض کریں کہ وہ بڑے آرام سے ہیں اور آج وہ سارے دن آرام کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے دن بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہونے سے قبل وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔

سہ پہر کو خان موصوف دوبارہ مہمان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تھوڑی دیر تک اس کے ساتھ ہم جلیس رہے۔ موضوع گفتگو بادشاہ کے دربار میں حاضر تھا۔ شام کو مہمان نے اس خوبصورت باغ میں چہل قدمی کی

یکم دسمبر ۱۷۹۴ء کو صبح سویرے گھوڑے پر سوار ہوکر وہ شہر کی طرف نکلے۔ گلیوں کا نظارہ کیا جو طویل تھیں لیکن وسیع نہ تھیں۔ ان گلیوں میں اچھی خاصی تعداد میں لوگ نظر آتے تھے ۔۔ بھیڑ بھاڑ تھی لوگ ہتھیار باندھے ہوئے تھے لیکن اپنے اطوار میں وہ بہت خلیق تھے۔ اسی دن ناشتہ کر چکنے کے بعد خان موصوف مہمان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گزشتہ شام انہوں نے دربار کے متعلقہ افسران سے ملاقات کی تھی اور سفیر کے آنے کے بارے میں انھیں مطلع کیا تھا اور انھیں بتایا تھا کہ سفیر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے خواہاں ہیں انہوں نے متعلقہ عہدہ داروں سے درخواست کی کہ وہ بادشاہ کے فیصلے کی مہمان کو اسی دن

اطلاع دے دی۔ خان موصوف نے مہمان سے ایک شخص کا تعارف کرایا جس کے لیے انھوں نے ان سے پہلے درخواست کی تھی۔ وہ شخص مسلمان تھا، رنگ صاف اور سرخی مائل تھا اور بظاہر تیس برس عمر معلوم ہوتی تھی۔ اس کے اطوار، سلیقے اور انداز گفتگو سے مہمان کو مسرت حاصل ہوئی۔

دس بجے دن کو مہمان گورنر صاحب سے ملاقات کرنے کے لیے روانہ ہوئے جن کی قیام گاہ شہر کے باہر کچھ دور پر واقع تھی۔ ان کے ہمراہ ان کا منشی بھی تھا اور تھوڑے سے محافظ سپاہی بھی، جو اپنی تلواریں اور ڈھالیں باندھے ہوئے تھے لیکن توڑے دار بندوقیں بھی ساتھ لیے تھے۔ آگرہ دروازے سے دلی شہر کے باہر نکلے۔ یہ وہی دروازہ تھا جس سے وہ شہر میں داخل ہوئے تھے۔ آگرہ جانے والی سڑک کو بائیں جانب چھوڑ کر انھوں نے دائیں سمت رُخ کیا۔ یہاں زمین اونچی نیچی تھی اور تقریباً ایک میل کی دوری کا سفر مسمار اور ڈھیہی عمارتوں کے درمیان سے ہو کر طے کیا۔ کئی راہوں سے اس کا گزر ہوا۔ جہاں بہت سے محافظ دستے دکھائی دیئے۔ اس کے بعد وہ ایک بڑے وسیع اور خوبصورت سے دروازے پر پہنچا، جہاں وہ اپنے گھوڑے سے اُترا۔ اس باغ کے تقریباً وسط میں ایک بارہ دری تھی جس کے سامنے ایک مصنوعی آبشار تھا۔ یہاں سے جب وہ آگے بڑھے تو اسے گورنر صاحب نظر آئے جو بہت سے مصاحبین کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ ان کے قریب پہنچے تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور مہمان کا خیر مقدم کرنے کے لیے سیڑھیوں کے نیچے تک اتر آئے۔ رسمی تسلیمات کے بعد وہ مہمان کو بارہ دری تک ساتھ لے گئے اور اپنے بازو میں ان کو جگہ دی کچھ دیر تک انھوں نے آپس میں ہندوستانی اور فارسی زبانوں میں گفتگو کی۔ بعد میں شاہ صاحب نے ایک ایسے لہجے میں گفتگو کی جیسا لہجہ انھوں نے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔

بنگال کلکتہ اور دوسرے ان ملکوں اور شہروں کے بارے میں دریافت کیا جن میں سیر کے زمانے میں ان کا گزر ہوا تھا۔ ان تمام سوالات کے جوابات مہمان نے بڑی وضاحت سے دیئے۔ شاہ صاحب کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے بارے میں کوئی خاص علم نہ تھا۔ مہمان نے محسوس کیا کہ ان کے لیے کمپنی کی صحیح تصویر پیش کرنا مشکل ہو گا۔ کیوں کہ جماعت مالکان اور ڈائرکٹرس

وغیرہ ایسے الفاظ تھے جن تک ہندوستانیوں کی سمجھ کی رسائی ناممکن تھی کیوں کہ ہندوستانی لوگ تخت شاہی کو ہی صرف سیاسی قوت کا مرکز سمجھنے کے عادی تھے۔ شاہ صاحب نے دریافت کیا تھا کہ آیا شاہ برطانیہ شان دار جلوس کے ساتھ باہر نکلتے تھے۔ کیا ان کے جلوس میں ہزار ہا افراد کا مجمع ہوتا تھا مہمان نے اپنے بادشاہ کی شان وشوکت اور عظمت کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انھیں ایسا محسوس ہوا کہ شاہ صاحب کے خیال کے مطابق بلا ہاتھیوں کے جلوس کے شان وشوکت کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد مہمان نے شاہ صاحب سے نواب اودھ کے ہاتھیوں کی بڑی تعداد کا ذکر کیا اور شاہ صاحب کو یہ بات سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ مہمان کو نواب اودھ کے دربار میں اس درجہ رسائی حاصل تھی کہ وہ روزانہ شام نواب موصوف کی سواری ہاتھی پر سوار ہو کر سیر کے لیے باہر جایا کرتے تھے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے مہمان کو اپنے محل کے اندرونی حصے کے معائنہ کرنے کی دعوت دی۔ یہ ایک غیر معمولی عزت افزائی تھی جیسا کہ بعد میں مہمان کو اس بات کا علم ہوا۔

وہ بارہ دری کی سیڑھیوں سے نیچے اترے اور اس محل کے دیکھنے کے لیے گئے۔ ایک مستقل عمارت تھی۔ اس کی تعمیر حال ہی میں ہوئی تھی اور وہ عمارت باغ کے آخری سرے پر واقع تھی۔ شاہ صاحب مہمان کو سیڑھیوں کے ذریعے اوپر، نیچے لے گئے۔ وہ بہت تنگ تھیں اور بہت دور تک چلی گئی تھیں۔ مہمان کا گزر بہت سے کمروں میں سے ہوا، ان میں سے بعض بہت بڑے اور خوبصورت تھے۔ لیکن ان کمروں میں فرنیچر بہت کم تھا۔ مہمان کا کہنا ہے کہ انھیں اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ آیا ان کشمیری خواتین کو جو بلاشبہ اس محل کی آرائش تھیں، مہمان کے دیکھنے کا موقع ملا تھا یا نہیں کیوں کہ انھیں اس بات کی خواہش ہوگی کہ مہمان ان کے دیدار سے ضرور محروم ہو گئے۔ حالاں کہ انھوں نے حرم سرا کی طرف جانے والے بعض راستوں کی طرف بڑی تجسس بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اور انھیں دیکھنے کی کوشش کی تھی ان کمروں کے دیکھنے کے بعد مہمان واپس آئے اور شاہ صاحب دوبارہ انھیں بارہ دری میں لے گئے اور ریشمی مسند پر بٹھایا۔ اس نشست میں موضوع گفتگو روہیلکھنڈ کی جنگ تھا۔ اور مہمان نے بڑی تفصیل سے شاہ صاحب کو اس جنگ کی تفصیلات بتائیں۔ اور یہ بھی بتایا

کہ کس طرح رو برٹ سر ایبر کرومبے نے روہیلوں کو شکست دی۔ چوں کہ شاہ صاحب بذات خود ایک مشہور سپہ سالار رہ چکے ہیں اور شہرت پا چکے تھے اس لیے انھوں نے ان باتوں پر اور روہیلوں کے سپاہیانہ کردار اور ان کی سیاسی اہمیت پر گفتگو میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔

اسی اثنا میں حسب الحکم محل کے خادموں نے ایک بڑے نقرئی طشت میں پان دان، عطردان، گلاب دان اور ناشپاتی اور دوسرے پھل لاکر مہمان کے سامنے رکھ دیئے۔ چونکہ مہمان موصوف پھلوں سے بڑی رغبت رکھتے تھے۔ اس لیے انھیں رسم مہمان نوازی ناگوار نہ ہوئی۔ انہوں نے شاہ صاحب کے باغ کے ان پھلوں کو چکھا جیسے انہوں نے پہلے نہ کھائے تھے یا وہ اتنے لذیذ اور عمدہ نہ تھے۔ عطر گلاب اور دوسرے عطریات ان کی ہتھیلیوں میں ملے گئے، انھوں نے دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑ کر وہ عطر اپنے رومال اور لباس پر لگایا۔

گلاب پاش سے گلاب جل ان پر چھڑ کا گیا۔ وہ عہدہ دار جس کے سپرد یہ خدمات تھیں وہ تھوڑی دور کھڑا تھا۔ اور بڑی ہوشیاری سے گلاب جل چھڑک رہا تھا۔ اس مہمان نوازی اور عزت افزائی کے بعد مہمان موصوف تھوڑی دیر تک تشریف فرما رہے۔ اس کے بعد رخصت ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ شاہ صاحب بارہ دری کی سیڑھیوں تک انھیں رخصت کرنے کے لیے ساتھ آئے اور کچھ دور اور آگے تک گئے اور رسمی تسلیمات کے بعد مہمان کو رخصت کیا۔

جامع مسجد

واپسی پر مہمان موصوف جامع مسجد دیکھنے گئے اور بہت سی گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ وہاں پہنچے۔ اور سنگ سرخ کی بنی سیڑھیوں کے قریب وہ اپنے گھوڑے سے اترے ان سیڑھیوں کے اوپری سرے پر محراب دار ایک بڑا دروازہ تھا جس کے درمیانی حصے میں تین طاق تھے۔ اس کے بعد ٹیوننگ نے مسجد کی ساخت اور فن تعمیر کے خصائص بیان کئے ہیں۔ مسجد میں داخل ہونے سے پہلے ہی انھوں نے ہندوستانی جوتے پہن لیے تھے۔ لیکن مسجد کے خادم کے کہنے پر انھوں نے وہ جوتے اتار دیے۔ مہمان اس مسجد کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور بقول

ان کے وہ مسجد اپنی خوب صورتی اور عظمت میں بے نظیر تھی اور بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس مسجد کا بڑا احترام کرتے تھے۔ واپسی کے وقت دروازے پر انھوں نے خادم کو نذر پیش کی۔ اس خادم کے اطوار بہت شائستہ تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی قیام گاہ واپس چلے آئے۔

مہمان کی قیام گاہ پر سید رضی خاں موجود تھے جو بادشاہ کے دربار سے مہمان کے لیے پیغام لے کر آئے تھے۔ اطلاع یہ تھی کہ دربار میں مہمان کے حاضر ہونے کا وقت متعین کر دیا گیا تھا۔ اس دن سہ پہر کا سارا وقت دوسرے دربار میں حاضری کے سلسلے میں تیاری کی نذر ہو گیا سید رضی خاں نے مہمان موصوف کو دربار میں حاضری کے آداب و رسوم سے متعارف کرایا یعنی انھیں اس بات کی تعلیم دی کہ کس طرح نذر پیش کی جائے گی طرز گفتگو اور زبان اور دوسری باتیں جن کا تعلق مراسم دربار سے تھا۔ - - انھیں یہ بتایا گیا کہ بادشاہ کی خدمت میں انھیں جوتے اتار کر حاضر ہونا ہوگا اور انھیں بات میں کسی قسم کی ذلّت کا احساس نہ ہو اور انھوں نے درباری ہر رسم کی ادائیگی پر رضامندی ظاہر کی۔

۲ر دسمبر ۱۷۹۴ء کو انھیں ۱۲ر بجے دن، دربار میں حاضر ہونا تھا۔ دس بجے سید رضی خاں اپنے بہت سے خادموں کے ساتھ مہمان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خان موصوف بہت زرق برق لباس پہنے ہوئے تھے۔ مہمان کے محافظ دستوں نے بھی اپنے گرد آلو کپڑے صاف ستھرے کر لیے تھے اور بظاہر ان کا لباس اچھا معلوم ہونے لگا۔ مہمان نے سفید لباس زیب تن کیا اور نارنجی رنگ کی ایک شال کاندھے پر ڈال لی تھی۔ جوتی سلیم شاہی جس پر کامدانی کا کام تھا۔ ٹیونگ نے تفصیل سے جوتیوں کی بناوٹ سجاوٹ اور ان کی نزاکت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اتنی نازک تھیں کہ انھیں صرف قالین پر پہنا جا سکتا تھا۔

۱۱ر بجے دن کو، مہمان موصوف کے قیام گاہ میں واقع چوک دربار معلّی میں حاضری کا جلوس روانہ ہوا۔ آگرہ سے جو محافظ دستہ مہمان کے ساتھ آیا تھا اس نے پیش رو دستے کے فرائض انجام دیئے۔ دوسرے افراد دو قطاروں میں مرتب ہو گئے۔ ایک شخص دوسرے کے پیچھے ذرا فاصلے پر کھڑا ہو گیا جس کی وجہ سے قطاریں لمبی ہو گئی تھیں۔ ان دونوں قطاروں میں

مرتب ہو گئے۔ ایک شخص دوسرے کے پیچھے ذرا فاصلے پر کھڑا ہو گیا جس کی وجہ سے قطاریں لمبی ہو گئی تھیں۔ ان دونوں قطاروں کے وسط میں مہمان موصوف اپنے گھوڑے پر سوار، ان کے دائیں بازو کی سمت سید رضی خاں اپنے گھوڑے پر اور دائیں سمت منشی صاحب اپنے گھوڑے پر سوار تھے۔ ان کے عقب میں ان کی سواری کی پالکی تھی۔ گلیوں سے جب اس جلوس کا گزر ہوا تو دونوں کناروں سے تماشائیوں نے انھیں تسلیمات پیش کیں۔

لاہوری دروازے سے یہ جلوس قلعہ معلیٰ کے اندر داخل ہوا۔ جس کے سامنے چھوٹا سا ایک سطح میدان تھا، جہاں سے تھوڑے فاصلہ پر بادشاہ کے قیام گاہ کی دیوار نظر آتی تھی۔ اس وقت محل کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ آگے بعض عہدہ داران کھڑے تھے۔ وہ اس جلوس کو فیل خانہ کے بڑے چوک کے راستے سے آگے لے گئے۔ یکے بعد دیگرے چوک آئے آخر میں بعض دوسرے عہدہ دار آئے جن کے شان دار لباسوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑے غضب دار تھے۔

اب مہمان موصوف اپنی سواری سے اتر گئے۔ انھیں سید رضی خاں اور میر منشی کی رہنمائی میں دیوان عام کی طرف لے جایا گیا۔ ایک عالی شان عمارت تھی جس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے دالان تھے۔ یہ عمارت بہت عمدہ تھی۔ ان دالانوں سمیت اس عمارت کی ایک سمت ایک وسیع مربع تماشہ نشین تھی۔ اس کے نیچے خوبصورت سنگ مرمر کا ایک فرش تھا۔ یہ مقام تھا جہاں وزیر مملکت بادشاہ کی حضوری میں کھڑا ہوتا تھا۔ گزشتہ ایام میں جب کبھی اہم مواقع پر بادشاہ اس دیوان میں آتا تھا تو شہرہ آفاق تختِ طاؤس پر جلوہ افروز ہوا کرتا تھا جسے بعد میں نادر شاہ اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ یہ واقعہ محمد شاہ بادشاہ کے دور حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد سے وزیر المما لک نیچے اس سنگ مرمر کے چبوترے پر کھڑا ہونے لگا تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے

اس کے بعد ایک دوسرے بڑے ہال یعنی دیوان خاص میں مہمان موصوف کو لے جایا گیا دیوان عام کے مقابلے میں یہ عمارت کہیں زیادہ عظیم الشان اور خوب صورت تھی۔ لیکن بلاشبہ حالیہ تباہی و بربادی کے نقوش نمایاں تھے۔ یہ شاندار عمارت سنگ مرمر کی تھی اور ملحق

دالان اور بارہ دری بھی اسی خوبصورت پتھر سے بنی تھیں۔ اس عمارت کے ستون سفید سنگ مرمر کے تھے اور ان میں بیش قیمت عقیق جڑے ہوئے تھے جس سے اس کے بنانے والے کے اعلیٰ ذوق اور فن کاری کا اظہار تھا۔ اس آرائش اور فن کاری کو دیکھ کر مہمان موصوف کا ذہن تھوڑی دیر کے لیے تاج محل کی آرائش اور زیبائش، فن کاری کی طرف منتقل ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا یہ تعمیری کام انہی فن کاروں کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا جنھوں نے تاج کی تعمیر کی تھی۔ کیوں کہ اسی زمانے اور اسی بادشاہ کے دور میں دیوانِ خاص کی بھی تعمیر ہوئی تھی۔ نہایت درجہ منقش چھت، مرصّع اور خوبصورت ستونوں پر آویزاں کی گئی تھی جس پر بہت نازک فن کارانہ گل کاری تھی جن میں طلائی آرائش مخلوط تھی ایک مخملی تکیہ تخت پر رکھا تھا، ایک خوب صورت شامیانہ، جو نقرئی کھمبوں پر سدھا ہوا تھا اس کے نیچے بادشاہ کا تخت تھا جس پر سرخ مخمل پڑا ہوا تھا۔

ابھی مہمان مشرقی شان وشوکت کے خوب صورت نمونوں کو دیکھ ہی رہے تھے کہ محل کے بعض عہدہ دار زرق برق لباس میں ملبوس ان کے سامنے پہنچے اور آداب بجالائے۔ انھوں نے کہا کہ بادشاہ سلامت تسبیح خانے میں جلوہ افروز ہو چکے ہیں اور مہمان موصوف ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے سب تیاریاں مکمل کی جا چکی تھیں۔

لہٰذا وہ آگے بڑھے ان کے جلو میں چلنے والے سید رضی خاں اور میر منشی تھے۔ اور ان کے پیچھے وہ تمام لوگ تھے جو اس جلوس میں شریک ہو کر وہاں گئے تھے۔ یہاں سے آگے بڑھ کر وہ لوگ ایک بڑے اور وسیع چبوترے کے سرے پر پہنچے، جس کے دائیں سمت خوبصورت ستون دار ایک دالان تھا اور دوسری سمت ایک باغ۔ چبوترے کے وسط میں لوگوں کا ایک مجمع تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے لوگوں کی دو قطاریں نظر آئیں یہ بظاہر امیروں پر مشتمل تھیں۔ جو چبوترے پر بچھے ہوئے ایک بڑے قالین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے پاس ایک کھلی ہوئی جگہ تھی۔ وہاں سے لوگ جب ذرا اور آگے بڑھے تو انھوں نے یہ دیکھا کہ یہ کھلی ہوئی جگہ وسیع ایک گوشہ تھا جو محل سے ملحق تھا جہاں بہت سے لوگ زرق برق لباس پہنے ہوئے کھڑے تھے، ان کا رخ چبوترے اور باغ کی سمت تھا۔

چند قدم اور آگے بڑھنے کے بعد جلوس کے ساتھ چلنے والے بچھی ہوئی قالین کے سرے اور بیٹھے ہوئے لوگوں کی پہلی قطار کے قریب پہنچ گئے۔ اس مقام سے جب مہمان موصوف نے دالان میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی قطار کو دیکھا تو انھوں بادشاہ کی جھلک نظر آئی۔ کم سے کم ان کا اوپر کا دھڑ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بادشاہ سلامت کھڑے ہوئے لوگوں کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ چوں کہ وہاں انھوں نے دردیدہ نگاہی سے بادشاہ سلامت کی طرف دیکھا تھا اس لیے وہاں نہ تو بادشاہ سلامت کو کورنش ادا کیا اور نہ کوئی خاص توجہ کا مظاہرہ قالین کے کنارے پر جوتے اتار دیے۔ سید رضی خاں اور میر منشی کو اسی مقام پر پیچھے چھوڑ کر وہ آگے بڑھے اور تن تنہا بیٹھے ہوئے افراد کی قطار سے ذرا آگے تک چلے گئے اور اپنے داہیں سمت مڑے، جب وہ دونوں قطاروں کے وسط میں پہنچے تو ان دونوں قطاروں کے دوسرے سرے کے آخر میں بادشاہ سلامت جلوہ افروز نظر آئے۔ وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا رخ چبوترے کی سمت تھا۔ جس تخت پر وہ جلوہ افروز تھے۔ ان کا رخ تخت کی سمت تھا۔ وہ چھوٹا تھا، اس پر ریشمی یا سرخ مخمل پڑی ہوئی تھی اور ان کے اردگرد بہت سے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ بعض ان کے پیچھے دیوان خانہ میں تھے اور کچھ دوسرے دالان کے دونوں سمت۔

جیسی مہمان کو تربیت دی گئی تھی اس کے مطابق انھوں نے جھک کر تین مرتبہ کورنش ادا کی اور سر جھکا کر تین بار داہیں ہاتھ سے قالین کو چھوا اور اس ہاتھ کو ماتھے تک لے گئے۔ اس موقع پر دانستہ انھوں نے اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ انھوں نے دیکھا کہ نہ صرف یہ کہ وہ خود متجسس تھے بلکہ موجود لوگوں کی نظریں ان پر مرکوز تھیں۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے نزدیک کی قطاروں کے سروں پر جو لوگ تھے وہ نوجوان تھے۔

جیسے جیسے وہ قطار دوسرے سرے پر تخت کے قریب تک پہنچتی تھی ویسے ویسے اس میں زیادہ تر معمر لوگ نظر آتے تھے۔ وہ سب کے سب شہزادے تھے جو شاہ وقت (شاہ عالم) کے بیٹے اور پوتے تھے۔ مہمان موصوف کے خیال کے مطابق ان کی تعداد چالیس افراد سے زاید پر مشتمل تھی۔ ان قطاروں کے درمیان سے وہ پانچ چھ قدم

دھیرے دھیرے اور آگے بڑھے۔ اور پھر رک گئے۔ اور جھک کر تین مرتبہ پھر کورنش ادا کی۔ اس کے بعد وہ پیچھے اسی مقام پر لوٹ آئے، جہاں وہ پہلے کھڑے تھے۔ اس مقام پر کھڑے ہو کر انھوں نے پہلے کی طرح پھر کورنش ادا کی۔ اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھے ان کے جلوس میں سید رضی خاں اور میر منشی بھی تھے۔ یہاں تک کہ وہ معمر بادشاہ کے قریب تک پہنچ گئے جو مشرقی انداز میں سیدھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں سمت اور عقب میں ریشمی گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ان کا سہارا نہیں لے رہے تھے۔

حالانکہ کہ بادشاہ سلامت کی عمر اکہتر سال کی تھی۔ لیکن حاضرین میں بظاہر وہ سب سے زیادہ قد آور اور قوی معلوم ہو رہے تھے۔ اس بات پر مہمان موصوف نے اظہار افسوس کیا ہے کہ ان کے مقسوم میں انھیں نابینا دیکھنا تھا جو ایک دردناک حقیقت تھی۔ وہ اس وقت نابینا تھے لیکن پھر بھی ایسی حالت میں تخت پر جلوہ افروز بادشاہ کی حالت غیر معمولی اور بہت الم انگیز تھی .... اُن کی بینائی کسی حادثہ یا قدرتی طور پر ضائع نہیں ہوتی تھی بلکہ انھیں کے ایک نمک خوار نے بڑی درندگی کے ساتھ انھیں بینائی سے محروم کر دیا تھا۔ بہر حال بادشاہ کو دیکھنے میں بظاہر کسی کراہیت کا جذبہ نہیں ابھرتا تھا۔ کیوں کہ ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی۔ صرف ان کے پپوٹے دھنسے ہوئے تھے جو ولی عہد بھی تھے اور دوسرے شہزادے اپنی عمر کی مناسبت سے سامنے دو صفوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تخت کے چاروں طرف کھڑے عہدہ داروں میں مہمان موصوف کو دلی کے ناظم شاہ صاحب بھی نظر آئے جن سے وہ متعارف تھے۔

مہمان موصوف کے میر منشی نے انھیں ململ کا ایک رومال دیا جو پانچ چھ مربع انچوں میں تہ کیا ہوا تھا۔ اس کپڑے کو مہمان کے دائیں ہاتھ پر رکھ کر اس پر پانچ مہریں رکھ دی گئیں۔ مہمان موصوف نے اپنا ہاتھ بادشاہ کی خدمت میں بڑھایا۔ بادشاہ کو مہمان موصوف کے اس فعل سے مطلع کیا گیا اور انھوں نے اس نذر پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے بعد محل کا خزانچی آگے آیا جو تخت کے قریب ایستادہ عہدہ داروں کی صف

ہیں کھڑا تھا اور اس نے کپڑے سے وہ مہریں اٹھالیں۔ میر منشی نے، جو مہمان موصوف کے خزانچی کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا، اس نے رومال پر تین مہریں پھر رکھ دیں وہ نذر مہمان موصوف نے شہزادہ مرزا اکبر کی خدمت میں پیش کی، جس نے خود وہ مہریں اپنے ہاتھ سے اٹھالیں۔ اس کے بعد اپنے وسائل کے مطابق مہمان موصوف نے دوسرے شہزادوں کو نذریں پیش کیں۔ کیوں کہ اگر وہ تمام شہزادوں کو نذریں دیتے تو ان کا پورا اثاثہ صرف ہو جاتا۔

قدیم سے چلی آئی اس رسم کی تکمیل کے بعد بادشاہ سلامت نے ان سے بزبان فارسی گفتگو کی اور مہمان موصوف کی خیریت دریافت کی اور اس بات پر تشکرانہ انداز میں اظہار خوشی کیا کہ اتنے طویل سفر کے بعد وہ بخیر و عافیت دہلی تک پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد مہمان موصوف نے خاندان مغلیہ کی عظمت اور شاہ وقت کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی کی۔ اور اس کے بعد وہ خط بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا جو وہ اپنے ہمراہ لائے تھے۔ بادشاہ سلامت نے وہ خط میر غالب جنگ کے حوالے کر دیا وہ منشی اعلیٰ تھے۔ وہ خط ایک سنہرے کاغذ پر فارسی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ اس خط میں بادشاہ کو اس بات پر مبارکباد دی گئی تھی کہ غلام محمد کی شکست ہوئی۔ جس نے روہیلکھنڈ پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا۔ اور اس کے مستقر رام پور پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ بادشاہ نے مہمان موصوف سے کہا کہ وہ ان کی طرف سے جنرل کا شکریہ ادا کر دیں کہ انھوں نے ان واقعات سے بادشاہ سلامت کو مطلع کیا۔

اس کے بعد بادشاہ نے اپنے عہدہ داروں کو حکم دیا کہ سفیر موصوف کو خلعت عطا کیا جائے۔ اس بات کو سن کر مہمان نے ان کا شکریہ ادا کیا اور دونوں صفوں کے درمیان سے پیچھے لوٹ آئے اور آخری سرے پر پہنچ کر تین مرتبہ کورنش ادا کی اور وہاں سے وہ اسی مقام پر چلے گئے جہاں انھوں نے اپنے جوتے اتارے تھے۔ انھوں نے جوتے پہن لیے، اس کے بعد انھیں چبوترے کے کنارے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ .. اس سرے پر تھا جہاں سے وہ دربار میں داخل ہوئے تھے۔

وہاں انہیں شاندار، سنہری جڑاؤ ململ کی ایک خلعت پہنائی گئی وہ اتنی لمبی تھی کہ مہمان موصوف کا سارا قد اس سے ڈھک گیا اور لمبائی اتنی تھی کہ ٹخنوں تک لٹکی ہوئی تھی۔ ململ کی کئی گز لمبی ایک پگڑی ان کے سر پر باندھ دی گئی جس پر سنہری کام تھا۔ اور سرے مطلا تھے۔ ململ کی سفید ایک رومال ان کے کاندھوں پر ڈال دی گئی جو زمین تک لمبی تھی۔ سنہری کام کا ململ کا ایک دوسرا کپڑا ان کے کمر سے باندھ دیا گیا۔ ان کے منشی کو بھی ہرے رنگ کی ایک شال عطا کی گئی اس بات سے ان دونوں کو بہت اطمینان حاصل ہوا۔

خلعت پہنانے کے بعد مہمان موصوف کو دوبارہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا جہاں وہی ترتیب اب تک برقرار تھی جیساکہ وہ پہلے چھوڑ گئے تھے۔

شہنشاہ شہزادوں اور امیروں کے درمیان جلوہ افروز تھے۔ مہمان موصوف نے اپنے جوتے قالین کے کنارے پر اتارے۔ جھک کر تین مرتبہ کورنش ادا کی اور شہزادوں کی صف کے درمیان سے ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ شاہی تخت کے سامنے تک جا پہنچے ان کے وہاں تک پہنچ جانے پر جب بادشاہ کو اس بات سے مطلع کیا تو انہوں نے مہمان موصوف کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا۔

آپ کی آمد سے مجھے قلبی سکون حاصل ہوا۔ اس خبر کو سن کر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ جنرل نے ایک جنگ میں فتح یابی حاصل کی۔ کچھ دنوں آپ اس شہر میں قیام کریں جتنے دنوں آپ چاہیں یا زیادہ دنوں۔

"آپ کو رقص وسرود سے محظوظ کیا جائے گا جس کی مجلس شاہ صاحب کے محل اور باغ میں منعقد ہوگی۔ اب آپ قلعۂ معلّٰی کا معائنہ اور سیر کریں آپ کے لیے کھانا اور تفریحی سامان دربار کی طرف سے مہیا کیا جائے گا۔"

مندرجہ بالا کلمات کو سن کر مہمان موصوف نے بادشاہ کے لیے درازیٔ عمر صحت مندی اور فلاح و بہبود کی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور ان صفوں کے درمیان آہستہ آہستہ پیچھے لوٹ آئے۔

اس کے بعد انھیں قلعہ معلیٰ کے مختلف حصّوں میں لے جاکر وہاں عمارتیں دکھائی گئیں۔

انہوں نے موتی مسجد دیکھی جو دیوانِ خاص کے سامنے تھی یہ سنگ مرمر کی تھی اور بہت خوب صورت تھی اس کے بعد انہوں نے شاہ جہاں کے زمانے میں تعمیر کردہ مرمری حمام دیکھے بعدازیں باغ حیات بخش گئے جس میں شہزادے سیر و تفریح کیا کرتے تھے۔ یہ باغ بہت وسیع تھا۔ درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے باغ کے مقابلے میں شاہ نظام الدین کا باغ کہیں زیادہ بہتر تھا۔ پھر انھوں نے شاہ باغ دیکھا۔ ایک بڑی عمارت دیکھی جس کے کنارے قدرے بلند مینار تھے اس کے شمال میں ایک ہشت پہلو عمارت تھی جس سے دریا کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ یہ عمارت شاہ برج تھی اسی شاہ برج کی ایک کھڑکی سے مرزا جواں بخت نکل کر فرار ہوئے تھے اور ندی پار اتر کر روہیلکھنڈ کے علاقے میں چلے گئے۔

اس کے بعد ٹیوننگ نے قلعہ پر غلام قادر کے حملے شاہ عالم اور شاہی افراد پر اس کے مظالم بے دردی سے بادشاہ کی بینائی ضائع کرنے اور بالآخر سندھیا کی طرف سے اس کا قلع قمع کیے جانے کے واقعات کا مملاً ذکر کیا ہے۔ مابعد انھیں شاہی اسلحہ خانے میں لے جایا گیا جو بالکل برباد ہو چکا تھا۔ کیوں کہ غلام قادر نے انھیں نیست و نابود کر دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے بعض چیزیں اور عمارتیں۔ لیکن بادشاہ سے ملاقات کے بعد اب انھیں ان چیزوں کے دیکھنے سے کوئی زیادہ دلچسپی نہ رہی تھی اس لیے وہ قلعہ سے رخصت ہوئے اور دلی دروازے تک پہلے کی طرح سے جلوس انھیں چھوڑنے آیا وہاں شاہی عہدہ داروں نے انھیں رخصت کر دیا۔

شام کو ابو محمد، داروغہ شاہی مطبخ ان کے محل میں الوش خاص لے کر پہنچا۔ اس ضیافتی کھانے کو تقریباً بیس آدمی لے کر گئے تھے ان میں سے بیشتر اپنے ہمراہ دو طشت لائے تھے۔ ان طشتوں کو بہنگیوں پر لٹکا کر کندھوں پر رکھ کر لایا گیا تھا۔ غالباً بڑی بڑی دیگیں تھیں مہمان موصوف کے بڑے کمرے میں جو قالین بچھی ہوئی تھی اس پر انھوں نے کھانے چن دیئے۔ چوں کہ ان کی سفری میز اتنی بڑی نہ تھی جس پر یہ تمام کھانے لگائے جا سکتے اس لیے وہ فرش

پر ہی بیٹھ گئے۔ داروغہ ان کے قریب کھڑے ہو کر انھیں کھانوں کے اقسام کے بارے میں بتا رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ فلاں کھانا زیادہ لذیذ اور عمدہ ہوتا ہے۔ مہمان موصوف نے کھانا لانے والوں کو اندر بلا لیا۔ وہ لوگ ان کے پیچھے بیٹھ گئے۔ انھیں اندر بلانے میں یہ جذبہ کارفرما تھا تاکہ ان کے ملازمین بھی اس منظر کو دیکھ کر محظوظ ہوں۔ لیکن اس سے دلچسپ کی بات یہ ہوئی کہ داروغۂ مطبخ کے ہمراہ رقاصائیں اور سازندے بھی آئے تھے۔

وہ رقاصائیں زرق برق لباسوں میں ملبوس، اور زیوروں سے آراستہ پیراستہ تھیں۔ انھوں نے قطاریں باندھ کر ان کے روبرو رقص کرنا شروع کیا۔ رقص کے وقت ایسا ہوتا تھا کہ ان میں سے ایک یا دو رقاصائیں صف سے باہر نکل آتیں، اور ناز و انداز دکھا کر واپس جا کر پھر صف میں شامل ہو جاتیں تھیں۔ سازوں کی گت کی مطابقت سے وہ رقص کرتیں اور ٹھمکے لگاتیں۔ اور اسی تال سر کے ساتھ ان کے گھنگروکی جھنکار ہوتی تھی تقریباً دو گھنٹے تک رقص کی محفل منعقد رہی۔ اس کے بعد مہمان موصوف نے اس خیال سے کہ وہ تھک گئی ہوں گی رقص بند کرنے کی اجازت دے دی۔ آخر میں انھوں نے کھانا لانے والوں اور دوسرے ان افراد کو جنھوں نے ان کی تفریح کا سامان مہیا کیا تھا، انعام واکرام دے کر رخصت کر دیا۔ ۳؍دسمبر کو ناشتہ کے بعد وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اور منشی کو ساتھ لے کر قدسیہ باغ دیکھنے گئے جو کسی زمانے میں اپنی خوب صورتی کے لیے مشہور تھا۔ لیکن اب بہت خستہ حالت میں تھا۔ اس کے بعد وہ قطب مینار دیکھنے گئے۔ اب وہ اپنی اصلی حالت میں نہ تھا۔ اس کے اوپر کی دو ایک منزلیں گر چکی تھیں اور وہیں پڑی ہوئی تھیں۔

واپس شہر آکر انھوں نے برہان الملک اور مجدد الدولہ عبدالاحد خاں کے محلات دیکھے اور ان کے باغوں کی سیر کی، امام بخش نے جو مجدد الدولہ کا خادم تھا اور اثاثاً ان کی املاک پائی تھی، اس لیے انھوں نے کافی روپیہ صرف کر کے محل اور باغ کی مرمّت کرائی تھی اور آراستہ کیا تھا۔ اس کے بعد وہ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان گلیوں میں جو بڑی قابل توجہ نظر آئی۔ وہ چوڑی تھی، پہلے اس میں نہر تھی۔ وہ نہر سنگ سرخ کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں جمنا سے پانی آتا تھا جس کا منبع دہلی سے کئی کوس دور واقع تھا۔ اور وہ نہر

قلعۂ معلّیٰ تک جاتی تھی۔ اب وہ نہر خشک تھی۔ اس کے دونوں کناروں پر چھوٹے چھوٹے مکانات تعمیر کر لیے گئے تھے جس کی وجہ سے نہ تو سڑک کی اصلی وسعت برقرار رہی تھی اور نہ وہ خوب صورتی۔ اسی طرح انھوں نے دوسری ایک اور گلی دیکھی جس میں اس نہر کی ایک شاخ گئی تھی۔ اس کے بعد ان کا گزر ایک بازار سے ہوا جس ہیں بہت سے لوگ تھے ان میں سے بیشتر سفید لباس پہنے ہوئے تھے جن کی لمبائی ٹخنوں تک تھی۔ اس پر پٹکا باندھے ہوتے تھے۔ یہ سردی کا لباس تھا کیوں کہ اب سردی بڑھ رہی تھی۔ حالانکہ لبادوں اور پگڑیوں کا مروجہ رنگ سفید تھا، لیکن بعض لوگ چھینٹ کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے کپڑوں کے رنگ مختلف تھے، بہت سر برآوردہ لوگ، یہاں تک کہ بہت سے ساہوکار، مہاجن، صرّاف، دکان دار، رنگین اور مختلف النوع شالیں اوڑھے ہوئے تھے، وہ شالیں زیادہ تر لمبی تھیں۔ کندھے یا سر سے کمر تک لپٹی ہوئی تھیں۔ یہی وہ طرز تھی جس انداز سے مہمان موصوف اپنی شال اوڑھا کرتے تھے۔

بیشتر لوگ ایسے نظر آئے جو ہتھیار باندھے ہوئے تھے، تلوار، کٹار یا بعض لوگ اپنے ساتھ خنجر رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ ڈھال بھی ہوتی تھی۔ ایک دوکان پر انھیں حقّے کے آلات نظر آئے۔ چوں کہ دہلی حقہ سازی کے لیے مشہور تھا اس لیے انھوں نے اس دکان پر جا کر حقّے دیکھے اور دوکان دار سے کہا کہ وہ ان خوب صورت آلات کو لے کر ان کے محل میں آئیں، وہاں وہ انتخاب کریں گے۔ اس بازار میں جتنے بھی لوگ انھیں نظر آئے وہ بہت مہذب اور شائستہ تھے اور جن لوگوں کے سامنے سے ان کا گزر ہوتا وہ انھیں حیرت سے ضرور دیکھتے، لیکن وہ سب لوگ انھیں سلام کرتے تھے

سہ پہر وہ دوپہر گھوڑے پر سوار ہوئے۔ اپنے منشی کو ہمراہ لیا اور قدیم دہلی کے کھنڈرات دیکھنے گئے جو آگرہ سڑک کے شمال مغرب میں واقع تھے۔ یہاں کھنڈرات کے علاوہ کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ انھوں نے وہ مقام دیکھا جہاں عالم گیر ثانی

کو شہید کیا گیا تھا (عالم گیر ثانی کو عماد الملک غازی الدین نے قتل کروایا تھا) وہ شاہ وقت کے والد تھے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک مقبرہ دیکھا جو بظاہر کسی بادشاہ کا تھا، لیکن کوئی ایسا کتبہ باقی نہ رہ گیا تھا جس سے پتہ چلتا کہ وہ مقبرہ کس کا تھا۔ مہمان موصوف نے یہاں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے کہ مملکت کا زوال بادشاہوں کے مقبروں اور شاہی محلوں دونوں سے آشکارا ہو رہا تھا۔ دوسرے مقبرے جہاں کھنڈرات میں کھڑے تھے وہ تباہی کی مختلف منازل پر تھے۔ بعض میں تھوڑے بہت نقوش باقی تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کن حضرات کے مقبرے تھے ورنہ بیشتر ایسے تھے کہ اب یہ پتہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس نے تعمیر کروائے تھے۔ آخر میں انھوں نے مرزا سکندر بخت کا مقبرہ دیکھا۔ چوں کہ اب اندھیرا ہو چکا تھا اس لیے وہ پاس کے ایک گاؤں میں چلے گئے اور گھوسی صاحب کے ہاں قیام کیا جنھوں نے مہمان کی بڑی مہمان نوازی کی اور رات اپنے ہاں بڑے آرام سے ٹھہرایا۔ مہمان موصوف نے وہاں کے طعام اور قیام کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھی تو چلمچی لاکر ان کے ہاتھ دھلوائے گئے۔ ایک شخص چلمچی ان کے سامنے پکڑے کھڑا تھا اور دوسرا پانی ڈال رہا تھا۔ انھوں نے اپنے ہاتھ، گلا اور منھ دھویا۔ میزبان نے مہمان کے سامنے کافی مقدار میں سالن، چاول اور پھل رکھوا دیے۔ انھوں نے وہاں بڑے آرام سے رات بسر کی۔ میزبان نے انھیں بتایا کہ کھنڈرات میں بڑی ہوشیاری سے جایا کریں۔ انھوں نے بتایا کہ مہمان موصوف کے ہتھیار بے سود ثابت ہوں گے کیوں کہ ڈکیت قدیم محلوں کے پیچھے چھپے رہتے تھے اور وہاں سے مسافروں پر فائر کرتے تھے اور اس وقت تک باہر نہ نکلتے تھے جب تک انھیں اس بات کا یقین نہ ہو جاتا کہ وہ لوگ یا تو مر گئے جن پر انھوں نے وار کیے تھے یا سخت زخمی ہو گئے۔ جس کمرے میں مہمان موصوف نے کھانا کھایا تھا اسی کمرے کے قریب ایک دوسرے کمرے میں ایک ہندوستانی چارپائی ڈال دی گئی۔ اس پر ریشمی قالین بچھا دی گئی۔ ایک تکیہ اور گاؤ تکیہ رکھ دیا گیا اور ایک جوڑا پاجامے ان کے پلنگ کے قریب رکھ دیے گئے یہ بستر اتنا ہلکا پھلکا تھا کہ ایک آدمی بڑی آسانی

سے اسے اٹھا کر لے جا سکتا تھا۔

صبح سویرے چلمچی اور لوٹے میں پانی لایا گیا اور ان کے پیر دھوئے گئے۔

دوسرے دن صبح رسمی تسلیمات اور گھوسی صاحب (کذا) کے نوکروں کو انعامات دے کر مہمان موصوف وہاں سے روانہ ہوئے۔ انھوں نے راستے میں حضرت امیر خسرو کا مزار دیکھا جو سنگ مرمر کا تھا، اگرچہ خراب ہو گیا تھا لیکن اب بھی خوب صورت تھا۔ اس کے بعد شیخ نظام الدین اولیا اور محمد شاہ بادشاہ کے مقبرے دیکھے۔ اس کے تھوڑی دور پر انھوں نے جہاں آرا کا مزار دیکھا۔ پھر نواب نجف خاں ذوالفقار الدولہ اور افراسیاب خاں کے مقبرے دیکھے، وہاں دوسرے امیروں کے بھی مقبرے تھے نواب ذوالفقار جنگ اور ان کے بیٹے سیف الدولہ بہلول محمد خاں، موسیٰ خاں جن کا انتقال ۱۱۸۲ھ میں ہوا تھا، قاسم علی خاں، سابق والی بنگال، مقبرہ مہر النسار بیگم زوجہ شاہ عالم بادشاہ، جو ہنوز حیات تھیں، یہ مقبرہ (کذا) بیگم کے قریب تھا۔ جو شاہ وقت شاہ عالم کی ایک بیٹی تھیں۔ آخر میں انھوں نے شاہ دان کا مزار دیکھا۔ اس کے بعد صفدر جنگ کا مقبرہ دیکھنے گئے۔ اس کے مقبرہ کے قریب لطف علی خاں کا بھی مقبرہ تھا۔ ان مقبروں کے خادموں نے ان کی خدمت میں وہاں کے باغوں کے پھل پیش کیے اور بڑی خاطر مدارات کی۔

شہر آ کر مہمان موصوف نے مسجد روشن الدولہ دیکھی جس پر بیٹھ کر نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دیا تھا۔ چبوترہ کوتوالی دیکھا جو چاندنی چوک کے پہلے سرے پر تھا۔ وہ بازار تھا جہاں ہمہ وقت بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ اس قتل عام میں تقریباً ایک لاکھ افراد مارے گئے تھے۔

۵ر دسمبر کو وہ پھر شہر میں گئے۔ ہر جگہ لوگوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اگر وہ کسی باغ کو دیکھنے جاتے تو وہاں انھیں پھل اور پھول پیش کیے جاتے۔ اور جس بات کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تو بڑی انکساری سے انھیں بتاتے تھے۔ مکان پتھر کے اور قطار میں بنے ہوئے تھے۔ یہ مکان ایک دوسرے کے بہت قریب تھے تاکہ

سایہ حاصل ہو سکے۔ شاہجہاں آباد کی گلیاں تنگ تھیں اور خوب صورتی کا نام تک ان میں نہ تھا اور یہی حالت خاص بازار میں پائی جاتی تھی۔ ان بازاروں میں گھما گھمی نہ تھی۔ مملکت کے زوال کے اثرات اس کے دارالخلافہ اور شہر پناہ کی دیواروں پر نمایاں تھے۔ قدیم شہر کے چاروں طرف ایک فصیل سنگ خانہ کی بنی ہوئی تھی۔ یہ دیوار اونچی تھی، اس میں سات دروازے تھے — دہلی۔ لاہور۔ اجمیر۔ کابل۔ موری اور کشمیر (آگرہ دروازے کا ذکر آ چکا ہے) اس دیوار کا گھیرا تقریباً چھ میلوں پر مشتمل ہے۔

اسی دن وہ تیس ہزاری باغ دیکھنے گئے جس کا شمار دارالخلافہ کے خوب صورت باغوں میں ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت اس لائق نہ رہ گیا تھا کہ اب اسے دیکھا جائے انھوں نے فرخ سیر بادشاہ کی بیٹی ملکہ زمانی کا مقبرہ دیکھا جو بعد میں محمد شاہ بادشاہ کی زوجیت میں آ گئی تھیں۔ یہ مقبرہ بہت خوب صورت اور عالی شان تھا۔ زیب النساء بیگم کا مقبرہ دیکھنے کے بعد وہ شہزادہ داراشکوہ کا محل دیکھنے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے MUFCY KROON پھر پائیں باغ دیکھنے گئے وہاں ان کی خدمت میں پھل پیش کیے گئے۔ اس کے بعد جنتر منتر دیکھا۔ جو راجہ جے سنگھ کا قائم کردہ تھا۔ چوں کہ اب وہ قابل دید تمام چیزیں دیکھ چکے تھے اس لیے واپس اپنی قیام گاہ میں چلے آئے اور وہاں انھوں نے بعض نوادر خریدے جو دوکان دار لے کر آئے تھے۔ ۶ دسمبر کو وہ شاہ نظام الدین سے رخصت ہونے گئے۔ واپسی میں انھوں نے اعتمادالدولہ قمرالدین خاں کا محل دیکھا۔ جو محمد بادشاہ کے وزیر تھے۔ اس کے بعد مسجد زینت المساجد دیکھی جو شاہجہاں کی ایک بیٹی نے بنوائی تھی۔ اکبر آبادی مسجد اور نواب جاوید خاں بہادر کی تعمیر کردہ مسجد دیکھی جو قلعہ معلیٰ کے متصل واقع تھی۔ گلیوں سے ہوتے ہوئے اپنی قیام گاہ واپس آ گئے۔

۷ دسمبر کو انھوں نے بعض چیزیں خریدیں جن کے لیے دہلی مشہور تھا۔ انھوں نے ایک کابلی دنبہ خریدا۔ جو اپنے قد کے اعتبار سے غیر معمولی تھا۔ اس کا پیکر بہت خوب صورت تھا۔ بالخصوص اس کی دم بہت لمبی تھی۔ اس کے جسم پر اس قدر چربی تھی جو گول ایک گاؤ تکیہ کی طرح لٹکی ہوئی تھی اور تقریباً اس کے سارے جسم پر پھیلی ہوئی تھی اور تقریباً زمین

تک آرہی تھی۔ یہ زائد شحمی مادہ بظاہر لاحاصل تھا لیکن انہیں بتایا گیا کہ بلا کھائے کے دنبہ بہت دنوں تک زندہ رہ سکتا تھا اور اس کی زندگی کا انحصار اس زائد پر تھا جو اس کی دم کی طرف لٹکی ہوئی تھی۔ بہرحال یہ ایک عمدہ جانور تھا، حالاں کہ وہ اس لائق تو نہ تھا کہ سفر کر سکے۔ لیکن مہمان موصوف کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اسے بنگال ساتھ لے جائیں اور وہاں سے اسے انگلستان یا تو بادشاہ کو بطور ہدیہ یا اپنے والد کو بھیجیں جو اسے اپنے آئی زل ورتھ کے میدانوں میں چھوڑ دیں۔ انھوں نے ایک انوکھا جنگی ہتھیار خریدا۔ کلہاڑی نما یہ ایک ہتھیار تھا جس کے لوہے کے دستے پر بندوق جڑی ہوئی تھی اور دودھاری ایک خنجر لگا ہوا تھا جس پر کسی ہندو دیوتا کی تصویر کندہ تھی۔ یہ ہتھیار کمر سے آویزاں کیا جاتا تھا اور بہت خطرناک اسلحہ تھا، ایک انوکھا جنگی دستہ اسی طرز سے بنایا گیا تھا کہ اس شخص کے ہاتھ سے اس اسلحہ کا چھیننا غالباً ناممکن تھا جو اس کا استعمال کر رہا ہو۔ انھوں نے ایک زرہ بکتر بھی خریدا جو لوہے کے دوہرے چھلوں سے بہت گھنا بنا ہوا تھا۔ اس کے بنانے میں بڑی دیدہ ریزی کرنی پڑی ہوگی و جزئیات کی تکمیل میں کسی قسم کا دریغ نہ کیا گیا تھا اس لیے وہ خوبصورت اور گراں تھا۔ اس زرہ بکتر کے بارے میں بڑی بڑی لمبی داستانیں بیان کی گئیں۔ کہ اس کا استعمال شاہی جنگوں میں کیا گیا تھا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ کسی شہزادے یا امیر نے ضرور اسے زیب تن کیا ہوگا۔ اس کی ساخت ایسی تھی کہ اس پر گولے یا سیف کا اثر نہیں ہو سکتا تھا۔

الغرض موصوف نے دلی کا ایک نقشہ بھی خریدا جسے ایک عمدہ کاغذ پر لال اور کالی سطروں سے بڑی خوب صورتی کے ساتھ کھینچا گیا تھا انھوں نے بھینس کے سینگوں سے بنے ہوئے تیر بھی خریدے جن پر سرخ رنگ کیا گیا تھا۔ اس نے چند ترکش اور کمان خریدے۔ اول الذکر پر سرخ کپڑا منڈھا ہوا تھا اور آخر الذکر مضبوط سرکنڈوں کے بنے ہوئے تھے۔ اور بڑے خوب صورت طرز کی ان پر سرخ آرائش تھی۔ ایک قرآن شریف بھی ہدیہ کیا۔ بہت صاف ستھرا لکھا ہوا تھا۔ بہت منقش اور مطلا تھا۔ لپٹے ہوئے تین انچ چوڑے لمبے

ایک عمدہ کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔

۸ر دسمبر ۱۷۸۴ء کو ٹیوننگ نے دہلی کو خیر باد کہا اور بنگال کے لیے روانہ ہوگیا۔ لیکن اپنے بیان کے ختم کرنے سے پہلے اس نے بعض شاہی افراد اور امرا پر تبصرہ کیا ہے۔ یعنی عالی گہر، مرزا جواں بخت، اور بیگم سمرو کے مجملاً حالات لکھے ہیں۔ ان کے سلسلے میں بعض سیاسی باتیں تو اس نے سنی تھیں اور بعض خود کی چشم دید تھیں۔ اس لیے یہاں اس نے سیاسی واقعات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جن کا وہ شاہد نہ تھا کیوں کہ ہم عصر تاریخوں میں ان واقعات کی تفصیل با آسانی مل جاتی ہے۔

شاہ وقت شاہ عالم کا خاندانی یا ذاتی نام جوانی میں عالی گہر تھا۔ ان کی ولادت ۱۷۲۳ء میں ہوئی تھی۔ ان کی ابتدائی زندگی سیاسی دشواریوں اور گھریلو تکالیف کا شکار رہی۔ بکسر کی جنگ میں شکست کے بعد ان کی حیثیت ایک پنشن خوار بادشاہ کی ہوگئی تھی۔ کیوں کہ انھوں نے تینوں مشرقی صوبے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیئے تھے اور اس کے عوض ان کی ۲۶ لاکھ روپے سالانہ پنشن مقرر کر دی گئی تھی۔ انھوں نے الہ آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ لیکن جب شاہ عالم، مرہٹوں کے ورغلانے پر انگریزوں کی خواہش کے خلاف دہلی چلے آئے تو یہ پنشن بند کر دی گئی تھی۔ کیوں کہ کمپنی انھیں اپنا وثیقہ خوار اور قیدی سمجھتی تھی۔ اس زمانے میں بادشاہ صرف رسمی لقب کا استعمال کرتا ہے۔ اس کے نام کے سکّے چلتے ہیں اور خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ کمپنی کی نظر میں اس سے زیادہ ان کی کوئی اوقات باقی نہ رہی تھی۔

ٹیوننگ کی رائے میں اگر عام حالات میں شاہ عالم تخت نشین ہوئے ہوتے یا اس کے دشمن دوسری طاقتیں ہوتیں جن کا انھیں مقابلہ کرنا پڑتا یا ایسے مصاحب ہوتے جن پر وہ اعتماد کر سکتا تو اپنی ہمت صلاحیتوں اور اوصافِ حمیدہ کے اعتبار سے اپنے خاندان کے ممتاز ترین حکمرانوں کی صف میں انھیں جگہ ملنی چاہیئے تھی۔

مرزا جواں بخت:- اس بات کا پہلے ذکر آچکا ہے کہ ٹیوننگ جب دربار میں حاضر ہوا

تھا۔ تو اس نے نابینا بادشاہ کے ایک ولی عہد مرزا اکبر کو بیٹھے دیکھا تھا۔ لیکن اکبر سے زیادہ عمر والا ایک دوسرا بیٹا تھا جس کا نام شہزادہ جواں بخت تھا۔ وہ شہزادہ اپنے باپ کی تکالیف کا منظر دیکھ کر اس درجہ کبیدہ خاطر ہوا تھا کہ اس نے انھیں ان تکالیف سے نجات دلانے کی دلیرانہ کوشش کی تھی۔ ایک رات ۱۷۸۴ء میں جب محل کے تمام افراد استراحت کرنے چلے گئے تو وہ شاہ برج کے ہشت پہلو کمرے میں پہنچا اور کھڑکی سے رسّی کے ذریعہ نیچے اتر کر اس نے گنگا، جمنا ندیوں کو پار کیا اور بھاگ کر روہیلکھنڈ کے دارالخلافہ میں پہنچ گیا۔

فیض اللہ خاں نے جو ایک عمدہ حکمراں تھا شہزادے کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور یہ جان کر کہ شہزادہ لکھنؤ جانے کا ارادہ رکھتا تھا اُس کے لیے ایک محافظ دستہ تعینات کر دیا اور ضروری مدد بہم پہنچائی۔ لکھنؤ میں بھی نواب آصف الدولہ اور جناب لارڈ ہیسٹنگز نے ان کا استقبال کیا جو کلکتہ سے اس زمانے میں نواب سے ملاقات کرنے وہاں آئے ہوئے تھے حالاں کہ ہیسٹنگز نے کمپنی کی طرف سے دہلی کے سیاسی حالات میں مداخلت کرنے سے انکار کر دیا لیکن اس نے مفرور شہزادے کے ساتھ اس قدر لطف و کرم کا مظاہرہ کیا کہ شہزادہ ان کے ہمراہ بنارس چلا گیا۔ جب ہسٹینگز کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے تو شہزادہ واپس لکھنؤ چلا آیا۔ اس مرتبہ نواب نے اس کا بڑی سرد مہری سے استقبال کیا جس سے یہ قیاس کیا جا سکتا کہ پہلی مرتبہ جس گرمجوشی کا انھوں نے مظاہرہ کیا تھا غالباً اس کی وجہ ہیسٹنگز کی موجودگی تھی اس لیے شہزادہ دوبارہ بنارس چلا گیا۔ وہاں انھوں نے لارڈ کارنوالس کی خدمت میں اپنے والد کے حالات پیش کیے اور استمداد کی خواہش ظاہر کی۔ اس میں شک نہیں کہ شہزادہ کی باتوں کو سُن کر وہ رحم دل شخص بہت متاثر ہوا لیکن انھوں نے شہزادے سے فوجی مدد کے لیے معذرت چاہی۔ بہر حال انھوں نے شہزادہ اور ان کے خاندان کے قیام کے لیے بنارس میں ایک محفوظ قیام گاہ مقرر کر دی۔ کچھ دنوں بعد شہزادہ پھر لکھنؤ آیا۔ اس مرتبہ کارنوالس کے ذاتی اثرات کی بنا پر نواب اور شہزادے کے درمیان ایک عارضی مصالحت ہو گئی۔

چوں کہ شہزادہ نے اس بات کو محسوس کیا کہ نوّاب آصف الدولہ اسے اپنے والد کو تکالیف سے نجات دلانے کے سلسلے میں کوئی عملی مدد دیں گے اس لیے اُس نے اپنے ذاتی وسائل کا استعمال کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لال قلعہ پر حملہ ہو چکا تھا۔ یہ سن کر مرزا جواں بخت نے ایک چھوٹی فوج تیار کی، اور دہلی کے لیے برق رفتاری سے کوچ کر دیا اور غیر معمولی بہادری، جرأت اور دانش مندی سے اس نے اپنے والد کو آزاد کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ شہزادہ اکبر بھی اس کا شریک کار ہو گیا اور اسی کے ہمراہ شہر میں داخل ہوا۔ جب جواں بخت قلعہ میں پہنچا تو شاہ عالم نے شہزادے کو بڑے لطف و کرم سے گلے لگایا۔ اس خدمت کے عوض بادشاہ نے حکومت کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ شاہزادہ اور زیادہ مصائب میں گرفتار ہو گیا۔ اس کی اس تقرری پر منصور علی خاں کے دل میں رقابت کی لہر دوڑ گئی اور وہ بادشاہ سے ناراض ہو گیا۔ منصور علی خاں وہی غدار عہدہ دار تھا جس نے بادشاہ کو بعد میں غلام قادر کے حوالے کر دیا تھا۔ منصور علی خاں نے بادشاہ کے کان شہزادے کے خلاف بھرنے شروع کیے اور انھیں یہ بتایا کہ شہزادہ ان خدمات کے ذریعہ تخت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور اس نے جو کچھ خدمات انجام دی تھیں اس کے پس پردہ یہی جذبہ کارفرما تھا۔ بادشاہ اس کے پھیر میں آگیا۔ شہزادے کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ بے حد ملول ہوا۔ لہٰذا حکومت سے دستبردار ہو کر وہ پھر قلعہ سے باہر نکل آیا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بے حرمتیاں برداشت کرتے ہوئے مارا مارا پھرا اور آخر میں پھر روہیلکھنڈ پہنچا۔ وہاں سے اس لیے بھاگنا پڑا کیوں کہ اس کے خلاف سازش ہو رہی تھی کہ اسے جان سے مار ڈالا جائے۔ اب وہ سیاست سے دست بردار ہو گیا، فوج برخاست کر دی اور جو کچھ اثاثہ اس کے پاس تھا وہ سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ اور ایک شہری کی حیثیت سے وہ واپس بنارس چلا گیا جہاں اس کے رہنے کے لیے ایک مکان اور کمپنی کی طرف سے وظیفہ مقرر کر دیا گیا اور اس کی عزت کا پورا خیال رکھا گیا۔ یہ امید کی جاتی تھی کہ اب وہ اپنی بقیہ زندگی آرام و سکون سے بسر کریں گے لیکن اچانک وہ

علیل ہوا اور اتنی جلدی اس کا انتقال ہوا کہ اس بات کا شبہ تھا کہ آخری وقت تک کوئی بدخواہ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

واپسی کے وقت ٹیونگ نے خیراتی گھاٹ سے جمنا کو پار کیا۔ آخر میں اس نے لکھا ہے کہ بڑے اطمینان کے ساتھ وہ دہلی میں داخل ہوا تھا، لیکن بڑے افسوس و کبیدہ خاطری کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا۔ مسمار عمارتوں اور شاہجہاں آباد کے درخشاں میناروں کے درمیان اس نے جب پالکیوں، گھوڑوں، سپاہیوں اور مختلف ملکوں کے ہندو مسلمانوں کو جب دور سے دیکھا تو ان کے چہروں پر افسردگی کے آثار نمایاں تھے

میر شیر علی افسوس

دل کا نگر ــــ دلّی

.... شہر ہستناپور گنگا کے کنارے، اگلے زمانہ میں تخت گاہ ، ہندوستان کے بادشاہوں کی تھا۔ وسعت و رونق بھی اس کی اس عصر میں حد سے باہر تھی، زبان اس کے بیان سے قاصر ہے۔ اگرچہ اب بھی نہایت آباد ہے۔ لیکن جیسا پانڈوؤں اور کوروؤں کے وقت میں بستا تھا، سو کہاں ؟

جبکہ دونوں فرقوں میں بیر کھڑی ہوئی اور پھوٹ پڑی، اب پانڈو ایک اور شہر اندر پرست کہ جمنا کے کنارے پر تھا اس میں آئے بلکہ اپنا دارالسلطنت بھی اسی کو ٹھہرایا۔

بعد مدت کے ایک راجہ اننگپال ٹونوڑ نے بکرما جیت کے ایک ہزار کچھ اوپر دو سو سن میں ایک قلعہ اور شہر اپنے نام کا بنایا۔ چنانچہ سلطان قطب الدین ایبک و سلطان شمس الدین التمش نے بعد اس کے اپنا رہنا اس میں مقرر کیا۔

مگر سلطان غیاث الدین بلبن نے ایک اور قلعہ چھ سو چھیاسٹھ ہجری میں بنایا اور اس کا نام "مرزغن" رکھا۔ پھر سلطان معز الدین کیقباد نے چھ سو چھیاسی ہجری میں ایک اور شہر پر فضا و عمارت اس کی دلکشا آباد کیا۔ نام اس کا کیلوگڑھی رکھا۔ اسی کی امیر خسرو نے قرآن السعدین میں تعریف کی ہے۔ لبعد ازاں سلطان علاؤالدین خلجی نے، شہر کوشک لعل" اور سلطان علاؤ الدین نے کوشک سبز" بسا کر اپنا دارالسلطنت مقرر کیا۔ غیاث الدین تغلق شاہ نے سات سو پچیس ہجری میں شہر تغلق آباد کی تعمیر کی۔ پھر اس کے بیٹے سلطان محمد معز الدین جوناں نے ایک اور محل کی بنیاد ڈالی۔ اور ہزار ستون کا ایک قصر بنایا سوائے

اس کے اور بھی مکانات سنگ رخام کے پاکیزہ پُر فضا بنائے۔

پھر سلطان فیروز شاہ نے سنہ سات سو چھپن ہجری میں شہر فیروز آباد، نہایت وسعت و عظمت کے ساتھ بنایا اور جمنا کاٹ کر اس شہر کے نیچے لایا۔ ساتھ اس کے تین کوس کے فاصلے پر ایک اور محل مع جہاں نما بنایا۔ چنانچہ وہ مینارہ اب تک قائم ہے۔ اعوام الناس اس کو فیروز شاہ کی لاٹ کہتے ہیں۔

بعد اس کے سلطان مبارک شاہ نے مبارک آباد، آباد کیا اور نو سو اٹھتیس (۹۳۸ھ) ہجری میں ہمایوں بادشاہ نے قلعہ اندر پرست کی مرمت و تعمیر کر کے "دین پناہ" نام رکھا اور اپنی تخت گاہ مقرر کیا۔ پھر شیر شاہ پٹھان نے کوشک سبز کو مار کر ایک اور شہر بسایا اور اس کے بیٹے سلیم شاہ نے گڈھ (سلیم گڈھ) اب تک بھی شاہجہاں آباد میں جمنا کے اندر قلعہ مبارک کے سامنے موجود ہے۔

اگرچہ ہر ایک نے ان بادشاہوں میں سے ایک ایک کر کے شہر بسا کر اپنا دار السلطنت مقرر کیا۔ لیکن ہندوستان کے بادشاہوں کی تخت گاہ ملک بہ ملک دلی ہی مشہور ہے۔ پھر سنہ ایک ہزار اٹھائیس ہجری مطابق بارھویں برس جلوس کے شاہجہاں صاحب قران ثانی نے دلی کے قریب ایک شہر بنیاد کیا اور شاہجہاں آباد اس کا نام رکھا۔

اس کی خوش نیتی سے اس ملک نے رونق اور آبادی پکڑی کہ جتنے قلعے اگلے بادشاہوں کے تھے گمنام ہو گئے فقط اس کا نام رہ گیا۔ جیسے سمندر میں بڑے بڑے دریا ڈھلے ہیں پر نام اس کا ہی باجتا ہے۔ قلعہ بھی اس کا سنگ سرخ کا اس مضبوطی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بنا ہے کہ معمار قضا و قدر کی زبان اس کے اوصاف میں لال ہے پھر ساخت اس کی سی امر محال ہے۔

علاوہ اس کے مکانات قسم قسم کے متعدد و پاکیزہ خاصے اور باغ بھی اس کے گلشن جہاں کے خلاصے۔ نہریں جاری جا بہ جا، حوض ہر ایک مکان میں کٹورا سا بھرا ہوا۔ جدھر دیکھئے کیفیت نئی نظر آئے اور جس طرف نگاہ پڑے وہیں رہ جائے۔ اگر رضوان یہاں کی بہار دیکھتا تو روضۂ رضوان کی دربانی سے ہاتھ اٹھا لیتا۔

جناں کا ہر اِمکاں اس کا نمونہ
خوش اسلوبی میں بلکہ اس سے دوتا
یہاں پھولیں ہمیشہ وہاں کے گلزار
خزاں ان تک نہیں پاتی کبھو بار
نرالی جگ سے رنگت ہے گلوں کے
حلاوت اور ہی کچھ ہے پھلوں کی
یہاں کے طائروں کا رنگ ہی اور
ہے ان کے زمزمے کا ڈھنگ ہی اور
میں ہر شہ کو دوں تشبیہ کس سے
کہ ملتی ہی نہیں اس سے یہ اس سے

گرداس قلعۂ مبارک کے ایک کھائی بہت چوڑی ہے۔ گہری بھی اتنی کہ عمقِ زمین سے ورے۔ اور وہ اس سے کہیں پرے۔ پانی اس کا ایسا لطیف و شفّاف کہ ایک خشخش کا دانہ بھی اس کی تھاہ میں ہووے تو اندھیری رات میں صاف نظر آوے اور جو اندھا بھی اس میں غوطہ لگا سکے تو بلا شبہ نکال لاوے۔

نظر آتی ہے اس کی تہہ میں رائی
کہاں یہ آب گوہر میں صفائی
اگر پڑ جائے اس کے بیچ اک بال
تو یوں آوے نظر موتی کا جوں بال

جمنا بھی اس قلعہ کی تشنۂ دیدار ہو کر آئی اور اس کے تلے نہایت آب و تاب سے بہنے لگی۔ پھر نواب علی مردان خاں مرحوم دریائے مذکور کو کاٹ کر "شاہ نہر" سرمور پہاڑ کے اوپر سے لایا کوچہ و بازار کی رونق زیادہ بڑھی اور شہر کی آبرو دونی ہوئی۔

اکثر لوگوں کی حویلیوں میں بہتے ٹھنڈے پانی سے معمور رہنے لگے اور حوض و تالاب بھی دولت خانہ والا کے بھرپور باغوں میں شادابی اکثر رہنے لگی اور چمنیوں میں طراوت بیشتر۔

بیت

رکھے حشر میں اس کی، حق آبرو　　کہ فیض اس کا جاری ہوا کو بکو

شہر پناہ اس کی سنگی نہایت پختہ و مضبوط۔ عرض و طول و بلندی و خوش اسلوبی میں، اس کی، عقل احاطہ نہیں کر سکتی، بلکہ ایک ایک جہت کی پیمایش کا دھیان نہیں دھر سکتی۔ اندر باہر اس کی تو بی حد سے باہر چپے چپے پر آبادی جدھر ندھر عمارتیں انواع و اقسام کی خوب صورت کثرت سے، حویلیاں طرح بطرح کی خوش اسلوب بہتایت سے باغوں کی بہار بے خزاں —— میں دایم طلسمات کا سماں، ہر ایک محلہ اس کا اقلیم سے زیادہ۔ ہر فضا چھوٹے سے چھوٹا کوچہ اس کا شہر سے بڑا۔ ہجوم خلایق ہر سرِ راہ، ہر ایک مقام ایک تماشا گاہ۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں کے باشندوں نے اپنی بہبودی اور آسایش جو دیکھی بود و باش یہیں اختیار کی، غرض ہر صنف کے اشخاص اور ہر ملک کی اشیا، جب چاہو کثرت سے دیکھ لو۔

کسی چیز کی کمی کسی وقت ممکن نہیں کہ ہو۔ اگرچہ بازار سارا ہی اس کا اپنے عالم میں بالا ہے پر چاندنی چوک، تمام شہر کا، اُجالا ہے ہر دکان اس کی بے مانند، جنس بادشاہ پسند صحن مکان یہ کشادہ، کہ دل کھلا جائے، صاف ایسا کہ آدمی چاول بکھیر کر کھائے۔ دلّال اس بازار کا سوداگروں کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا، بساطی وہاں کا جوہریوں کو خاطر میں نہیں لاتا —— دکان ایک بزاز کی استنبول کے بزازے کے برابر، کوٹھی ایک صرّاف کی تمام ایران کے صرافے کے بڑھ کر۔

فی الواقع اس مقامِ فرحت انجام کو، جتنا سراہیے، بجا ہے، لیکن اردوئے معلّے کا عالم ہی جُدا ہے فضا اس کی نہایت پاکیزہ و وسیع عمارات —— یہاں کی بمرتبہ اسلوب دار و رفیع۔ صحن اس کا رشکِ صحن گلزار، دکان ہر ایک بازار کی بہار، اہل حرفہ، سب مرفہ احوال، کوٹھے اس کے نقد و جنس و جواہر سے مالا مال نہ کسی چیز کی وہاں کمی، نہ بشر اس آبادی میں غمی۔

بیت

ہے دروازہ اس کا گلستاں کا باب | بیاضِ جہاں کا ہے، وہ انتخاب
فضا اس کی دیکھے اگر یک نظر | تو دل تنگ ہووے نہ پھر عمر بھر
بھلاتی ہے یک لخت، غم اس کی سیر | خوش آتی ہے، بس دمبدم اس کی سیر
سماں واں کا دیکھے اگر اک ذرا | تو مانی نہ لے نام ارژنگ کا
بہت ہیں نے یوں اس کی تعریف کی | ہے اردو کی بولی کا ماخذ وہی

نخّاس کے بازار کی طرز ہے جُدی، فضا اُس کی فضائے عالم سے بھی بڑی صحن اس کا اقسام کے چار پاؤں سے، مالا مال، زمین اس کی نہایت صاف ہنا و بال۔ ہر یک طرف خلقت کا ایک دنگل، چابہ چا چہل پہل اور منگل چابک سوار، قسم قسم کے گھوڑوں کو پھر رہے ہیں، خریدار دلالوں کو گھیر رہے ہیں۔ سودا وہاں کا دست بدست، ہر ایک دلاّل کوڑیالا مال مست، کوئی گھوڑے کے مول تول کے لیے ہاتھ لاتا ہے کوئی کھڑا ٹٹو ہی چکاتا ہے۔

ایک طرف سپاہی پیشہ بھلے آدمی چبوتروں پر اپنے اپنے زین پوش بچھائے حقے لگائے۔ بیٹھے ہیں کسی طرف بانکے ٹیڑھے اپنی مجلس جمائے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف کئی شہدے ٹھکتے سُلفے کے دم مارتے ہیں کہیں دو چار لمپنے (لم ہینچنے) زیادہ گو، اپنے اڑھائی چاول جُدے ہی بگھارتے ہیں، — غرض میلے کی سی دھوم اور چھڑیوں کا سا ہجوم، ہر روز (سوائے جمعے کے) دوپہر ڈھلے تک رہتا ہے۔

الغرض اس ملک مبارک بنیاد (شاہ جہاں آباد) کا ہر ایک محلہ خوش سواد اور ہر مقام آباد ہے۔ بنا بر اس کے مسجدیں خانقاہیں مدرسے پاکیزہ و دل چسپ کثرت سے ہیں۔ اور خانہ باغ بھی بہتنا ہیں سنہ ایک ہزار ساٹھ ہجری میں مطابق چوبیسویں سال شاہ جہانی کے، ناف شہر میں ایک جامع مسجد سنگ سرخ کی ایسی بنی کہ اگلوں نے نہ ویسی دیکھی نہ پچھلوں نے سنی۔

منارے اس کے سر بفلک، گنبدِ چرخ، بلاگرداں، اس کے گنبدوں کا عالم بالا تک جلوہ، اس کی برجیوں کا زینہ اس کے منبر کا پایہ عرش سے اونچا، ستون کہکشاں اس کے ستونِ در سے نیچا، محراب اس کی محلِ اجابتِ دعا، نمازی وہاں کا مقبولِ درگاہ کبریا دیواریں سدِ سکندر سے بلند تر، صحن اس کا صحن فردوس کے برابر۔

ہر چند مسجد و باغ اور مسافر خانے کی بنا سے بھی فائدہ لا کلام ہے کیونکہ بنانے والے کا، دنیا میں نام، اور خلق کو بلاشبہ آرام ہے لیکن حمام کی تعمیر، ہر پیر و جوان کی راحت کا موجب ہوتی ہے اور ہر شخص کے دل کی کلفت کھوتی ہے چنانچہ بادشاہی حمام، اس شہر میں ایک فیض عام ہے، کوئی بشر محروم نہیں ساختٗ فلاطون کے حمام سے خوب تر، در و دیوار اس کی خوش اسلوب سراسر، سطح اس کے گنبد کی کرۂ نار سے ملی ہوئی اور دیواروں کی نیو مرکز زمین سے اگلی ہوئی تہہ خانہ اس کا بہترین مکانات، حوض، خشک مزاجوں کے لیے آب حیات۔ مطبخ اس کا مخزن، آتشِ سوزاں کا، ماہ آئینہ اس کے تاباں کا۔ حرارت اس کی حرارت غریزی کو بھڑکاے اور رطوبت اس کی رطوبت اصلی کو بڑھاے۔

القصہ اس شہر کا ہر مکان لاثانی، ساتھ اس کے عمارات کی فراوانی ہر بستی کے اندر جیسی مکانات کی کثرت، ویسی ہی باہر قبروں کی بہتایت اکثر بادشاہوں وزیروں امیروں کے مقبرے اطراف میں ہیں، پر مشہور تو مقبرہ ہمایوں بادشاہ کا کیقباد کی کیلو گڑھی میں، جمنا کے کنارے پر ہے۔

سوا اس کے وہ علما، فضلا، فقرا کہ اپنے عہد میں شہرا آفاق تھے ان کے مزارات بھی اس کثرت سے ہیں کہ شہر خموشاں بسا ہوا ہے۔

مولوی عبدالقادر چیف رامپوری

علم و عمل

دراصل مولوی عبدالقادر چیف رامپوری کے روزنامچے کا ترجمہ ہے، یہ ابھی اپنے فارسی متن کی صورت میں طبع نہیں ہوا۔ قلمی حالت میں ہے اور رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔

مولوی عبدالقادر ریاست رامپور میں کسی ممتاز عہدے پر فائز تھے ان کے نام کے ساتھ چیف کا لفظ جو سرتاسر انگریزی ہے اسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ مولوی صاحب نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے بیشتر دہلی کا سفر اختیار کیا تھا وہ اس سفر میں مرزا اسداللہ خاں غالب سے بھی ملے تھے اور مولانا الطاف حسین حالؔی کی روایت کے مطابق انھوں نے غالبؔ کے اردو کلام کے بارے میں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ پیچیدہ بیانی سے پرہیز کریں۔

ممکن ہے ایسا ہوا بھی ہو لیکن مولوی صاحب کے اس روزنامچے میں غالب کے ترجمۂ احوال میں ایسے کسی مشورے کا کوئی ذکر نہیں۔ مرزا کو اس نوع کے مشورے ان کے مخلص احباب کی طرف سے دئے جاتے رہے۔ ان احباب میں مولوی عبدالقادر چیف بھی ہو سکتے ہیں۔

مولوی عبدالقادر کا یہ سفرنامۂ دہلی جوان کے روزنامچے کا ایک حصہ ہے اگرچہ اچھا خاصا طویل ہے۔ لیکن ان کے یہاں مختلف ترجمے بیشتر بہ اختصار ملتے ہیں۔ اس کے مترجم نے ہر ترجمے کے ساتھ حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے اور مختلف کتابوں کے حوالے دئے ہیں یہاں ان حواشی میں سے بہت ضروری حصے ہی کو شامل رکھا جا سکا۔

دہلی کے اربابِ فضل وکمال

مولانا شاہ عبدالعزیز

خلیفہ حقیقی و پسر جناب شاہ ولی شاہ ولی اللہ محدث ہیں۔ ہر زبان، اردو، فارسی، ایرانی تورانی، دہلی کی مختصر زبانی اور عربی میں ایسا خوش بیان میں نے کم دیکھا ہے۔ شاہ صاحب کی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ دہلی کی فارسی عبارت میں ہے۔ کیوں کہ اسی ملک والوں کی تصنیف ہے اور بقطع تعینّاتی بھی جو اس میں بجواب استدلال بحدیث کی صورت میں ان کے یہاں آیا ہے اور ان عبارات و اشارات میں جگہ جگہ واقع ہوا ہے اسی پر مبنی ہے یہ عربی عبارت عمدہ لکھتے تھے۔ عربی میں ان کے قصائد اور اشعار بھی ہیں۔

شیخ احمد شروانی یمنی نے ان کے مکتوبات فقرات کو دوسرے کا مسروقہ کلام لکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو دیکھا نہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب بینائی جاتے رہنے کی وجہ سے خود نہیں لکھ سکتے تھے، دوسرے کو بلا تامل املا فرماتے تھے

لہ حضرت عبدالعزیز محدث دہلویؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند اکبر تھے۔ ولادت بمقام دہلی ۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء میں ہوئی تاریخی نام غلام حلیم ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے انتقال کے وقت ان کی عمر قریب ۱۷سال کے تھی۔ تمام علوم ظاہر و باطن اپنے والد ماجد سے حاصل کیے۔ بعض کتب حدیث کی سند اپنے والد کے اجل تلامذہ شاہ محمد عاشق پھلتی اور خواجہ امین اللہ کشمیری سے لی، علم فقہ اپنے خسر مولوی نور اللہ سے حاصل کیا۔ جامع علوم ظاہری و باطنی اور صاحب علم و حلم و زہد و ورع و تقویٰ تھے۔ دور دور سے لوگ آپ کی خدمت میں آتے ہوتے اور علم حاصل کر کے دین کی خدمت کرتے۔ آپ مرجع علماء و مشائخ تھے، تمام علوم متداولہ فنون عقلیہ و نقلیہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ حافظہ نہایت قوی تھا۔ تمام عمر دین و ملت کی خدمت میں صرف کردی۔ ہمیشہ درس و تدریس افتا، تفصل خصومات، وعظ و پند، تلامذہ کی تربیت دکھیمن مین میں صرف کردی۔

مولوی شاہ رفیع الدین

مولوی شاہ رفیع الدین جامع الکمالات تھے۔ لیکن فنون ریاضیہ کی تعلیم کی طرف زیادہ ہی متوجہ تھے۔ ان کا حافظہ ان کے ذہنِ تاباں کے بڑھا ہوا تھا۔ بخلاف مولانا شاہ عبدالعزیز کے۔ ہر فن کے ساتھ اس طرح کی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنون علوم مختلف کا درس فرماتے تھے جب ایک کی تعلیم کی تعلیم کی طرف سے دوسرے کی طرف توجہ فرماتے۔ حضار خدمت کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسی فن میں جامہ یکتائی ان کے قامت استعداد پر قطع ہوا ہے۔

ے شاہ رفیع الدین ابن شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ انھیں علم اور سندحدیث حضرت شاہ ولی اللہ سے لی۔ جب حضرت شاہ عبدالعزیز کی کبر سنی اور کثرت امراض کی وجہ سے طلباء کی تعلیم میں حرج واقع ہوا تو شاہ رفیع الدین نے طلباء کو اپنے ذمہ لیا۔

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) قطعہ تاریخ از حکیم مومن خاں مومن

انتخاب نسخہ دیں مولوی عبدالعزیز — بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل
جانب ملک عدم تشریف فرما ہوئے — آگیا تھا کیا کہیں مردوں کے ایماں میں خلل
ہے ستم اے چرخ تو کس کو یہاں سے لیگیا — کیا کیا یہ ظلم تو نے بیکسوں پر اے اجل
جب اٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا — لوٹتا تھا خاک پہ ہر قدسئی گردوں محل
کیا کس و ناکس پہ تھا صدمہ کیا جسوقت دفن — ڈالتا تھا خاک سر پہ ہر عزیز متبذل
مجلس درد آفریں تعزیت میں بھی تھا — جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آکر بے بدل

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہوگئے
فقر دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

مولوی عبدالقادر

تینوں بھائیوں میں کمال رکھتے تھے۔ تمام فنون سے واقف لیکن تفسیر اور حدیث کی خدمت ان کا معمول تھا۔ اکبرآبادی بیگم کی مسجد میں درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے اپنے اور پرائے کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے۔ پہلے ان بزرگوار کو حکم اجل پہنچا۔ ان کے بعد مولوی رفیع الدین جو تمام خاندان میں منکسر المزاج تھے۔ اچانک ہیضہ میں راہی ملک عدم ہوئے اور مولانا عبدالعزیز باوجودیکہ طرح طرح کے امراض میں مبتلا رہتے تھے۔ لیکن سب کے بعد انھوں نے سرائے قدیم کو چھوڑا، خدا ان تینوں بزرگواروں کو ان کے مشائخ عظام کے پاس پہنچائے اور ان کے متبعین حشر میں ان کے ساتھ ہوں۔ آمین، ۱؎

۱؎ شاہ عبدالقادر بن حضرت شاہ ولی اللہ ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ عالم، فاضل، متقی، پرہیزگار، مستغنی المزاج اور متوکل تھے۔ تحصیل علم سے فراغت پاکر اکبرآبادی مسجد کے حجرے میں ساری عمر بسر کردی۔ رات دن ذکر اللہ میں مشغول رہتے، اہل دنیا کی طرف التفات نہ فرماتے قرآن شریف کا بامحاورہ اردو ترجمہ اور موضح القرآن وہ نایاب چیزیں آپ کی یادگار ہیں۔ ترجمہ قرآن نہایت اور بہت مقبول ہے۔ سرسید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں۔

بارہا ثقات کی زبان سے یہ سنا گیا کہ جس امر میں کچھ فرمایا ویسا ہی بے کم وکاست ظہور میں آیا۔ باوجود اس کے کہ بہ سبب کثرت اخلاق کے کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ کرتے اور کسی کو نہ فرماتے کہ ادھر بیٹھ جا یا ادھر، لیکن من جانب اللہ لوگوں کے دل میں آپ کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ روسائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے بہ سبب ادب کے دور دور بیٹھتے اور بدوں آپ کی تحریک کے مجال سخن نہ پاتے اور ایک دو بات کے سوا یارا نہ دیکھتے کہ کچھ اور کلام کریں۔ کرامت حضرت بحد تواتر پہنچ گئی ہیں۔ اگر ان کا بیان کیا جاوے تو کتاب میں گنجائش نہیں ہے

۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۴ء میں شاہ عبدالقادر کا انتقال ہوا۔

مولوی فضلِ امام خیرآبادی

اس شہر میں مولوی فضل امام خیرآبادی کی زیارت سے مستفید ہوا۔ جو مولوی عبدالواحد مرحوم کے شاگرد اور اپنے زمانے کے استاد تھے۔ ان کے تبحر فن معقول میں کیا لکھوں فن منطق میں شیخ کی کتاب کا خلاصہ انھوں نے کیا ہے۔ اس وقت دہلی میں مفتی عدالت تھے۔ قتل اور قصاص کا فتویٰ قلم برداشتہ جیسا چاہتے لکھ دیتے تھے۔ تمام مسائل کے جوابات کتاب الاشباہ والنظائر کی عبارت کے مطابق ہوتے تھے۔

ایک شخص کا مقدمہ قتل کے شبہ میں بعدالت دورہ بمقام گوہانہ ویلدر صاحب کے زیر تجویز تھا۔ کاغذات مثل کا خلاصہ یہ ہے کہ متہم، مقتول کو اپنے ساتھ گھر سے لے گیا۔ اس کے بعد اس شخص کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر ایک عرصہ کے بعد اس شخص کی ہڈیاں ایک گڑھے میں پائی گیئں جس کو متہم ایک روز جھانک رہا تھا۔ اس قتل سے ایک روز پہلے متہم ایک شخص سے کہہ رہا تھا کہ اگر تو میرے ساتھ ہو جائے تو ایک شخص کو مار ڈالوں اور متہم نے اظہار میں محض قتل سے انکار کیا اور کہا کہ یہ ایک شخص میرے بھائی کو مار کر دوسرے ملک میں چلا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر کوئی میرا ساتھی ہو جائے تو میں اپنے بھائی کا قصاص خود لے لوں۔ کوئی میرا ساتھی نہ ہوا اور میرا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ میں اس ارادہ سے باز آ گیا۔ اور اس گڑھے میں اپنے بیلوں کی آنکھوں کی دوائی کہ فلاں جانور کی ہڈی ہے ڈھونڈھ رہا تھا بندہ (عبدالقادر اس وقت جانور کا نام بھول گیا)۔۔۔ اس کی ہڈی کو جلا کر بیلوں کی آنکھ میں لگاتے ہیں) اور نام بردہ (مقتول) نے میرا ساتھ دینے کے ارادہ سے قصد کیا کہ گاؤں میں چلے لیکن وہ میری مدد کے ارادہ سے پھر گیا اور اپنا راستہ لیا اور میں نے اپنا راستہ لیا۔

صاحب عدالت نے مثل فتویٰ کے لیے بھیجدی، جناب ممدوح (مولوی فضل امام خیرآبادی) نے قتل کا حکم دیدیا۔ کہ اس نے قتل کا اقرار کیا ہے۔ اور کتاب الاشباہ والنظائر کی عبارت "الحجۃ اما اقرار او بینۃ او قرینۃ قطعیۃ" تحریر کی۔ ویلدر صاحب نے پھر لکھا کہ اس نے دوسرے قتل کے ارادہ کا اقرار کیا ہے لیکن مقتول کے قتل کا اقرار نہیں کیا۔ اور گواہوں

نے بھی قتل مقتول سے پہلے قتل مبہم کے ارادہ کے اقرار کی گواہی دی ہے نہ کہ قتل مقتول کے اقرار کی۔ ان دونوں صورتوں میں شرع شریف میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔ صاحب عدالت نے اس پر حکم دیا کہ آخری حکم کے لیے روداد اور مجرم کو بڑے صاحب (ریزیڈنٹ) کی عدالت میں دہلی بھیجا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب (مولوی فضل امام خیرآبادی) فتویٰ پر اعتماد کامل اور مقدمہ کی حقیقت پر رائے صائب رکھتے تھے۔ اس لیے مقتول کے ورثاء نے گم شدہ قاتل سے قصاص پا لیا۔ خدا ان (مولوی فضل امام خیرآبادی) کے اعمال کا پورا بدلہ عطا فرمائے۔ ؎

ے مولانا فضل امام ابن شیخ محمد ارشد ہرگامی فاروقی، خیرآباد وطن تھا مولوی عبدالواجد کرمانی خیرآبادی کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ علوم نقلیہ و عقلیہ کی تحصیل کر کے دہلی پہنچے۔ حکومت انگریزی کی جانب سے پہلے مفتی پھر صدر الصدور مقرر ہوئے، مؤلف تذکرہ علماء ہند لکھتے ہیں:۔

شاگرد رشید مولوی سید عبدالواجد خیرآبادی، منصب صدر الصدور شاہجہاں آباد از سرکار انگریزی عزت و امتیاز داشت بر میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال حواشی، نوشتہ در علوم عقلیہ گوئے، سبقت ربودہ آمد نامہ کہ در آن قواعد فارسی بیان کردہ، نیز ترجمہ علمائے جوار لکھنؤ تحریر فرمودہ بس مفید مبتدیان است۔"

شاہ صلاح الدین صفوی سے بیعت تھے۔ فرائض ملازمت کے ساتھ مشغلہ تدریس و تصنیف ہمیشہ جاری رکھا۔ اپنے تلامذہ پر نہایت شفقت فرماتے۔ شاہ غوث علی پانی پتی نے بڑی محبت سے اپنے استاد مولانا فضل امام کا ذکر خیر کیا ہے۔

ہزاروں تلامذہ میں سے سب سے مشہور مولانا فضل حق اور مولانا صدر الدین آزردہ ہوئے کچھ دنوں ٹپیالہ میں بھی رہے۔ ۵ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء میں خیرآباد میں انتقال ہوا۔

مولوی فضل حق خیر آبادی

منشی فضل عظیم کے بھائی مولوی فضل حق ہیں کہتے ہیں کہ فنون عقلیہ میں ریاضی کے سوا سلف کی یادگار ہیں۔ عربی ادب میں ابوالحسن اخفش جیسے ہیں۔ ان کی نثر مقامات حریری سے اور نظم دیوان متنبی سے ممتاز ہے، بندۂ حقیر (عبدالقادر) نے اس یکتائے زمانہ (مولوی فضل حق خیر آبادی) کو ایک مرتبہ دیکھا ہے۔ علاوہ علم کے جرأت و تہوری بھی رکھتے ہیں۔ مولوی کرامت علی ابن مولوی حیات علی خوشنویس ان کی تقریر کا ذکر کرتے تھے کہ ایک روز میں نے کہا کہ حج اصغر عمرہ ہے اور حج اکبر میں عرفات کا قیام بھی ضروری ہے۔ جناب مولوی فضل حق نے فرمایا کہ حج اکبر وہ ہے کہ جمعہ کے دن ہو، ہر چند میں اپنے مدعا پر عقلی دلیل لایا مگر انھوں نے اپنے حسن بیان سے سب کو ہیچ اور پوچ بتا دیا۔ میں نے سُنا ہے کہ ان کی تصنیفات بہت ہیں۔ لیکن بندہ کو ان کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ؎

؎ مولانا فضل حق ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں خیر آباد میں پیدا ہوئے۔ علوم معقول کی تکمیل باپ سے کی اور علم حدیث مولانا شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے حاصل کیا۔ ۱۳ سال کی عمر میں تمام علوم سے فارغ ہو گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا دہلی پر قبضہ ہو چکا تھا۔ ریذیڈنسی میں مولانا فضل حق سررشتہ دار ہو گئے۔ مولانا فضل حق اور شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی سے مذہبی مباحث پر اختلاف ہوا۔ طرفین سے رسائل بھی لکھے گئے۔ مرزا غالب سے مولانا کے بڑے تعلقات تھے۔ وہ ایک عرصہ تک نواب جھجر، راجہ الور، نواب ٹونک اور ریاست رام پور میں ملازم رہے۔ آخر میں واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ میں رہے۔ ہنومان گڑھی کا جو مشہور واقعہ جہاد پیش آیا۔ جس میں مولوی امیر علی امیر المجاہدین تھے

؎ مولانا فضل امام نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی صدر پور کی تھیں۔ ان سے علامہ فضل حق، منشی فضل عظیم اور مولوی فضل الرحمٰن پیدا ہوئے۔ فضل الرحمٰن کی ایک صاحبزادی بی بی امتل تھیں

مولوی رشید الدین خاں

ان سب بزرگواروں کے شاگرد رشید الدین تھا اگرچہ اتنے تیز فہم نہ تھے مگر تعلیم و تعلم کی خوب مشق تھی۔ ہر بات میں اساتذہ کی پیروی کرتے تھے۔ مگر مناظرہ میں بہت جلد رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ نمائش کے بہت زیادہ پابند تھے۔ ہر فن کی بہت کچھ معلومات رکھتے تھے جو کچھ لکھتے بسط و تفصیل سے اور جو کچھ کہتے دراز و طویل، بالخصوص مباحثۂ اختلافیہ دینیہ میں یہی طریقہ تھا اور یہ سمجھتے کہ اب مقابل میں ردو قدح کی گنجائش نہیں رہی۔ بندہ (مولوی عبدالقادر) سے بہت شفقت فرماتے تھے۔ ان سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب کہ بندہ کو اجمیر سے واپسی نصیب ہوئی۔ سنہ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۵ء) میں مسئلہ متعہ کے متعلق لکھنؤ کے شیعہ علماء کے جواب میں جو کتاب لکھ رہے تھے۔ اس کا مقدمہ کئی جز کا ہو گیا تھا اور ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ مجھے کتاب دکھا کر کہا کہ جب یہ کتاب اس شرح و بسط کے ساتھ جو میں چاہتا ہوں پوری ہو جائے گی اور لکھنؤ پہنچے تو وہاں کے علماء اس کے جواب کی فکر میں سر کھپائیں گے اور گریبان سے سر نہ اٹھا سکیں گے۔ میں (عبدالقادر) نے کہا کہ جناب اس کا نام "لوح محفوظ" کہ اسم با مسمیٰ ہو جائے اب اس شہر میں ان جیسا دوسرا کوئی نہیں ہے اور وہ بھی غالباً سنہ ۱۲۴۰ھ یا ۱۲۴۱ھ میں اس دار پر شور و شغب سے اپنے باکمال اساتذہ کے پاس چلے گئے۔[1]

مولوی رشید الدین خاں اور مولوی محمد اسمٰعیل نیز مولوی عبدالحئی سے مجلس وعظ جامع مسجد شاہجہاں آباد میں جو صورت پیش آئی نہ ان کی شریف وضع کے شایان تھی نہ اس خاندان علاقہ رکھنے والوں کے لیے زیبا تھی۔[1]

سر سید احمد خاں بہادر نے ۱۸۴۶ء میں آثار الصنادید کو مرتب کیا اور اس میں تحریر کیا کہ عرصہ تیرہ چودہ برس کا گزرتا ہے کہ مولانا رشید الدین کا انتقال ہوا۔

تذکرہ علمائے ہند وغیرہ نے بھی یہی سالِ وفات لکھا ہے۔

مولوی کرامت علی

مولوی کرامت علی علوم شرعیہ اور ادبیہ کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ اگرچہ کسی فن سے خالی نہیں۔ خوشنویس اور زود قلم میں نے ان جیسا نہیں دیکھا۔ اگر کوئی مانع پیش نہ آیا تو ممکن ہے بہت کچھ ترقی کر جائیں، ہر طرح کے علوم حاصل کیے ہیں۔ مگر تعلیم و تعلم کا رویہ زیادہ تر خاندان عزیزیہ کے طرز پر ہے [۳]

"خلف الرشید ہیں مولوی حیات علی خوشنویس علیہ الرحمہ کے اور شاگرد رشید ہیں مولانا فضل امام صاحب کے فضل و کمال ان کا حد تقریر اور احد تحریر سے زیادہ ہے استحضار مسائل اس مرتبہ کو پہنچا ہے کہ حصولی ان کے ذہن میں حکم ضروری کا حکم رکھتا ہے۔ عرصہ چند سال کا ہوا کہ شہر شاہجہاں آباد کو تلاش معاش کی وجہ سے چھوڑا اور حیدرآباد کی طرف راہی ہوئے۔ چونکہ السفر وسیلۃ الظفر حدیث مشہور ہے۔ گردش فلک نے وہاں ان کے ساتھ موافقت کی اور بالفعل ہزار روپے ماہانہ منصب سے سرفراز ہیں۔ اس نواح میں مع قبائل کے بسر کرتے ہیں۔ نظم و نثر لن کا راقم کو بہم نہیں پہنچا۔"

مولوی کرامت علی بنی اسرائیل کہلاتے تھے۔ مولوی فضل امام خیرآبادی اور شاہ دہلوی کے شاگرد تھے اور علم حدیث شاہ محمد اسحاق اور شاہ اسمٰعیل سے حاصل کیا ان کے والد مولوی حیات علی حنبلی مذہب تھے۔ مولوی کرامت نے نواب فریدالدین اور دبیرالدولہ سے پڑھا تھا۔

مولانا کرامت علی نے سیرت نبوی پر ایک ضخیم کتاب عربی زبان میں "سیرت محمدیہ" تصنیف کی ہے۔ جو ۱۸۵۷ء سے قبل حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی ہے۔ یہ کتاب نظام حیدرآباد دکن کے نام سے معنون کی گئی ہے اور کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک مخطوطہ بھی موجود ہے۔ مولانا کرامت علی کا ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء میں انتقال ہوا۔

۳۔ اخبار الصنادید باب چہارم صد ۲۱

۴۔ مناقب المحبوبین صد ۱۵

شاہ محمد اسمٰعیل

دادا اور چچاؤں کی یادگار مولوی محمد اسمٰعیل ہیں جو ذہن کی جودت اور قوت کی توجیہہ میں بے مثل ہیں۔ خدا ان کا نگہبان رہے۔

لہ شاہ محمد اسمٰعیل ابن شاہ عبد الغنی بن شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۲ ربیع الثانی کو ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ نہایت ذہین الطبع اور حاضر دماغ تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد شاہ عبد العزیز نے تعلیم و تربیت فرمائی۔ علم حدیث کی تحصیل حضرت شاہ عبد العزیز سے فرمائی۔ اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں تحصیل علم سے فراغ حاصل کر لیا حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید نے دین اسلام کی بڑی خدمت کی۔ اس میں مراسم شرک و بدعت کا جو رواج ہو گیا تھا۔ اس کا خوب رد کیا۔ سنت کی تبلیغ اور بدعت کا رد آپ کا مقصدِ حیات تھا۔ اس سلسلے میں جامع مسجد دہلی میں سہ شنبہ اور جمعہ کو وعظ فرماتے تھے۔ سید احمد بریلوی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی حج بیت اللہ کو گئے۔ پھر شمالی ہندوستان کا دورہ کیا۔

وہ ردِّ بدعات اور اصلاح رسوم کے شدت سے قایل تھے۔ شاہ محمد اسمٰعیل شہید نے حضرت سید احمد شہید کی امامت میں سکھوں سے جہاد کیا اور بالاکوٹ کے میدان میں ۱۲۴۶ھ میں ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے، شاہ محمد اسمٰعیل کی تصنیفات سے تقویت الایمان، صراطِ مستقیم، تنویر العینین، ایضاح الحق، منصب امامت، رسالہ بے نمازاں، رسالہ یک روزی وغیرہ، مشہور ہیں۔

مفتی صدرالدین آزردہ

مولوی صدرالدین، مفتی و صدرامین شاہجہاں آباد مولوی فضل امام کے نامور شاگرد ایک عرصہ تک جنرل اختر لونی بہادر کے ساتھ اجمیر، بھمبھ اور جے پور کے سفر میں رہے۔ جنرل اور اس کے داماد کی کلیدی دانش رہے۔ چار سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ صاحب ممدوح نے ان کی تعریف میں دفتر صدر کو لکھ ڈالے اور اس قدر ان پر اعتماد تھا کہ راول سرسال اور راجہ جے پور کی والدہ کے درمیان تکرار کے قضیہ میں مفتی صدرالدین کو پولٹیکل ایجنٹ پر اسون مقرر کیا۔ فاضل، زود فہم، خوش تقریر، دوست نواز اور دشمن گزار ہیں۔ ان کے بزرگوں کی اصل کشمیری ہے اور اقرباء مولوی رشیدالدین خاں ہیں۔ جس وقت بندہ (مولوی عبدالقادر) نے ان کو دیکھا ہے ان کی توجہ اشعار ریختہ اور فارسی کی طرف مطالعہ کتب علمیہ سے زیادہ تھی اسی بنا پر میں نے ان کا ذکر شعراء کے سلسلہ میں کیا ہے۔ ورنہ ان کا مقام یہ نہیں ہے یہ بات ان کے لیے باعث عار ہے۔ ان کا یہ شعر مجھے یاد ہے۔

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا مجھ کو دکھا دے دہن ایسا، کمر ایسی

ایک دوسرے شخص کی زبان سے ایک شعر اسی غزل کا سُنا، جو نسبت اس کی خود کی طرف کرتا ہے ؎

مکھڑا وہ بلا، زلف سیہ نام دہ کافر
کیا خاک جئے جس کی شب ایسی سحر ایسی

میری رائے میں یہ دونوں شعر ممکن ہے کہ ایک شخص کے کلام نہ ہوں۔ مگر دوسرے کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھا جاسکتا۔

۔ مرزا غالب، مومن، مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے خوب تعلقات تھے۔

مرزا حسن علی لکھنوی

مرزا حسن علی لکھنوی نے جو سفر حج بھی کر چکے ہیں اور کلکتہ میں مخلوق کو وعظ و تلقین سے نفع پہنچایا ہے۔ کچھ عرصہ سے باندہ میں بھی بزم ارشاد آراستہ کی ہے۔ جو کچھ بھی ہیں سلسلہ عزیزیہ میں بس وہی ہیں۔ ان کا دل و دماغ ملفوظات عزیزیہ و رفیعیہ کی بیاض سمجھنا چاہیے۔ اس زمانہ میں ایسے بزرگوار کا وجود غنیمت ہے [1]

[1] مرزا حسن علی کا اصلی نام محمد، لقب جمال الدین اور عرف حسن علی، والد کا نام عبد العلی تھا۔ درسی کتابیں ملا حیدر علی سندیلوی المتوفی ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء سے پڑھیں، پھر دہلی پہنچے۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر سے استفادہ کیا، علم حدیث شاہ عبد العزیز سے پڑھا۔ مرزا حسن علی نامور مدرس، بلند پایہ محدث، شیوہ بیان مقرر اور طرار خطیب تھے۔ نہایت بااخلاق، متواضع، نیک طینت اور درویش صفت عالم تھے۔ جب سید احمد شہید لکھنو وارد ہوئے اور لوگوں کو جہاد کی دعوت دی تو مرزا حسن علی نے سید احمد شہید کی بڑی تعظیم و تکریم کی، اپنے مکان پر دو مرتبہ دعوت کی اور چند چیزیں نذر کیں۔ ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں فریضہ حج ادا کیا۔ مرزا صاحب کا حلقہ درس نہایت وسیع تھا

مولوی محبوب علی

اس خاندان کے شاگردوں میں محبوب علی شاہجہاں آبادی ہیں۔ ان کے والد سرکار بادشاہ دہلی کے قدیم متوسلوں میں سے ہیں ان کی توجہ زیادہ تر حدیث اور تفسیر پر رہی اور ان کی ہمت حتی المقدور علم کے مطابق عمل میں مصروف رہے۔ ہر معاملہ میں ذہن رسا اور فکر درست رکھتے ہیں، طرز مباحثہ اور طریق مناظرہ کو مختصر تقریر میں عمدہ ادا کردیتے ہیں ۱ے

ا ے مولانا محبوب علی ابن مصاحب علی بن حسن علی خاں سنہ ۱۲۰۱ھ / ۷۷۔۱۷۸۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے شاہ عبدالعزیز کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ سید احمد شہید سے بیعت کی تھی۔ سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں۔

"علم حدیث و فقہ میں اقران و امثال سے بیش جہاندیدہ و مفر کردہ تحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ کی جناب مولوی شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ العزیز کے خاندان رفیع الارکان سے کی ان فنون میں ایسی مہارت رکھتے ہیں کہ مسائل جزئیہ مثل لوح محفوظ کے ان کے تختۂ حافظہ پر منقوش ہیں۔

حضرت سید احمد شہید کے ہمراہ سکھوں سے جہاد کرنے کے لیے باغستان گئے۔ مگر وہاں کے شدو مصائب دیکھ کر نہ صرف گھبرا گئے بلکہ جہاد کے خلاف وعظ کہا

مولوی محبوب علی نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بھی فتویٰ جہاد کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا، بلکہ بقول سرسید احمد خاں بہادر جنرل بخت خاں سے صاف انکار کردیا اور کہا کہ۔" ہم مسلمان گورنمنٹ انگریزی کی رعایا ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی رو سے اپنے حاکموں سے مقابلہ نہیں کرسکتے

۶۔ صیانتہ الایمان، از مولوی محبوب علی (قلمی مخزونہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس لائبریری

۷۔ رسالہ دربیان عدم جواز رقیع بیایہ، از مولوی محبوب علی (قلمی مخزونہ آل پاکستان ایجوکیشنل لائبریری کراچی

حکمائے دہلی

حکمائے دہلی:۔ دہلی کے حکماء میں نامور حضرات یہ ہیں۔

حکیم شریف خاں:۔ اس شہر میں خاص شاہی طبیبوں میں اپنے فن میں شہرت رکھتے تھے، طبی کتاب[1] مثلاً شرح اسباب اور نفیسی پر حاشیہ بھی لکھا ہے، ابھی تک بندہ کی نظر سے نہیں گزرا، مفردات میں بھی ایک کتاب وتالیف شریفی بخواص ادویہ "ہندی" ہے، اس سے لوگوں کو یہ فائدہ پہنچا کہ

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) آف انڈیا میں ان کا ذکر کیا ہے۔

(1) LOYAL MOHAMMADANS OF INDIA BY SYED AHMAD KHAN (MEERUTT 1860-61) 1

(۲) THE TRIAL OF MOHAMMAD BAHADUR SHAH BY H.L.O. GARROTT. LAHORE P. 39 (1932)

(۳) تاریخ عروج عہد سلطنت انگلیشیہ، از خان بہادر شمس العلماء محمد ذکاء اللہ دہلوی ص ۳۳۲ (شمس المطابع دہلی سنہ ۱۹۰۴ء)

(۴) دہلی کی سزا (نصرت نامہ گورنمنٹ) مرتبہ خواجہ حسن نظامی ۳،۶۰۳، ۱، (دہلی پرنٹنگ پریس سنہ ۱۹۴۷ء)

(۵) دہلی کا آخری سانس از خواجہ حسن نظامی ۳،۳، ۳۸ (مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی سنہ ۱۹۲۵ء)

[1] حکیم شریف خاں کے والد حکیم محمد اکمل خاں اپنے عہد کے نامی گرامی طبیب تھے، حکیم شریف خان علم وفضل اور شہرت وناموری میں باپ سے سبقت لے گئے، شاہ عالم بادشاہ (سنہ ۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء) تا سنہ ۱۲۳۱ھ / ۱۸۰۶ء کے عہد میں شاہی طبیب رہے، اشرف الحکماء کا خطاب ملا، سرسید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں۔ اپنے عصر میں سرآمد حکماء اور سرحلقہ اطباء تھے آج تک ان کے کمالات کا شہرہ گنبد دوار میں از بس بلند ہے۔ جالینوس وارسطو کا غلغلہ اس کے سامنے ایسا ہے جیسا طوطی کی آواز نقارخانے میں اور فی الحقیقت اس روزگار کے اکثر اطباء نامی انھیں کی نسبت شاگردی سے سرمایہ اعتبار رکھتے ہیں"

حکیم شریف خاں تصنیف وتالیف کا بھی شوق رکھتے تھے، مشکوٰۃ شریف کا فارسی ترجمہ کاشف المشکوٰۃ کے نام سے کیا حاشیہ نفیسی، حاشیہ شرح اسباب، آثار نبوت، علاج الامراض عجالۂ نافع۔ دستور الفصد، شرح مبحث

مخدوم میر نصیر

بزرگان شہر میں مخدوم میر نصیر ہیں۔ اب خواجہ میر درد کی یادگار بس وہی ہیں۔ معتقدین بے روک ٹوک اور دوسرے لوگ بانسری کا نغمہ سننے کی تقریب میں مہینے میں ایک بار ان کی خدمت میں جاتے ہیں۔ اس خاندان میں یگانہ بیگانہ سے بے غرض ملاقات کے وقت بھی شاہانہ رسوم کی پابندیاں کثرت سے ہیں۔ بندہ نے ان کی زیارت کی ہے مگر انھوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ لہ

میر محمد

ایک بزرگ میر محمد نام ہیں، دوسروں کی بہ نسبت رندوں کی تلقین میں زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ شہر کے دوسرے لوگ جو عقل کے حجرے میں رہتے ہیں اتنی عقیدت نہیں رکھتے، مگر قلعہ مبارک کے سلاطین سب کے سب جتنا کہ چاہیے اس سے کہیں زیادہ اعتقاد رکھتے ہیں لہ

حاجی لال محمد

فخریہ سلسلہ کے بہت مشہور بزرگ حاجی لال محمد نامی تھے۔ چھوٹے مدرسے میں رہتے تھے۔ ضعف پیری کے باوجود ہر چھوٹے بڑے کے لیے سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے اور اس کبرسنی میں خواجہ بزرگ معین الدین اجمیری کے عرس کے زمانہ میں تلقین کرتے کرتے یہاں (دہلی) سے اجمیر تک جاتے تھے اور باوجودیکہ اس سلسلہ میں میر شمس الدین کا ہاتھ پکڑ کر مولانا فخر الدین کے طریقہ سے آشنا ہوئے تھے

حکیم ذکاءاللہ خاں

حکیم ذکاءاللہ خاں حاذق الملک تشخیص اور علاج میں بہت مشہور تھے، ان کی بھی معالجات میں ایک کتاب ہے بندہ (مولوی عبدالقادر) نے معالجات ذکائی اور معالجات شریف خانی دونوں کتابیں دیکھی ہیں، ان دونوں بزرگوں نے دونوں کتابوں میں پہلے لوگوں کی تصانیف پر اپنے مجربات اضافہ کیے ہیں جیسا کہ اس فن کے مصنّفوں کا طریقہ ہے، ایک کا تجربہ دوسرے کو یقین کا فائدہ نہیں دیتا اور اپنے تجربہ کی روشنی میں یقین حاصل کرتے ہیں، مگر دو بھی عام طور پر ہر ملک، ہر شخص اور ہر زمانہ میں مشکل سے مفید ہوتا ہے، جملہ "سقمونیا[1] صفرا کا مسہل ہے"، اتنا مشہور ہے کہ منطقی رسالوں میں مثال کے طور پر لاتے ہیں۔ علامہ قطب الدین درۃ التاج میں لکھتے ہیں کہ ملک صقلاب میں سقمونیا ہرگز اسہال کا فائدہ نہیں دیتا، میری یہ رائے ہے کہ اگر یہ بزرگ (حکیم ذکاءاللہ خاں) اتنی ہمت کر جاتے کہ ایک چھوٹا سا رسالہ ایسا لکھ دیتے جس میں ہر مرض کی خاص خاص علامتیں ہوتیں اور مشترک علامتوں کو چھوڑ دیتے تو بہت مفید ہوتا اور یقیناً وہ اس پر قادر تھے اور دوسروں کے لیے مشتبہ صورت میں نفع دیتا یا کوئی ایسا رسالہ لکھ دیتے جس میں اقسام نبض کی تصویریں ہوتیں تاکہ سیکھنے والا ہر قسم کی تصویر دیکھ سکتا، اب کسی استاد یا شاگرد کے اختیار میں نہیں کہ ایک قسم کی نبض کے مریضوں کو ایک مطب میں جمع کر سکے، اس تصنیف کی صورت یہ ہوتی کہ معتدل نبضہ کا ایک خط کھینچتے، پھر چونکہ ہر نبضہ میں دو حرکت اور دو سکون ہیں، انبساطی و انقباضی اور مرکزی و محیطی، اس خط کو چار حصوں میں ہر ایک کے زمانہ کے اعتبار سے معتدل نبضہ میں تقسیم کر دیتے، اس کے بعد دوسری قسمیں لکھتے اور ہر قسم کے خط کو لکھ کر حرکات و سکنات میں فرق زماں کے لحاظ سے حصے کر دیتے تو اس قدر درد سری اور دشواری نہ ہوتی جتنی کہ موٹی موٹی کتابوں کی تصنیف میں فرمائی ہے، البتہ غور و فکر کی زیادہ ضرورت پڑتی کیا کیا جائے کہ ایک عرصہ سے تمام فنون کے علماء نے کسی نئی کار آمد اور نئی ایجاد پر ہمت نہیں باندھی

---

[1] ایک دوا کا نام ہے، جسے انگریزی میں SACMONY کہتے ہیں۔

ہندی دواؤں کی خاصیت بھی معلوم ہو گئی، بعض ہندی، یونانی، فارسی اور عربی دواؤں کے ناموں کی مطابقت بھی کی ہے۔

بعض لوگوں سے میں نے سنا کہ حکیم شریف خاں فرماتے تھے کہ قطب فلک الافلاک کا سکون محال ہے، بلکہ اس دعویٰ کو قلم بند بھی کر دیا ہے، مگر بندہ نے یہ خود دیکھی نہ سُنا۔ یا انہوں نے ستارۂ جدی (۶) کے متعلق لکھ دیا ہو جو قطب شمالی میں ہے اس لیے کہ نفقہ بھی اسی میں مشہور ہو گیا ہے، نقل کرنے والوں نے ان کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے اس طرح ظاہر کر دیا یا بڑھاپے میں ان کے خیال میں اسی طرح آگیا ہو ورنہ ہر کوئی جانتا ہے کہ محوری خط کے کنارہ کو قطب کہتے ہیں اور محور اس خط کو کہتے ہیں جو مرکز پر گزرتے ہوئے قطبین کو ملا دے اسی خط پر کرہ کی گردش

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) حیات قانون اور تالیف شریفی وغیرہ متعدد عربی و فارسی کی تصانیف ان سے یادگار ہیں، حکیم شریف خاں کا بڑا کارنامہ قرآن شریف خاں کا بڑا کارنامہ قرآن کریم کا اردو ترجمہ ہے جو حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی سے تقریباً بیس سال پہلے کا ہے، حکیم محمد احمد خاں دہلوی (متوفی ۱۹۳۷ء) کے پاس یہ پورا ترجمہ مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا، تذکرہ علمائے ہند میں حکیم شریف خاں کا انتقال ۱۲۳۱ھ ۱۸۱۵ء میں لکھا ہے اور یہ قطعہ تاریخ درج ہے:۔

دریغا ازین دار فانی گزشت	حکیم و طبیب و لطیف و ظریف
خرد گفت سال وفاتش بمن	صد افسوس مرزا احمد شریف ۱۲۳۱ھ ۱۸۱۵ء

مگر حکیم شریف خاں کے مزار پر جو لوح کندہ ہے اس پر ۱۲۱۶ھ ۱۸۰۱ء تحریر ہے۔ لوح مزار اس طرح ہے۔

هو الحکیم

هذا مرقد اشرف الحکماء الحکیم محمد شریف خان الله هادی دخل الجنة

بلا حساب۔ سنہ ۱۲۱۶ھ ۱۸۰۱ء

تفصیل کے لیے دیکھئے:۔

(۱) آثار الصنادید باب چہارم ص ۳۷ (۲) تذکرہ علمائے ہند ص ۸۵ (۳) مختصر سیر ہندوستان صفحہ ۸۱ (۴) حیات اجمل از قاضی عبدالغفار ص ۹ - ۱۰ (انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ) (۵) داستان تاریخ ادب اردو ص ۱۴۴ - ۱۴۵ (۶) LIST OF MUHAMMADAN AND HINDU MONUMENTS.III PP 42 - 43

شعرائے دہلی

اس شہر میں شعرا بہت ہیں بلکہ اردو زبان میں ریختہ شعر کی ابتدا یہیں سے ہوئی ہے۔

مرزا محمد رفیع سودا

مرزا سودا قصیدہ گوئی اور تعریف و تنقیص کے تازہ مضامین میں اپنے زمانہ کے سردار تھے[1]۔ مگر دوسری زبان کے الفاظ کی صحت کا چنداں خیال نہ رکھتے تھے آفتابہ کی بجائے آفتادا، فعل متحرک کی جگہ فل، دوسرا حرف ساکن اور مُبرِّہن میں ب مفتوح اور ر ساکن بجائے مُبرہن ب ساکن اور ر مفتوح، لائے ہیں۔

میر تقی میر

دوسری زبان کے الفاظ خواہ فارسی ہوں یا عربی غلط نہیں لاتے۔ ان کی نظم میں جہاں بھی جو حرکت ہے نرالی ہے، تعقید بھی ان کے کلام میں کم ہے۔ کلمات کو با موقع استعمال کرنا اور ترکیب کی چستی میں میر اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ لیکن کوئی تازہ مضمون ان کے دیوان میں کم ملے گا۔ فارسی اشعار کا بعینہٖ ترجمہ ان کی ادبیات میں بہت ہے[2]۔ غالباً میر نے دوسروں کو نظم کا ترجمہ نظم میں کرنے کا طریقہ سکھانے کے لیے قصداً ایسا کیا ہوگا۔ میر فرماتے ہیں:

تیرے قدم کا ہوگا جس جا نشاں زمین پر رکھیں گے سر کو اکثر صاحبدلاں زمین پر

سعادت یار خاں رنگین

سعادت یار خاں رنگین کی عمر ۷۰ سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اب تک ان کے کلام کی شوخی جوان ہے۔ مختلف اصناف سخن میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ریختی میں میر سوز اور میر انشا اللہ خاں سے اور ہزل میں صاحبقران سے بڑھے ہوئے ہیں ان کی یہ دو بیتیں ہر

چھوٹے بڑے کی زبان پر ہیں ؎

آہ کیجیے تو آن جاتی ہے — اور نہ کیجیے تو جان جاتی ہے
وہ نہ آئے تو تو ہی چل رنگیں — اس میں کیا تیری شان جاتی ہے

اردو زبان میں ان کا ایک فرسنامہ لکھا ہے جو سب فرسناموں سے بہتر ہے
سنہ ۱۲۵۱ھ / سنہ ۱۸۳۵ء میں رنگین کا انتقال ہوا۔

نصیر دہلوی

اس سلسلہ میں نصیر الدین نصیر مشہور ہیں ان کا یہ مطلع مشہور زمانہ ہے۔

پشت لب پر ہے تری یہ خط ریحاں ایسا
منہ تو دیکھوں لکھے یاقوت رقم خاں جیسا

وافی دہلوی

ایک بالکل بے پڑھا شخص ہے۔ وافی تخلص ہے، ایک شعر اس کا میں نے سنا تھا

تو ہے وہ دشمن جانی کہ نہ جینے دیتا
زیست ہوتی اگر انسان کی انسان کے ہاتھ

رضی دہلوی

نواب سید خاں بھی شہر کے شاعروں میں تھے۔ ان کا یہ مطلع دل میں ہے:

اگر مرنے سے ہے وہ کام جاں راضی تو مر دیکھو
یہی تدبیر باقی ہے میاں دل یہ بھی کر دیکھو

مولوی امام بخش صہبائی

تخلص ان کا صہبائی ہے۔ یہ فارسی کتب پڑھانے میں اس شہر کے ناموروں میں سے ہیں۔ اگرچہ عربی کے علوم درسیہ سے چنداں لگاؤ نہیں۔ نثر فارسی بھی اچھی لکھتے ہیں اور فارسی نظم سے مختلف اقسام میں فارسی شعر کہتے ہیں۔ مگر اس وقت مجھے اس میں سے کچھ یاد نہیں۔ نہایت سلیم الطبع اور نیک دل ہیں۔ ان کے حسن خلق کو دیکھتے ہوئے مجھے تعجب ہے کہ جناب مولوی صدرالدین سے فن فارسی بلکہ ہر بات میں کیوں جھگڑتے رہتے ہیں۔

علم و ہنر کی کساد بازاری کی وجہ سے معلمی پر گذر اوقات ہے۔ ایک ہندو سیٹھ کے دو لڑکوں کو جنھیں دوسرے معلم شہر "طوطی کی زبان کوے کے بچوں کو سکھانا سمجھ رہے تھے ایسا لکھنا پڑھنا سکھایا کہ گفتار میں التسان جیسے ہو گئے لیکن لڑکوں کے وحشی سیرت باپ نے جو معاوضہ کا وعدہ کیا تھا اس کے پورا کرنے میں پہلوتہی کی اور اس مظلوم مولوی (مولوی امام بخش صہبائی) نے اپنا حال صاحب عدالت تک پہنچایا۔ معلوم نہیں فریادرسی ہوئی یا نہیں۔

حکیم مومن خاں مومن

نوان شاعروں میں مومن خاں مومن ہیں۔ اگرچہ کوچہ چیلان سے متصل کالا محل کے بہت قریب مکان ہے۔ بزرگوں کا مسکن کشمیر ہے۔ ان کے دادا، دادا کے بھائی باپ اور چچا فن طبابت میں مشہور و معروف ہیں، ان لوگوں کی جاگیر کے دیہات خالصہ شریفہ (جائداد صرف خاص) میں شامل ہو گئے۔ اب دہلی کے دوسرے پرانے خاندانوں کی طرح تنگی سے بسر کرتے ہیں۔ ریختہ اور فارسی میں بہت اشعار ہیں۔ ایک بیت مجھے یاد ہے

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا
اگر وہاں نہیں نقشہ تمہارے گھر کا سا

دہلی کے ارباب موسیقی

دہلی کے ارباب موسیقی

دہلی کے ارباب موسیقی میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں:۔

نعمت خاں و فیروز خاں

اس شہر میں نعمت خاں سدا رنگ[1] اور فیروز خاں ادا رنگ کا خاندان ہے، یہ خاندان موسیقی جاننے والوں میں مشہور عالم ہے یہ دونوں محمد شاہ کے زمانہ میں تھے۔
دوسرے (فیروز خاں ادا رنگ) کی ساز زندگی کا تار شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں ٹوٹ گیا[2]
اس نے کئی سروں کو ملا کر ایک سُر نکالا اور "سندورا" نام رکھا، جو رواج بھی پا گیا ہے۔ اکثر لوگ

بسنت کی راتوں میں ہوری (ہولی) اسی سُر میں گاتے ہیں اور ستار پر پردے کی بجائے سندری باندھی جس سے عمدگی پیدا ہوگئی اور ہندیوں کے نزدیک اس فن کا گر یہ تھا کہ تین "ستبک" گلے سے ادا نہیں کیئے جا سکتے، مگر فیروز خان نے ادا کیئے، لیکن کہتے ہیں کہ وہ مشق سے ایک "ستبک" کو سینہ کی آواز سے ادا کرتا تھا اور اس کے سینے کی آواز بلندی کی وجہ سے گلے کی آواز جیسی ہو جاتی تھی اور یہ ہو سکتا ہے کیونکہ بہت سے بھکاری مشق کر کے بھیک کے لیے سینہ سے کلام کرتے ہیں۔

راگ رس خاں

ہمارے زمانے میں نور خاں، رس بین خان اور راگ رس خاں بین بجانے والے تھے۔

ناصر احمد:۔
جب بندہ (مولوی عبدالقادر) اس شہر میں پہنچا تا ناصر احمد کی بین اور رحمت خاں کا گانا سنا۔

ہمت خاں

ہمت خاں بیشک اس فن (موسیقی) کا ماہر تھا، لیکن سکھانے میں بہت دھوکے دیتا تھا۔ رات میں "پوربا" اور "ہمیر" دونوں کا گلے سے نکالنا مشکل کام ہے، لیکن میں ایک محفل میں موجود تھا اس میں ہمت خاں نے خوب ادا کیا۔

قائم خاں

قائم خاں پسر عالم خاں بھی فن موسیقی میں مشہور رہے ہیں نے رامپور میں نواب نصر اللہ خاں کے زمانہ میں بارہا اس کا گانا سنا ہے وہ ایک طرز پر گاتا تھا اور اس کے تین ساتھی تین تال گاتے تھے اور سم برابر پڑ رہا تھا، بہت سے لوگ اس عجیب صفت پر اس کے کمال کی تعریف کرتے تھے، حالانکہ یہ کوئی بڑی کاریگری نہیں اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگرچند تال میدان میں ادا ہوں تو ان کی باہمی نسبت دوگنی، آدھی، تہائی، چوتھائی یا برابر کی ہوگی، جیسا کہ روپک کہ چوتالہ آرہ کی ادھیائی ہے، اور جھپک (؟) میدان میں آرہ چوتالہ کی برابری رکھتا ہے۔ اور سم پر برابر آجاتے ہیں۔

نظام خاں

قائم خاں کا لڑکا نظام خاں اپنے باپ کا بہترین جانشین تھا اور مان خاں اس فن میں اتنا کمال رکھتا تھا کہ بعض اس کو ہمت خاں پر ترجیح دیتے تھے، یہ لوگ دھرپت گانے والے تھے۔

-اور صاحب حیثیت لوگوں میں خواجہ میر درد کا خاندان اس فن کو خوب جانتا ہے، شاہ نظام الدین عرف بڑے صاحب کا بھتیجا بین بجانے میں اور غلام حسین خاں پسر فیض اللہ بیگ خاں کا لڑکا ستار نوازی میں سب سے بہتر شمار ہوتا ہے۔

موسیقی کی اصلاحات

اب اس فن کے اصلاحی الفاظ کی کچھ تشریح کرتا ہوں جو ذہن میں آگئے ہیں۔

دھرپد

بھاشا زبان کا لفظ ہے، چار تک رکھتا ہے، پہلی تک کو استھائی دوسری کو انترا، تیسری کو بھوگ اور چوتھی کو ابھوک کہتے ہیں اس میں حسن و عشق کا بیان ہوتا ہے، اگر مہادیو کی تعریف ہو تو، استِتُ، دشنو کی تعریف ہو تو بشن پد، بادشاہی دبدبہ کے بیان کو سارا، بہادری اور لڑائی کے بیان کو کٹر کا کہتے ہیں۔ حقیقت سب کی ایک ہے، اور وہ ساز جس پر یہ گایا جاتا ہے، بین، رباب قانون پکھاوج، منڈل اور مردنگ ہیں اور وہ تالیں جو اس میں اچھی معلوم ہوتی ہیں، چوتالہ، سُور بھاکتا جس کو سُور فاختہ کہتے ہیں اور دھیالہ تتالہ ہیں اور راگ روانی کے قریب ہو اس کا اس میں گانا اچھا معلوم ہوتا ہے اور اس میں آواز کی نیچی اونچی ہلکی بھاری لوٹ پھیر کرنے کی تانیں مقرر ہیں۔[1]

ہوری

ہوری بھی اسی طرح ہے، مگر اس کی تکیں دھرپد کی تکوں سے چھوٹی ہیں۔ پرانی ہوری کی تال دھمال ہے۔ اس کے بعد دیپ چندی بھی پیدا ہوگئی اس میں موسم بہار اور عورتوں کی عیش پرستی

---

[1] ملاحظہ ہو مطلع العلوم مجمع الفنون از واجد علی ساکن ہوگلی (کلکتہ) ص ۲۶۵ مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۰ء

کا بیان ہوتا ہے۔

دھرپد کا موجد مان سنگھ گوالیاری کو بتایا جاتا ہے اور خیال سلطان حسین شرقی کی ایجاد ہے، کتاب تحفۃ الہند سلطان کی یادگار ہے، اس سے قبل اس (خیال) کو استاد کے تجویز کردہ نام سے گاتے تھے۔ نعمت خاں اور فیروز خاں نے اس میں اپج شروع کی اس میں آواز کی طاقت اور ورزش کا اظہار ہوتا ہے۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اپچوں کی زیادتی سے راگ اور تال دونوں جاتے رہے۔

اس فن کا اصلی مقصد پریشان دل کو سکون بخشنا تھا، مگر اب اس کے خلاف کیفیت ظاہر ہوتی ہے اور موسیقی کا اصل منشاء تناسب، فوت ہو جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر علم و فن میں خود نما مدعی پیدا ہو گئے ہیں، زہد کا مقصد آزادی اور بے تکلفی حاصل کرنا تھا، مگر اب نام نہاد زاہد، بادشاہوں اور امیروں سے زیادہ تکلفات کے عادی ہیں، منطق کا مطلب معلومات کی ترتیب میں غلطی سے بچنا تھا، اب جس قدر زیادہ مغالطے کوئی جمع کر دے، یہاں تک کہ خود بھی ان سے نہ نکل سکے بس وہی اس فن میں نامور ہے، فلسفہ کا منشاء عقل سے چیزوں کا معلوم کرنا تھا آج فلسفی کا بس یہ کمال ہے کہ مصطلحات کو رٹ کر دوسروں کے سامنے کہہ دے جس کو نہ خود سمجھے اور نہ اس کا مخاطب سمجھے، متکلم کا یہ مقصد ہوتا تھا کہ شریعت کی باتوں کو عقلی طور سے سچ کر دکھائے اور جو بات عقلاً محال ہو وہاں شرعی قول کی تاویل کر دی جائے لیکن اس زمانہ میں متکلم کا یہ کام ہے کہ خواہ مخواہ اپنے ملک کے گذشتہ متکلمین کی آراء کو کلام الٰہی کی طرح تسلیم کرائے اور اگر کسی کے دل میں نہ اترے تو برا بھلا کہنے لگے۔

ٹپہ:۔ ٹپہ میں چھوٹی سی دو تکیں ہیں، پہلے پنجابی زبان میں اور اس کے بعد مارواڑی اور دوسری زبانوں میں جاری ہو گیا، اس میں اپج کا رواج بہت ہے، مگر اچھا کم لگتا ہے اور ٹھمری اس سے زیادہ مختصر ہے۔ کہروا، اور داورا بندیل کھنڈ میں نکٹا اور ساری بنگالہ میں ٹھمریاں ہی ہیں، ٹپہ اور ٹھمری وغیرہ بچوں اور عورتوں کی نرم آواز کے مناسب ہیں اور دھرپد بھاری آواز کے لیے موزوں ہے۔ الفاظ کو وزن سے گانے کا نام تال ہے، راگ اس پر موقوف نہیں کیونکہ الاپ میں راگ ہے تال نہیں اور پکھاوج، ڈھولک، منڈل اور

دف میں تال ہے راگ نہیں۔

بین:۔ بین ایک ساز ہے کہ ایک لکڑی میں دو کدو باندھ دیتے ہیں اور اس لکڑی پر بہت سے تار باندھتے ہیں اور ان تاروں کے نیچے اکیس جگہ چھوٹی چھوٹی لکڑیاں رکھتے ہیں، جن کو سار کہتے ہیں اور اس کو دونوں ہاتھوں سے بجاتے ہیں۔ کبھی مضراب سے اور کبھی ناخن سے اور ستار، بین کا مختصر ہے جو ایک کدو تین تار اور چودہ لکڑیوں کا ہوتا ہے اس کو سندری بھی کہتے ہیں۔

آواز کی پستی و بلندی کے سات درجے مقرر کیے ہیں، پہلے درجہ کو کھرج اور شر بھی کہتے ہیں، دوسرے کو رکھب، تیسرے کو گندھار، چوتھے کو مدھم، پانچویں کو پنچم، چھٹے کو دھیوت اور ساتویں کو نکھاد کہتے ہیں اور جب نکھاد سے اوپر کو جائیں تو کھرج ہو جاتا ہے، جو پہلے کھرج سے بہت اونچا ہوتا ہے کیونکہ ان سُروں کا فرق مدارج کی تیزی اور سستی پر ہے، نہ کہ آواز کی پستی و بلندی پر، اور ایک تار کے جب دونوں سرے (کھینچ کر) باندھ دیں اور ایک جانب انگلی سے ماریں تو ایک آواز نکلے گی پھر اس کے قریب تر اس سے تیز یہاں تک کہ آدھے تار تک آواز تیز ہوتی جائے گی اور آدھے کے بعد پھر وہی پہلی سی ہو جائے گی، لیکن صدا (گونج) بڑھ جائے گی[۱]

اس سلسلہ میں بیان کو اگر طول دیا جائے تو ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے اور اس کتاب کے مطالعہ سے معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ راگ، سر اور تال کی کون سی قسم ہے اس سلسلہ میں دو تین باتیں ذہن نشین رکھنی چاہئیں کہ جب کوئی گندھار والا سُر گا رہا ہو گا تو یقیناً اس کے دونوں نتھنے پھیلے ہوئے ہوں گے اور "دھیوت" کے ادا کرنے میں ناف ہلتی ہے، اسی طرح ہر ایک کی ایک خاصیت ہے، دوسرے راگوں کے بھی پہچاننے کا بھی

---

[۱] فن ستار پر اردو میں ایک مفصل رسالہ مرزا رحیم بیگ ولد مرزا باقر بیگ نے ۱۸۷۰ء میں بمقام لاہور اور بانس بریلی تسہیل الستار کے نام سے مرتب کیا، اس میں مؤلف نے اس فن کو نہایت آسان کر کے بیان کیا ہے، مطبع نولکشور سے یہ رسالہ ۱۹۱۲ء میں (بار ششم) شائع ہوا ہے۔

دہلی کے ہندو فضلاء

دہلی کے ہندوؤں میں علم وفضل کے اعتبار سے یہ لوگ ہیں۔

پنڈت مُرلی دھر

کہتے ہیں کہ اس شہر کے ہندوؤں میں پنڈت مرلی دھر تمام علوم ہندیہ سے واقفیت رکھتے تھے لیکن بندہ نے انہیں نہیں دیکھا۔

پنڈت گُنانند

پنڈت گنانند بہاری لال کی سفارش سے چند روز اجمیر میں عدالتی پنڈت رہے، علوم ریاضیہ کے علاوہ ہندوؤں کے دوسرے علوم سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے اور اپنے مذہب کے مطابق فتویٰ جس کو ہندی زبان میں "بوستا" کہتے ہیں اچھا لکھتے تھے، ایک مرتبہ ایک گوہ (یا ناکہ) بچھکر کے تالاب میں ایک آدمی کو لے گیا تھا، صاحبان انگریز کی طرف سے یہ سوال ہوا کہ انسان کو مار ڈالنے والے جانور کو ہلاک کر ڈالنا چاہیئے یا نہیں اس سلسلہ میں اس پنڈت نے نہایت زیرکی سے جواب لکھا کہ انسان پر حملہ کرتے وقت یا کسی انسان کو مار ڈالنے کے بعد ضرور ہلاک کر دینا چاہیے لیکن اس مخصوص ذات کو اور نہ اس جنس میں سے ہر ایک کو، صرف اس خیال سے کہ یہ جنس، انسان کو ستاتی ہے۔ اس جنس ہی کے پیچھے پڑ جانا ہمارے مذہب میں جائز نہیں ہے، جیسے کہ بے ارتکاب جرم و قتل، غارت پیشہ قوم کے مار ڈالنے کا کوئی جواز نہیں ہے، سب نے ان کے جواب کو پسند کیا۔

پنڈت گنانند سے بندہ کا میل جول تھا، اس لیے میں نے اپنے طور سے پوچھا کہ اگر کبھی صاحب علم و عمل پنڈتوں نے ایسا کیا ہو تو سند ہو سکتا ہے یا نہیں جواب دیا سند ہے، میں نے کہا کہ راجہ جنمی جی نے اس بناء پر کہ راجہ پری چھت کو ایک سانپ نے کاٹ لیا تھا،

پنڈتوں سے فرمایا کہ سارے سانپوں کو منتر سے مار ڈالیں، چنانچہ ان لوگوں نے بہت سے سانپ مار ڈالے اس پر پنڈت جی نے جواب دیا کہ راجہ پری چھت کو مارنے والے سانپ کا نام تجھک تھا جو ہندوؤں کے اعتقاد میں تمام سانپوں کا بادشاہ ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ افسر کے جرم میں لشکر پٹا کرتا ہے۔

آرتھ رام

سراوگیوں میں آرتھ رام نامی جے پور کے باشندے سگن چند کی بیٹھی میں رہتے تھے ان کے مذہب کے لوگ کہتے تھے کہ آرتھ رام کوئی بڑے عالم و عامل نہ تھے مگر خوش بیان اور زود فہم تھے، ایک روز ان کے چیلوں میں سے ایک نے بندہ سے پوچھا کہ کسی جاندار کو بغیر اس کے کہ وہ کسی کو ستائے یا اس سے نقصان کا اندیشہ ہو، اس کو مارنا اور ستانا برا ہے یا نہیں، میں اس وقت سگن چند کے گھر سے نکلا تھا، میں نے فوراً جواب دیا کہ میں اپنی تحقیق اور عقلی رائے تو کسی سے نہیں کہتا، لیکن آرتھ رام کے اصول کے مطابق اس کا جواب ظاہر ہے کہ کوئی جاندار اپنی زندگی میں اس لیے تکلیف اٹھاتا ہے کہ اس نے پہلے جنم میں دوسروں کو ستایا تھا اور اسی بنا پر وہ مارے جاتے ہیں کہ پہلے جنم میں مار چکے ہیں یہ جواب سنکر وہ شخص

چرنداس

شاہ عالم بادشاہ کے ابتدائی زمانہ میں چرنداس نامی ایک درویش تھا، ہندو مذہب کی کتابوں سے خوب واقف تھا، مسلمانوں کے رسم و رواج بھی جانتا تھا، اس کے چیلے بہت ہیں، یہ لوگ صبت نہیں پوجتے اور عبادت فکر سے کرتے ہیں، اس درویش نے ایک کتاب فن سرودا (راگ) میں بزبان ہندی لکھی ہے، جو ہندی نظم کی ایک قسم چوبولے کے وزن میں ہے، یہ کتاب بہت رواج پا گئی ہے اور یہ فن سانس کے دائیں اور بائیں نتھنے سے نکلنے پر چند امور کی دلیل بن جاتا ہے اور اس فن میں بہت سی چیزیں ہیں جن میں سے کچھ مجھ کم عقل کی سمجھ میں بھی آتی گزشتہ واقعات دوسرے حالات پر ہیں اور متنفس کی غربت و مالداری اور آرام و تکلیف علیحدہ انداز پر ہیں، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی اور اگر سمجھ میں آ بھی جائے تو میں اس کو علم ہی نہیں سمجھتا بلکہ فال دیکھنے والوں، رمالوں اور ہاتھ دیکھنے والوں کی باتیں سمجھتا ہوں۔

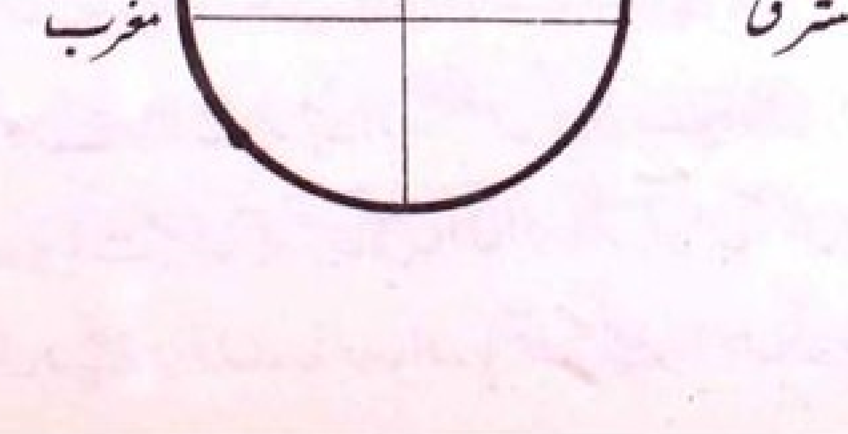
مساجد

جائے نشست

جامع مسجد کے حوض کے کنارے پر ایک جگہ ہے کسی کو اس مقام پر بیٹھنے نہیں دیتے اس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ یہاں پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا ہے. سبحان اللہ لوگ مکے اور مدینے جاتے ہیں وہاں پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نشست کے مقامات پر بیٹھنے سے کسی کو منع نہیں کیا جاتا اور یہاں صرف خواب میں دیکھنے کی روایت پر یہ ممانعت ہے بے وقوف یہ نہیں سمجھتے کہ ان (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کی مسند پر غاصباً بیٹھنا اور اسلام سے خارج ہونا ہے۔

جامع مسجد میں دائرہ ہندی

اس شہر کی وہ عمارتیں جنھیں لوگ دیکھنے جاتے ہیں قلعۂ مبارک ہے جو سنگ سُرخ کا ہے اور جامع مسجد ہے اور اس میں حوض کے کنارہ پر ظہر اور عصر کا وقت معلوم کرنے کے لیے ایک دائرہ ہندی بنا دیا ہے جس میں معمولی خطوں سے ایک خط زائد ہے جس کی وضع اس وقت خیال میں نہیں رہی۔ اس فن کے جاننے والوں نے بھی ٹھیک بیان نہیں کیا معمولی دائرہ ہندیہ کی تشکل یہ ہے جو اکثر بڑے شہروں میں بنا لیتے ہیں



یہ دائرہ ہندیہ اس طرح بنایا جاتا ہے کہ ہموار زمین پر جتنا بڑا چاہیں ایک دائرہ کھینچیں اور اس کے بیچ میں مرکز پر ایک مخروطی (یعنی اوپر سے باریک نیچے سے موٹی) کیل جو قطر دائرہ کے چوتھائی کے برابر ہو سیدھی کھڑی کریں شروع دن کا سایہ مغرب کی طرف لمبا ہوگا انتظار کریں کہ گھٹتے گھٹتے دائرہ کے کنارے پر آجائے وہاں ایک نشان لگادیں پھر دوپہر کے بعد جب یہ سایہ مشرق کی جانب بڑھے تو دیکھتے رہیں جب یہ سایہ کنارہ پر پہنچے وہاں بھی ایک نشان لگادیں پہلے نشان کو مدخل ظل اور دوسرے کو مخرج ظل کہتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک سیدھا خط کھینچ دیں۔ پھر اس خط کے دو حصے کریں۔ بیچ میں مرکز کو لیتے ہوئے محیط تک ایک خط کھینچیں یہ خط نصف النہار کہلاتا ہے۔ جب اس کیل کا سایہ اس خط سے مشرق کی جانب ہو جائے تو ظہر کا وقت شروع ہوگیا اور عصر کا وقت شروع ہونے کی شناخت یہ ہے کہ اس کیل کا سایہ خط نصف النہار پر جس قدر تھا اس کے علاوہ جمہوری مذہب کے مطابق اس کیل کی برابر ہو جائے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق دوگنا ہو جائے اور زمین کی ہمواری کبھی پانی سے معلوم کرتے ہیں جو معماروں کا معمول ہے کہ جب پانی ہر طرف کو بہہ جائے تو سمجھتے ہیں کہ زمین ہموار ہے۔ دوسرا طریقہ گنیا سے معلوم کرنے کا ہے۔ گنیا ہر طرف رکھنے میں ساہول اگر درمیانی خط میں رہے تو زمین ہموار ہوگی اور جس جانب سائل جھکے گا وہ رخ نیچا ہوگا اور اس کے مقابل جانب بلندی ہوگی۔ گنیا کی شکل یہ ہے:

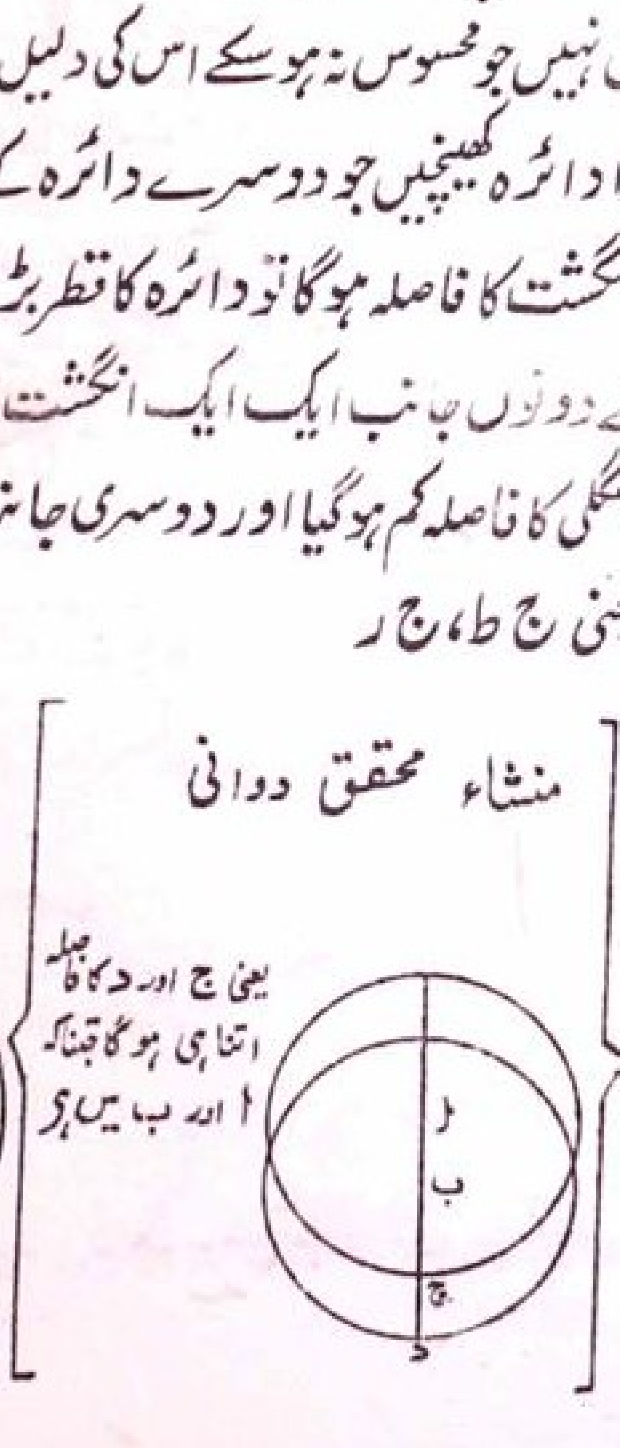
؎ دہلی کی جامع مسجد کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:

ا۔ آثار الصنادید باب سوم صفحہ ۷۰ ۔ ۱۱۲، یادگار دہلی صفحہ ۲۷ ۔ ۴۰ و ۳۹، واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم صفحہ ۱۰۱ ۔ ۱۱۳

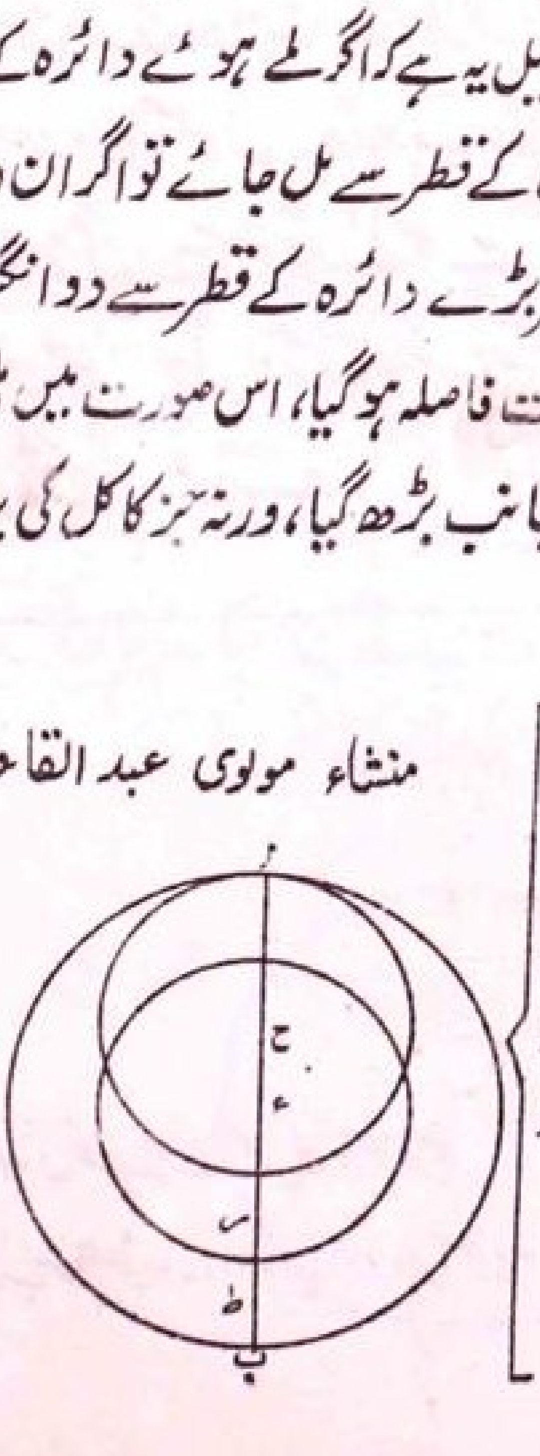
ہوتی ہے اور منطقہ کی جگہ پر کرہ کی حرکت ان سب دائروں سے تیز ہوتی ہے۔ جو منطقہ کی سیدھ میں ہوں، کیونکہ وہ جتنی مدت میں بقدر قطر مسافت طے کرے گا، دوسرے دائرے بقدر اتار نمبروار کم ہوتے جائیں گے اور یہ حرکت محور میں جہاں کرہ کی انتہا ہے ختم ہوجاتی ہے اور محور وہی قطب ہے، غالباً محور یا ایک ستون اور دائرہ کا قطب بہت چھوٹا خیال میں آگیا۔

اس خیال سے اس بزرگوار کے فن طب کے کمال میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا کیونکہ بہت سے علماء جن کا ذہن امور عامہ اور طبیعات کی مشق میں شک کا عادی ہوگیا ہو، ریاضی کے یقینی تخیل کو بھی ہلا ڈالتے ہیں، چنانچہ محقق دوانی نے شرح مواقف کے حاشیہ میں ماتن کی تائید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان دو دائروں کے محیط کا انتہائی بعد جو درمیان میں ملے ہوئے دونوں کے مرکز کے فاصلہ کے برابر ہوگا، اس پر دلائل دئے ہوں اور غصہ میں آکر مقدمات ہندیہ کو پوچ کہہ دیا، حالانکہ مشاہدہ اور دلیل میں دوگنا فرق ہوتا ہے، اس کا مشاہدہ ہر شخص کرسکتا ہے، اتنا ذرا سا فرق نہیں جو محسوس نہ ہوسکے اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر ملے ہوئے دائرہ کے ایک مرکز سے ایک اتنا بڑا دائرہ کھینچیں جو دوسرے دائرہ کے قطر سے مل جائے تو اگر ان دونوں مرکزوں میں ایک انگشت کا فاصلہ ہوگا تو دائرہ کا قطر بڑے دائرہ کے قطر سے دو انگشت چھوٹا ہوگا کیونکہ قطر کے دونوں جانب ایک ایک انگشت فاصلہ ہوگیا، اس صورت میں ملی ہوئی جانب میں ایک انگلی کا فاصلہ کم ہوگیا اور دوسری جانب بڑھ گیا، ورنہ جز کا کل کی برابر ہونا لازم آجائے گا یعنی ج ط، ج ر

منشاء محقق دوانی



منشاء مولوی عبد القادر



اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک تکونیہ تختہ بنا دیں جس کے دو اطراف برابر ہوں اور اس کے کونے پر تاگے کا ایک سر باندھ دیں اور دوسرے سرے میں کوئی وزنی چیز مثلاً پتھر یا بالو باندھ دیں۔ چونکہ وزن بالطبع مرکز عالم کی طرف جو کرۂ زمین کا مرکز ہے مائل ہوتا ہے لہذا زمین میں جدھر بھی نشیب ہوگا وزن ادھر ہی جھک جائے گا اور مخروطی کیل اس لیے بناتے ہیں کہ اس کا سرا ایک باریک نقطہ ہوتا ہے اس کا سایہ خط نصف النہار پر برابر آجاتا ہے۔ اور قطر دائرہ کے چوتھائی کے برابر اس لیے رکھتے ہیں کہ اگر اس سے زیادہ ہو تو جاڑوں میں بہت سے مقامات میں دائرہ کنارہ پر نہ قطر کا چوتھائی بھی وہیں رکھتے ہیں جہاں عرض بلد چالیس درجہ دو دقیقہ سے کم ہو ورنہ اس عرض میں جس وقت آفتاب اول جدی میں آئے گا کیل کا سایہ دائرہ سے باہر ہی رہے گا لہذا چوتھائی سے کم ہی رکھنا چاہیے اور اس کیل کا سیدھا قائم ہونا اس طرح معلوم کریں کہ ایک تاگا اس کے سر پر باندھ کر تاگے کی دوسری جانب محیط پر گھمائیں اگر تاگہ بغیر کمی بیشی کے ہر طرف محیط پر برابر رہے تو کیل سیدھی ہے کیونکہ از روئے ہندسہ قواعد سے ثابت ہے کہ ایک مثلث کے تینوں ضلعے دوسرے مثلث کے تینوں ضلعوں کے برابر ہوں تو زاویے بھی آپس میں برابر ہوں گے اور چونکہ ایک ضلع سب جگہ قطر کا نصف ہے اور دوسرا ضلع مقیاس (کیلی) اور تیسرا ضلع "" مقررہ مقدار ہے۔ لہذا تینوں ضلعے آپس میں برابر ہو گئے اور وہ زاویے قطروں کے ادھیائی اور مقیاس (کیلی) سے پیدا ہوئے ہیں وہ بھی آپس میں مساوی ہو مقیاس عمود دائرہ کی سطح پر عمود ہوتا ہے اور دائرہ ہندیہ کا عمل اس وقت صحیح ہوگا کہ اس دن نصف النہار کے وقت کسی ایک نقطۂ انقلاب صیفی یا شتوی پر آفتاب آجائے ورنہ دائرہ کا خط نصف النہار سطح فلک کے نصف النہار پر واقع نہیں ہوگا کیونکہ مدار آفتاب ہر آن میں دوسرا ہے۔ لہذا آفتاب کے دن دو نقطوں پر ہونے سے جو دائرہ نصف النہار متساوی البعد ہیں سایہ کا طول یکساں نہیں رہ سکتا بلکہ کبھی پہلا دراز ہوگا کبھی دوسرا کیونکہ اگر میل شمالی ہے تو پہلا دراز ہوگا اور میل جنوبی ہیں دوسرا۔

اس صورت میں اگر اول جدی سے آخر جوزا تک آفتاب کے حرکت کے وقت میں اگر دائرہ کا عمل کیا جائے تو ظہر کا وقت خط نصف النہار سے سایہ

مسجد فتحپوری

مسجد فتحپوری بھی قابل ذکر ہے کہ کسی دوسری مسجد میں اس کثرت سے کلام اللہ کے حافظ نہیں دیکھے گئے۔ ؎

مسجد اکبرآبادی

دوسری مسجد نواب اکبرآبادی بیگم کی ہے جہاں کشمیری کٹرہ ہے اور مولوی عبدالقادر مخدومی شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی درس اور وعظ فرماتے ہیں۔

(اس مسجد کا تذکرہ اکثر سیاحوں اور شہرِ دہلی کے زائروں نے کیا ہے اس کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا جیسا زینت المساجد کا تعمیری اسلوب ہے۔ اسے بھی بیگماتِ تیموریہ میں سے ایک بیگم نے تعمیر کرایا تھا۔ سرسید کے زمانے میں یہ شکست وریخت سے دوچار ہوتی جا رہی تھی اس کا کچھ اندازہ اس تصویر سے بھی ہوتا ہے جو سرسید نے اپنی یادگارِ زمانہ تصنیف آثار الصنادید میں پیش کی ہے۔) ع

؎ یہ مسجد بھی شاہجہاں بادشاہ کی ایک دوسری بیگم نواب فتحپوری محل بیگم نے بنوائی ہے۔ نہایت عمدہ خوبصورت سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ تمام صحن اور دونوں دالانوں کا فرش بھی سنگ سرخ کا ہے۔ اس مسجد کا طول ۵۴ گز اور عرض ۲۲ گز ہے۔ گنبد کے دونوں طرف تین تین در کے ایوان دار ایوان میں کرسی اور اجارہ میں منبت کاری ہوئی ہے۔ دونوں کونوں پر ۳۵، ۳۵ گز کے دو مینارے ہیں جو نہایت خوشنما بنے ہوئے ہیں۔ صحن کے آگے ۱۶×۱۶ گز کا حوض ہے۔ اس میں چاندنی چوک کی نہر سے پانی آتا تھا۔ مسجد کے دائیں بائیں دالان اور طالب علموں کے رہنے کی جگہ کے لیے حجرے بنے ہیں۔

قدم شریف

ماہ ربیع الاول میں قدم شریف پر بہت زیادہ ہجوم ہوتا ہے اس کی اصلیت یوں ہے کہ اس پتھر پہ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کا نقش معجزہ کے طور پر ہو گیا ہے۔ روایت کے اعتبار سے اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ نادان لوگ وہاں پر ہجوم کرتے ہیں۔ اور اس قدر تعظیم کرتے ہیں جو پیغمبر کے لیے بھی جائز نہیں اس پر سجدہ کرتے ہیں آنکھیں ملتے ہیں لے۔

سید حسن

ایک مزار سید حسن کا ہے جو محمد شاہ کے زمانے میں تھے ان بزرگوار کی وفات کے دن ہر سے ان کے مقلدین جن کو بھانڈ کہتے ہیں جمع ہو کر اپنے پیشہ کی داد دیتے ہیں اور لوگوں کو کبھی رُلاتے ہیں کبھی ہنساتے ہیں۔

خواجہ باقی باللہ

اس شہر میں خواجہ باقی باللہ کا مزار ہے۔ یہ شیخ احمد سرہندی معروف بہ مجدد الف ثانی کے پیر ہیں۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں تھے۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ ان کے مزار کے چاروں طرف جو پتھر کا فرش ہے کرامت کی بنا پر دھوپ سے گرم نہیں ہوتا۔

حضرت شاہ ترکمان

شہر میں شاہ ترکمان کا مزار بھی ہے۔ ان کا تفصیلی حال بندہ کے خیال میں نہیں ہے لہ

لہ حضرت شاہ ترکمان بڑے پایہ کے بزرگ تھے شمس العارفین بیابانی کے لقب سے مشہور تھے

مدرسہ غازی الدین خاں

یہ مدرسہ غازی الدین خاں اول کا تعمیر کردہ ہے۔ جو عہد عالمگیری کا امیر تھا والد کا نام عابد تھا اور یہ شخص شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد سے تھا سمر قند سمر قندھار سے خانہ جنگی کی بنا پر ہندوستان آگیا۔ بخت کی یاوری نے بزرگی اور پیری سے وزارت اور امارت پر پہنچا دیا۔ وہاں کا مدرس مولوی نذیر محمد حساب دانی میں مشہور تھا۔

غازی الدین خاں فیروز جنگ اول المتوفی ۱۷۱۰ء (والد نظام الملک آصف جاہ اول) نے اجمیری دروازہ کے پاس ۱۱۲۲ھ / ۱۷۱۰ء میں قائم کیا۔ یہ عمارت دہلی کی مشہور اور دلکش عمارات میں ہے۔ اس عمارت کی خوبصورتی اور طرز تعمیر قابل دید ہے۔ یہ عمارت مربع اور دو منزلہ تمام سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے جس کا وسیع احاطہ تین سو گز مربع ہے۔ اس کے تین دروازے بہت بڑے عالیشان اور نہایت خوبصورت ہیں مغرب میں ایک نہایت خوشنما اور وسیع مسجد جو سرتا پا سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے پاس ہی بانی مدرسہ نے اپنا مقبرہ بنوالیا ہے اس مقبرہ کی مرمت ۱۹۱۹ء کے بعد سترہ ہزار روپے کی لاگت سے نواب میر عثمان علی خاں نظام دکن نے کروائی۔ اس مدرسہ کا دوسرا دور ۱۷۹۲ء میں شروع ہوا۔ اور ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا۔ دہلی کالج کے مصارف کے لیے نواب اعتماد الدولہ فضل علی خاں (المتوفی ۱۲۳۵ھ / ۱۸۲۹ء) نے ۱۸۲۹ء میں ایک لاکھ ستر ہزار روپے انگریزی سرکار کے سپرد کیا۔ دہلی کالج میں مولانا رشید الدین خاں دہلوی اور مولانا مملوک العلی نانوتوی جیسے جید علما مدرس رہے اور اس کالج نے علمی درس گاہ کے اعتبار سے بڑی شہرت حاصل کی اور اس سے بڑے بڑے فاضل نکلے

مقبرہ صفدر جنگ

مقبرہ ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کا ہے جس کی اولاد اودھ میں حکمراں رہے۔[1]

جنتر منتر

یہ رصدگاہ سوائی راجہ جے سنگھ والی جے پور نے محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے ۱۱۳۷ھ / ۱۷۲۴ء میں بنوائی تھی۔ بڑے بڑے ہندو اور مسلمان ریاضی داں اس میں شریک تھے خوبی ان آلات کی دیکھنے سے علاقہ رکھتی تھی۔ اکثر آلات رصد ٹوٹ گئے ۱۸۶۴ء تک چار آلات رصد باقی تھے۔ سر سید احمد خاں بہادر نے لکھا ہے:

"افسوس ہے کہ یہ آلات عالی جن کا ہونا مغتنمات سے تھا نہایت بے مرمت پڑے ہیں۔ اور بہت جگہ سے شکستہ ہوگئے ہیں رصد خانے کے بدلے یہ جگہ براز خانہ ہوگیا ہے۔ ہر ہر زاویہ اور ہر ہر تدویر اور درجہ اور دقیقہ میں نو نو من گوہ کا ڈھیر ہوگیا ہے ایسی عفونت یہاں تھی کہ نقشہ کھینچنے کو ٹھہرنا مشکل پڑا تھا۔"

[1] ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۳ء کو پاپڑ گھاٹ ضلع سلطان پور میں انتقال ہوا۔ اول (گلاب باڑی) فیض آباد میں دفن کیا گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد صفدر جنگ کی لاش نکال کر دہلی لے گئے اور شاہ مرداں کے متصل دفن کیا گیا صفدر جنگ احمد شاہ بادشاہ دہلی کا وزیر تھا۔ یہ مقبرہ سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے اور جابجا سنگ مرمر کی دھاریں اور رچے لگے ہوئے ہیں۔ اس کا تمام برج سنگ مرمر کا ہے اور قبر کا تعویذ بھی سنگ مرمر کا ہے۔ ایک تہ خانہ میں اصل قبر بنی ہوئی ہے۔ یہ مقبرہ شیدی بلال محمد خاں کے اہتمام سے تین لاکھ روپے میں تیار ہوا ہے مقبرہ کے اندر یہ تاریخ کندہ ہے:

چو آں صفدر عرصۂ مردمی   ز دار فنا گشت رحلت گزیں
چنیں سال تاریخ او شد رقم   کہ بادا مقیم بہشت بریں

دہلی کی سیاست میں صفدر جنگ کا خاص ہاتھ رہا ہے

صوفی سرمدؒ

جامع مسجد کے سامنے سرمد کی قبر ہے کہتے ہیں کہ یہ ارمنی تھا اس کا کی بیشتر رباعیات پر مشتمل ہے جو کیفیت سے خالی نہیں اور ان رباعیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک آزاد منش سنجیدہ شخص تھا شہزادہ دارا شکوہ جو فقیر دوست اور مذہب سے خوب واقف تھا اس کو خاص ربط حاصل تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں علماء کے فتوے پر مارا گیا۔ تلوار سر پر تھی اور یہ مطلع جو اس کی پختہ کاری کا شاہد ہے اس کی زبان پر تھا ؎

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

(ہستی میں عدم کی جو مچا شور کھلی آنکھ، دیکھا کہ شب فتنہ ہے باقی تو لگی آنکھ)

دارا شکوہ کو سرمد سے عقیدت ہو گئی۔ جذب کی حالت میں اکثر سرمد ننگے رہتا تھا۔ علمائے شریعت نے سرمد کے قتل کا فتویٰ دیا۔ ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء میں مقتول ہوا۔ قبر پر یہ تاریخ کندہ ہے:

شاہ سرمد بعہد عالمگیر،
چوں سفر ساختہ شہید سرمد ایں
گفت تاریخ اکبر مسکیں
لحد مرقد شہید سرمد ایں

۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء

شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی

خانم کے بازار میں شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی مرشد مولینا نظام الدین اورنگ آبادی کا مزار ہے۔ حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی نے جلالین کے طرز پر قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے۔ عشرہ کاملہ میں دس مسئلوں کی تحقیق کی ہے۔ رقعات اور کشکول بھی فنِ سلوک میں ان کی یادگار ہیں ان کتابوں سے ان کا تبحر علمی ظاہر ہے [۱]

---

[۱] حضرت شاہ کلیم اللہ کے والد کا نام شیخ نور اللہ تھا خلیفہ اول سیدنا صدیق اکبر کی اولاد میں تھے۔ شیخ نور اللہ کے والد شیخ احمد معمار تھے جو عہد شاہجہانی کے مشہور ماہرین فن میں تھے۔ شاہان مغلیہ کی طرف سے نادر العصر کا خطاب تھا۔ اقلیدس، ہیئت، نجوم اور ریاضی وغیرہ پر کامل عبور رکھتے تھے۔ تاج محل اور لال قلعہ ان ہی نے تعمیر کیا تھا احمد معمار کے تین بیٹے عطاء اللہ، لطف اللہ مہندس اور شیخ نور اللہ (والد شاہ کلیم اللہ) لطف اللہ علم ہندسہ کے ماہر تھے۔ مہندس شاہی خطاب تھا۔ شاعر بھی تھے مہندس کا دیوان طبع ہو چکا ہے۔ شیخ نور اللہ بھی اپنے فن میں بڑے کامل تھے۔ دہلی کی جامع مسجد کی پیشانی پر جو کتبے ہیں وہ نور اللہ کی ہی باکمال انگلیوں کا کرشمہ ہیں

حضرت کی ولادت ۲۴ جمادی الثانی ۱۰۶۰ھ ر ۱۶۵۰ء کو ہوئی تھی۔ شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی ان کے اساتذہ میں شیخ برہان الدین المعروف بہ شیخ بہلول اور شیخ ابوالرضا الہندی (حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی کے تایا) کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ تکمیل علوم کے بعد شیخ کلیم اللہ مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے اور حضرت شیخ یحیٰی مدنی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ شاہ کلیم اللہ دہلوی نے دہلی واپس آکر بازار خانم میں اپنا مسکن بنایا اور سلسلہ درس و تدریس شروع کر دیا۔ شاہ صاحب کے مدرسہ میں دور دور سے طلبہ آتے

حضرت شیخ کلیم اللہ نے تصانیف کا ایک بے بہا ذخیرہ چھوڑا بقول مناقب فریدی شاہ صاحب کی تصانیف کی تعداد ۳۲ ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مزار ہے[۱] جو محمد شاہی وقت سے شاہ عالم کے زمانہ تک طلبہ اور مریدین کو فائدہ پہونچاتے رہے فن حدیث حاجی محمد افضل کی خدمت میں دہلی میں حاصل کی۔ اس کے بعد حرمین شریفین میں جا کر سند حدیث حاصل کی بہت سے رسائل اور کتابیں ان کی تصنیف

سے ہیں ہر ایک میں نئے فوائد بیان کرتے ہیں عقائد اور عقلیات میں دلائل کے پیرو ہیں اور اعمال و نقلیات میں حدیث اور اخبار متواتر اور قرآن کے تابع ہیں۔ بات مجتہدانہ کہتے ہیں۔ محض تقلید کی طرف نہیں دوڑتے ان کے بیٹے بھی ابھی تک وہی طریقہ رکھتے ہیں۔

مولانا شاہ فخر الدین

دوسرا مدرسہ نواب غازی الدین خاں کی والدہ کا ہے جس کو لوگ مولانا فخر الدین کا مدرسہ کہتے ہیں[۲]۔ یہ بزرگوار (مولانا فخر الدین شاہ) مولانا نظام الدین کے فرزند ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں مشیخت کا سلسلہ جاری کر دیا اور بیعت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت شاہ فخر نے پاک پٹن کا سفر کیا واپسی میں دہلی میں مستقل قیام کیا۔ اور اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔

ان کے مشرب سے ناواقف معتقدوں کو اگرچہ گنبد بنانے کا موقع نہ ملا مگر اس پر شامیانہ کھڑا کر لیتے ہیں اور مدرسہ میں جس جگہ ان کو غسل دیا تھا زیارت گاہ اور ان کے سونے کی جگہ بلنگیری حجرہ میں تبرک رکھ چھوڑی ہے ان کے لڑکے مخاطب بہ مولوی قطب الدین حضور والا (اکبر ثانی) ان کے مرید تھے ان کے پوتے معروف بہ حضرت کالے صاحب

[۱] قطب الدین احمد شاہ ابن شاہ عبد الرحیم فاروقی ۴ شوال ۱۱۱۴ھ/ ۱۷۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ عبد الرحیم اپنے عہد کے نامی گرامی فاضل تھے۔ فتاوائے عالم گیری کے مرتبین میں سے تھے۔ بیٹا باپ سے زیادہ نامور اور فاضل ہوا مروجہ تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ۱۴ سال میں شادی ہو گئی

شیخ عبدالحق

شیخ عبدالحق جہانگیری کا مزار ہے وہ محدث اور خدا پرست تھے جو لوگ ان کی تصانیف سے کچھ بھی لطف اندوز ہوئے۔ علم حدیث اور سیرت کے دعویٰ دار بن گئے[1]

شاہ ابوسعید

مخدوم شاہ ابوسعید نے مخدومنا مولوی شرف الدین رامپوری کی خدمت الہیہ میں حاصل کیے۔ مخدوم سراج احمد سے حدیث شریف کی سند لی۔ جناب شاہ درگاہی سے خرقہ خلافت حاصل کر کے دوسروں کو پہنچایا اس کے بعد شیخ الشیوخ (شاہ غلام علی) کی خدمت سے مستفیض ہو کر ان کی خانقاہ کو آباد کر رکھا ہے۔ یہ بزرگوار حافظ کبیر کے پھوپھی زاد بھائی ہیں اور اس فقیر کے پرانے کرم فرما ہیں، دیکھنا چاہیے کہ اس چند روزہ زندگی میں ان کا دیدار نصیب ہوتا ہے یا نہیں[2]

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ولادت ۹۵۸ھ ۱۵۵۱ء میں دہلی میں ہوئی۔ والد کا نام شیخ سیف الدین تھا جو اپنے وقت کے مشہور مشائخ میں تھے۔ امان اللہ پانی پتی کے مرید و مجاز تھے۔

[2] حضرت شاہ ابوسعید بن شاہ صفی اللہ القدر فاروقی ۲ ذلقیعدہ ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۱ء میں رام پور (روہیلکھنڈ) میں پیدا ہوئے علوم عقلی ونقلی مفتی شرف الدین نے اور مولانا رفیع الدین دہلوی سے پڑھے۔
عید الفطر شنبہ کے دن ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء کو انتقال فرمایا نعش تابوت میں رکھ کر دہلی لائی گئی حضرت شاہ غلام علی کے پہلو میں خانقاہ میں دفن کیا گیا قطعہ تاریخ وفات ہے:

امام و مرشدنا شاہ ابوسعید سعید ۔۔۔ بعید فطر جو شد واصل جناب خدا
دلے شکستہ و مغموم گفت نار بخش ۔۔۔ ستون محکم دین نبی فتادہ زپا

خواجہ میر درؔد

خواجہ میر درؔد کا مزار قابل ذکر ہے جن کی رباعیاں اور ریختہ (اُردو) کی غزلیں سب دردآمیز ہیں۔ رسالہ آہ سرد، نالۂ درؔد اور واردات ان کی تصنیفات سے ہیں۔ فن تصوّف اور اس کے اہم مسائل کی موشگافی ان کے تبحر علمی کی شاہد ہے۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں

حضرت مرزا جانِ جاناں کا مزار ہے جو سلسلہ نقشبندیہ کے متاخر مشائخ کبار میں سے تھے سایہ عاطفت پدری میں علوم درسیہ حاصل کر کے علم اخلاق اور تزکیہ نفس کا فیض والد حاصل کیا تھا۔ کچھ عرصہ تک سپہ گری کے پیشہ پر بسر کی،

شاہ غلام علی

سند ارشاد مظہری کے جانشین تھے، بندہ نے صغر سنی میں رام پور میں ان کی زیارت کی تھی۔ اس کے بعد شاہجہاں آباد میں ان کی خانقاہ میں دیکھا جو چتلی قبر کے متصل ہے ان کا مشغلہ درس حدیث و تفسیر، نوجوانوں کی اصلاح مراقبہ اور اصلاحات تصوف کے مطالب سمجھانا تھا۔

مخدوم شاہ صابر بخش

شہر کے اکابر مشائخ سے مخدوم صابر بخش نبیرہ مخدوم غلام سادات تھے۔ ان کے بزرگ سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں نام آور اور مشہور تھے۔ ان کی ہمّت وجود کی نشانیاں، کارواں سرائے، مسجد، امام باڑہ، اور دھرم شالہ ہیں۔ جو امیر و غریب سُنّی و شیعہ اور مسلمان اور ہندو کے آرام کے لیے تعمیر ہوئی ہیں۔ بندہ ان کی زیارت نہیں کر سکا

قلعہ معلّیٰ کی جھلکیاں

اس شہر دہلی میں شاہجہاں بادشاہ کا بنوایا ہوا قلعہ ہے جس کا دروازہ ہی بتا رہا ہے کہ یہ بادشاہوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ اس کے اندر دیوان عام ہے دیوانِ خاص ہے، شاہ برج ہے، ساون بھادوں ہے۔ ہر ایک میں دلبران پری وش کی سی دل کشی ہے۔ رعب جمشیدی ہے محاورات وہاں کے جداگانہ ہیں رویہ بھی علیحدہ ہے۔ شاہ نے سلف کی درباری رسمیں اب بھی جاری ہیں۔ بادشاہ کسی کے سر پہ ہاتھ نہیں رکھتا۔ اور حسب مراتب علما، وزہاد کے علاوہ کوئی بیٹھ نہیں سکتا مگر خدام کو خدمت کی غرض سے اجازت ہے۔

اصطلاحات قلعہ معلّیٰ

شاہی حجام کو خاص تراش، خدمت گار کو خواص، ناظم آداب دربار کو نواب ناظر، مہتمم حریب کو مروہہ، چابک سوار کو ملک پٹرا، فیلبان کو فوجدار، تالیاں کو ھبنڈا، نیند کو سکھ، غلاموں کو نمار کھانے کو خاصہ، وہ خوان جو کسی کو عطا ہوا دلش، مستعمل کپڑے کو ملبوس خاص، فرزندان شاہ کو صاحب عالم، جانشین شاہ کو ولی عہد، خاتون کو ذاب صاحب محل، اور دوسری بیگمات کے لیے لفظ نواب مخصوص ہے، بادشاہ کی ماں نواب قدسیہ اور بادشاہ کے بھائی شہزادہ کہلاتے ہیں، تیمور کی اولاد نیز دوسرے رشتہ دار سلاطین کہلاتے ہیں۔ رنڈیوں کو ارباب نشاط، نقال کو دعا گو بادشاہ کو زندہ کرامات کہتے ہیں، قلعہ و تخت کے ساتھ سب لوگ لفظ "مبارک" ملاتے ہیں اور لفظ بادشاہ کے بجائے غیبت و حضور میں لفظ "جہاں پناہ" اور "حضور والا" بولتے ہیں بادشاہ کی بات کو ارشاد بولتے ہیں۔ جب کوئی خاص خوان یا تحفہ بادشاہ کے حضور سے

تو لوگ کھڑے ہو کر اور سر پر ہاتھ رکھ کر شاہی آداب بجا لاتے ہیں اور اس کو انعام دیتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ آداب و کورنش پہنچا دینا۔ اسی طرح اگر دریافت حال کے لیے آئے تو بھی اسی انداز سے شاہی آداب بجا لاتے ہیں۔ اگر فرمان یا عرضی خاص بادشاہ کے دستخط سے مزین جو پنسل سے ہوتے تھے لاوے تو لانے والے کے ہاتھ سے کھڑے ہو کر لیتے ہیں۔ پھر سر اور آنکھوں سے لگا کر کھولتے ہیں۔ اور اگر کوئی عرضی بادشاہ کے حضور میں بھیجیں تو سادہ کاغذ پر لکھتے ہیں اور لفافہ پر سوائے لفظ "عرضی" کے کچھ نہیں ہوتا۔ اور بادشاہ عرضی کی پیشانی پر صرف دستخط کر دیتا ہے۔ دوسرے لوگ عرضیوں کی پشت پر حکم لکھ دیتے ہیں اور قلعہ مبارک میں بادشاہی دفتر میں عدالتی مہر کے لیے کاغذ نہیں بھیجتے بلکہ بندگانِ شاہی اپنی دستی مہریں لگا دیتے ہیں جو پروانہ اور روبکار نہیں ہوتا بلکہ خط ہوتا ہے۔

حضورِ شاہی میں شرفِ ملازمت کے آداب

جب کبھی بادشاہ کی ملاقات کے لیے جاتے ہیں تو اس مقام سے جہاں ایک سُرخ رنگ سا پردہ ہے اور جس کو لال پردہ کہتے ہیں۔ پا پیادہ ہو جاتے ہیں حتّٰی کہ چھتری بھی نہیں لے جا سکتے۔ مقامِ تسلیم میں پہنچ کر جھکتے ہیں اور سر پہ ہاتھ رکھتے ہیں۔ چوبدار اس مجرائی کا نام اسی امتیاز سے لیتا ہے جس کی بادشاہ کے حضور سے اجازت ہو سکتی ہے اور کہتا ہے "جہاں پناہ! جہاں بلی سلامت! اس کے بعد آگے بڑھ کر جیسا مرتبہ ہو روپیہ یا اشرفی آستین یا رومال پر رکھ کر نذر پیش کرتے ہیں پھر اس کے علاوہ کچھ سونا چاندی بادشاہ کے سر پر بطور نچھاور گھما کر نثاری داروغہ کو دے دیتے ہیں۔ قبولیتِ نذر کے بعد پیچھے ہٹ کر آداب بجا لاتے ہیں۔ پھر حسب اشارہ علیحدہ جگہ پر چلے جاتے ہیں وہاں خلعت پہنتے ہیں جس کے بہت سے مراتب یعنی تین، پانچ، سات، گیارہ اور اکیس کپڑے ہیں۔ خلعت پہن کر بادشاہ کے حضور میں آتے ہیں۔ اس وقت خلعت کی نذر پیش کر کے آداب بجا لاتے ہیں اور کچھ دیر کھڑے ہو کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ پھر ولی عہد کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ وہاں بھی مثل دستور حضور بادشاہ عمل میں لاتے ہیں وہاں سے اسی لباس میں اپنے گھر تک آتے ہیں۔ شاہی خدام کو حسب معمول خلعت، انعام دیتے ہیں اور دستور

نذر کی اشرفی یا روپیہ پر شاہ متوفی کا سکہ نہ ہونا چاہیے بلکہ اسی بادشاہ کا سکہ ہوتا ہے۔ اور گفتگو میں بادشاہ کی ملاقات کو "ملازمت" کہتے ہیں اور بادشاہ کے سامنے کسی کے نام کے ساتھ لفظ "صاحب" نہیں بولتے بلکہ بہادر، خان یا جو خطاب حضور سے ملا ہو اُس کے زبان پر لانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور لفظ "مسٹر" اگرچہ صاحب کے معنی میں ہے، مگر بادشاہ اس سے واقف نہیں۔ اس لیے اپنے قلم سے کبھی انگریز صاحب نہیں لکھتا ہے اور نہ دوسروں کو اس کا کہنا جائز ہے۔ چند آدمیوں کے نام ہرگز وہاں نہیں لیے جاتے۔ غازی الدین خاں عماد الملک جس کی قبر کالپی میں ہے اور اس نے شاہ عالم ثانی کے باپ کو قتل کیا تھا۔ اس کو نمک حرام اوّل کہتے ہیں[۱]

۱؎ دوسرے غلام قادر خاں خلف نواب ضابطہ خاں خلف نواب نجیب الدولہ اس کو نمک حرام دوم کہتے ہیں۔

بادشاہ کی سواری۔ کے وقت پیادہ اور اسپ سوار اسی حالت میں آداب بجالاتا ہے البتہ گاڑی اور پالکی سوار نیچے اُتر کر آداب پیش کرتا ہے۔ ہاتھی سوار یا نیچے اُترے یا ہاتھی بٹھلائے اور خود کھڑا ہو جائے۔ بادشاہ اگر تخت ہوادار پر سوار ہو تو ہندوستانی امراء ہوں یا صاحبان انگریز سب پا پیادہ چلتے ہیں۔ اور ہاتھی کی سواری کے وقت خود کو پیچھے رکھتے ہیں۔ لیکن سر پر چھتری نہیں رکھتے ان آداب میں شاہزادے بھی دوسروں کے برابر ہیں۔

(۱) تاریخ ہندوستان از ذکا اللہ جلد نہم صفحہ ۲۹۳۔ ۲۹۴، ۳۰۱۔ ۳۰۳ (۲) مجمع الاخبار از ہرسکھ ولد جیون داس کھتری صفحہ ۵۸۴ (قلمی مخزونہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی لائبریری (۳)

روایات ولوازمات شاہانہ

خواصی میں خادم بادشاہ پر چھتری لگائے ہوئے بیٹھا ہوتا ہے۔ اگر وہ پانی طلب کرے تو نبدار (یعنی فیلبان) اپنے ہاتھ سے پیش کرتا ہے۔ خاصہ کے پانی کو آبِ حیات کہتے ہیں۔ قلعہ کے محاورات میں سے یہ بھی ہے کہ جب بادشاہ قضائے حاجت انسانی کے لیے جائے تو کہتے ہیں کہ صحت خانہ میں تشریف فرما ہیں اور جس جگہ علماء وزراء سے ملاقات ہوتی ہے اس کو تسبیح خانہ کہتے ہیں اور جب یہ کہنا ہو کہ فلاں بادشاہ کو قید کر دیا تو یوں کہیں گے کہ داخل سلاطین کر دیا گیا اور بادشاہوں کے جیل خانہ کو عبادت خانہ کہتے ہیں تمام اولادِ تیموری کی علامت یہ ہے کہ جب قلعہ سے باہر جائیں گے تو ایک خواص کے ہاتھ میں مکھی اڑانے کے لیے طاؤسی پنکھا ہوتا ہے اور قلعہ مبارک سے شاہی سواری پر برآمد ہوتے وقت اکیس توپیں چلتی ہیں اور جب شہر کے دروازہ سے باہر گزریں گے تو اتنی ہی انگریزی توپیں چلیں گی اور قلعہ کا صدر دروازہ بادشاہ کی واپسی تک بند ہو جاتا ہے۔ اس کے بجائے دوسرا کھل جاتا ہے اور ولی عہد قلعہ مبارک میں رہتے ہیں۔ عیدین اور جشن سالگرہ پر پہلے ولی عہد نذر پیش کرتا ہے اس کے بعد شہزادے پھر ریذیڈنٹ، اور جو کچھ وہاں عنایت ہو دامن یا رومال میں لیتے ہیں اور آداب بجا لاتے ہیں اور جو کچھ بادشاہ کے صرف خاص کے لیے شہر کے باہر سے آتا ہے اس پر محصول نہیں لیا جاتا۔ اور پرگنہ کوٹ قاسم جو بادشاہ سے متعلق ہے اس میں سرکار انگریزی کے احکام جاری نہیں ہوتے۔

صفر کے آخری چہار شنبہ کو بادشاہ کی جانب سے طلائی انگوٹھی اور چھلے تقسیم ہوتے ہیں اور بقرعید پر عید گاہ میں اونٹ، بھیڑ، بکریوں کی قربانی ہوتی ہے۔ ایک ایک جانور خود اپنے ہاتھ سے بادشاہ ذبح کرتا ہے باقی دوسرے لوگ ذبح کرتے ہیں اور وہیں کباب بھونے جاتے ہیں اور ہر ایک شخص کو دیتے ہیں چاہے مسلمان ہو یا نہ ہو۔

سلونوں پر جو ہندوؤں کا ایک خاص دن ہے ایک ہندو بادشاہ کے ہاتھ پر راکھی باندھتا ہے اور بادشاہ دوسرے ہندوؤں کے ہاتھ پر باندھتا ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح

اکبر شاہ ثانی

اب میں بادشاہ اور سلاطین قلعہ دہلی کا ذکر کرتا ہوں۔ جہاں پناہ معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی، غصہ کے بھوت پر جیسا قبضہ رکھتے ہیں۔ شاہ و گدا میں بہت کم مل سکے گا۔ گناہ کی پردہ پوشی

میں یکتا ہیں، کہتے ہیں کہ ایک روز مشائخ کی محفل میں کسی نے مصافحہ کرتے ہوئے انگشت مبارک سے انگوٹھی نکال لی اور انہوں نے اب تک کسی پر اس مردود کا پردہ فاش نہ کیا بلکہ جان بوجھ کر چھپایا، کتابوں میں نوشیروان کا ایک قصہ ہے کہ ایک شخص نے سونے کا ایک گلاس چرا لیا اور بادشاہ نے اسے دیکھ کر کچھ نہ کہا، لوگ تلاش کر رہے تھے۔ بادشاہ نے فرمایا:۔
"جس نے دیکھا ہے وہ بتائے گا نہیں اور جو لے گیا ہے وہ واپس نہیں لائے گا۔"[1]

---

[1] اکبر شاہ ثانی، شاہ عالم کے بیٹے ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے، علوم رسمی سے واقف تھے، صوفیائے کرام سے خاص تعلق تھا، ۱۲۲۲ھ ۱۸۰۶ء میں تخت نشین ہوئے، رزیڈنٹ اور دیگر حکام کمپنی نے مراسم دربار ادا کئے۔ تیموری عزت کا ہمیشہ خیال رکھا، جب لارڈ ماٹرا نے دہلی کا رخ کیا تو نشست کے سلسلے میں سابقہ طریقہ میں تبدیلی گوارا نہ کی، کمپنی سے تعلقات کچھ اچھے نہیں رہے، راجہ رام موہن رائے کو سفیر و وکیل بنا کر لندن بھیجا، راجہ رام موہن رائے نے ذاتی مفاد پر آقا کے مفاد کو قربان کر دیا، لہٰذا سفارت سے کوئی فائدہ نہ ہو۔ ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوا۔

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی میں بڑے بڑے علماء، فضلاء، شعراء، حکماء اور ادباء موجود تھے۔ سر سید احمد خاں بہادر نے کیا خوب قطعہ تاریخ کہا ہے۔

چون برفت از جہان شہ اکبر	شد بہ آسمان بر زدود جگر
پائے شادی شکست و احمد گفت	سال تاریخ او "غم اکبر"

(1) THE PRECEEDIN S OF THE PAKISTAN HISTORY CONFERENCE (THIRD SESSION HELD AT DACCA, 1953) P. 269-280 (KARACHI, 1955)

(۲) سیرت فریدیہ از سر سید احمد خاں بہادر ص ۲۲-۳۱ (مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۶ء

(۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ سوم ص ۲۷۸

مرزا جہانگیر

اس کے عمر کے گھوڑے نے حالاکی سے اس کو عالم جاودانی میں پہنچا دیا، اپنے زمانہ کا اچھا شہسوار تھا۔[۱]

مرزا بابر:۔ اس کا حقیقی بھائی الطاف سلطانی کا مرکز تھے۔[۲] بڑے بڑے صاحب مرتبہ لوگ بھی اس کا توسل رکھتے ہیں[۳]

---

۱ مرزا جہانگیر، اکبر شاہ ثانی کے فرزند اکبر تھے، ولی عہدی کے قضیہ میں ۱۲۲۴ھ ۱۸۰۹ء میں انہوں نے سٹین رزیڈنٹ دہلی کے طپنچہ مار دیا، اس سبب سے انگریزوں نے ان کو دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ ۳/صفر ۱۲۲۷ھ ۱۸۱۲ء کو بڑے سازوسامان کے ساتھ لکھنؤ کے ارادہ سے دہلی سے روانہ ہوئے۔ اور بعد قطع منازل رونق افروز لکھنؤ ہوئے۔ نواب سعادت علی خاں نے کوئی دقیقہ ان کی عظمت و پاسداری میں فروگزاشت نہیں کیا۔ مگر رزیڈنٹ اور کونسل کلکتہ کو مرزا جہانگیر کا قیام لکھنؤ پسند نہ تھا، لہٰذا کانپور اور پھر الہ آباد چلے گئے۔

مرزا جہانگیر کو حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ "مکاتیب شریفہ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ" میں شاہ صاحب کا ایک خط مرزا جہانگیر کے نام ہے جس میں حضرت نے مرزا جہانگیر نے ایک خواب کی تعبیر ارشاد فرمائی ہے، الہ آباد میں ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء میں انتقال ہوا۔ قطعہ تاریخ وفات

این گردش چرخ این ستم ایجاد چرا شد — کان فخر زمانی

افسوس کہ عازم سوئے فردوس سرا شد — در عین جوانی

تاریخ دے از کلک قضا منشی تقدیر — بر لوحۂ محفوظ

بنوشت جہانگیر جہان دار بقا شد — از منزل فانی

۹۹۰ — ۲۷۶

۱۲۳۶ ۱۸۲۱ء

شہزادہ کی والدہ نواب ممتاز محل نے خواجہ وحید الدین احمد خاں کو الہ آباد بھیجا، اور ان کی نعش منگوا کر دہلی مجر محمد شاہ بادشاہ کے قریب دفن کی گئی۔ ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء میں مجر تیار ہوا۔

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی ص ۹۷، ۹۸ (۲) تاریخ اردو حصہ چہارم ۶۶

(۳) مکاتیب شریفہ ص ۱۹ ۵ سراج الدین بہادر شاہ ظفر مراد ہیں

(۴) سیرت فریدیہ ص ۲۲-۲۳-۳۹

اس کے بعد وہ بہادر چور عُمدہ لباس پہن کر بادشاہ کے سامنے آیا، بادشاہ نے اس سے کہا: "یہ اسی کی رونق ہے"۔

انصاف تو یہ ہے کہ جس جگہ نوشیروان کا قصہ لکھیں وہیں اکبر شاہ ثانی کے واقعہ کو بھی سنہرے حروف سے لکھیں اور دونوں کے فرق پر غور کریں، یعنی نوشیران نے اس شخص کو اس بات سے شرمندہ کر دیا اور دوسروں پر جب انہوں نے بادشاہ کا ارشاد سُنا پردہ فاش ہوگیا اور بے انتہا مال و دولت کے باوجود آخر نوشیروان نے چور کو متنبہ کر ہی دیا اور صبر نہ کر سکا اور یہ عالی ہمت (اکبر شاہ ثانی) اب بھی کہ اس کے قبضہ میں سوائے دولت قناعت اور ملک مروت کے کچھ بھی نہیں ہے، اس جڑاؤ انگوٹھی کو اپنی سخاوت کی گنجی کے خوشنما چھلے سے بھی کم سمجھتا ہے۔ ان دونوں واقعات میں بندہ خدا (اکبر شاہ ثانی) اور آتش پرست (نوشیروان) کا فرق دیکھ لیں۔

سلاطینِ قلعۂ دہلی۔ مرزا ابوجعفر:-

نیکوکار، بے آزار، روزہ، نماز کا پابند عربی خط (نسخ) میں خوش نویس اور اُردو زبان کا مشہور شاعر ہے[۱]

مرزا سلیم:-

اس کا مبارک نقشہ کیخسرو جیسا ہے، اور اس کا کام قبلہ عالم (اکبر شاہ ثانی) کی متعین حاضر باشی ہے، اکثر حضور والا ہاتھی کی سواری میں اس کو خواصی کا اعزاز بخشتے تھے[۲]

---

[۱] مزید حال معلوم نہ ہوسکا۔

[۲] مرزا سلیم پر اکبر شاہ ثانی بہت اعتماد فرماتے تھے، ۱۸۲۷ء میں جب لارڈ ایمہرسٹ نے اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی سے ملاقات کی تو مرزا سلیم کو گورنر جنرل کے پاس متھرا بھیجا تھا، جب گورنر جنرل بادشاہ کی ملاقات کے لیے دہلی آیا تو بادشاہ کی طرف سے گورنر جنرل کے استقبال کے انتظامی امور کے نگران اعلیٰ مرزا سلیم تھے۔

RECORDS OF THE DELHI RESIDENCY AND AGENCY.

(CHAPTER X) P. 337-338. (LAHORE, 1911)

مرزا غلام حیدر

برادران حضور (اکبر شاہ ثانی) کے خاص مشیروں میں ہے۔ مرزا مکھو اور مرزا ملہو، اس کے دونوں بیٹے بادشاہ کے ہم نشینوں میں ہیں۔

امرائے دہلی :۔ اب میں شہر دہلی کے امراء اور رؤسا کا ذکر کرتا ہوں۔

بخشی محمود خاں :۔ نواب نجف خاں کے رشتہ داروں میں ہے، خوش بیان اور شاہی سواروں کا افسر ہے، امامیہ مذہب رکھتا ہے (۱)

اشرف بیگ :۔ نجیب کی پلٹن اس کے سپرد ہے، فوج کا کام اچھا جانتا ہے۔

محمد میر خاں :۔ شاہ نظام الدین کا بیٹا، حضرت شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں ایک مدت تک قلعہ مبارک کے تمام کاموں کا مختار اور شہر کا حاکم رہا ہے، وہ سلسلۂ قادریہ اور نقشبندیہ مجددیہ کا پیر زادہ ہے، شیخ عبدالقادر جیلانی پدری سلسلہ کے دادا اور خواجہ باقی باللہ مادری سلسلہ کے نانا ہیں علوم درسیہ کی تحصیل تو کرلی ہے، لیکن احتیاطاً اپنے پر اعتماد نہ کرتے ہوئے ہمیشہ دوسروں سے پوچھ کر کام کرتا ہے۔ اکثر دینی مسائل میں مولوی رشید الدین خاں کے قول پر اور معاشیات میں منشی فیض الحسن کے مشورہ پر اعتماد کرتا ہے۔

حافظ الٰہی بخش مردھہ :۔ بادشاہ کے عقیدت مندوں میں سے ہے، نیک طینت ہے، حضرت ظل سبحانی (اکبر شاہ ثانی) کی ذات کے علاوہ کسی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔

جبار بیگ خاں :۔ سمجھ دار، معقول اور جہاندیدہ شخص ہے، پرانی وضع رکھتا ہے۔

در محفل خود راہ مدہ ہمچو منے را — افسردہ دل افسردہ کند انجمے را

سر سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں کہ بخشی محمود خاں ایرانی نژاد تھے، ہندوستانی لفظوں کا جس میں ٹ اور ڈ ہوتی ہے تلفظ نہیں ہو سکتا تھا، اس سلسلہ میں نواب فرید الدین خاں بہادر دبیر الدولہ کے خاندان کے بچوں سے خوب دلچسپ بحث رہتی تھی، بخشی محمود خاں نہایت خوش مزاج اور ظریف آدمی تھے، بادشاہ کے دربار میں نہایت خوش بیانی سے جھوٹے سچے قصے بیان کرتے تھے۔ (۱) مجموعہ حالات عزیزی حصہ اول ص ۵

(۲) تذکرہ عزیزیہ از قاضی بشیر الدین ص ۱۹ - ۲۰ (۳) سیرت فریدیہ ص ۳۵ (۴) اخبار رنگین ورق ، ب

نواب ناظر:۔ اس کی خوش خلقی اس کے لازمی مرتبہ پر غالب ہے۔

خواجہ وحیدالدین خاں:۔ خواجہ وحیدالدین خاں پسر خواجہ فریدالدین خاں دبیرالدولہ، ایک مدت تک جنرل اختر لونی بہادر کا مصاحب خاص رہا، ملکہ عالم جناب عصمت مآب نواب رحیم النساء بیگم کی مہربانی پر بسر کرتا تھا۔ لے

نبی بخش خاں مردہہ:۔ حضور والا (اکبر شاہ ثانی) کے فدائیوں میں سے ہے اور جہاں پناہ اور ملکۂ زماں کی عنایت کا مرجع ہے۔ ٢ے

لے دبیرالدولہ خواجہ فریدالدین خاں کے فرزند اکبر اور سر سید احمد خاں بہادر کے ماموں تھے، ان پر نواب ممتاز محل بیگم اکبر شاہ ثانی کی خاص نظر عنایت تھی، خواجہ وحیدالدین مرزا جہانگیر کی لاش الہ آباد سے لائے تھے، نواب ممتاز محل خواجہ وحیدالدین کو مثل فرزند کے سمجھتی تھیں اور انہوں نے اپنے فرزند اصغر تیمور شاہ کا ان کو مختار کل مقرر کیا، مختار الدولہ کا خطاب ملا یہ واقعہ ۱۲۳۸ھ ۱۸۲۲ء کا ہے، خواجہ وحیدالدین، نواب محل کے انتقال سے برس ڈیڑھ برس پہلے کسی بات سے ناراض ہو کر لکھنؤ چلے گئے جبکہ نواب علی نقی خاں نائب تھے، چند سال وہاں بھی نہایت اعزاز سے رہے، پھر وہاں سے آئے تو دلی میں رہنے لگے، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی سرکار میں بعض معاملات خصوصاً مالی پالیسی کے سلسلہ میں ان کی بھی طلبی ہوئی، فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج کے کچھ سپاہی خواجہ وحیدالدین خاں کے مکان میں گھس آئے اور عین حالت نماز میں ان کے گولی مار دی۔

(۱) سیرت فریدیہ ص ۳۹ - ۴۰

(۲) حیات جاوید حصہ اول از خواجہ الطاف حسین ص ۲۲ (مطبع مفید عام آگرہ ۱۹۰۳ء)

٢ے نبی بخش خاں دہلی کے نامور لوگوں میں سے تھے، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں زندہ تھے، دہلی میں جب جنگ کا آغاز ہوا اور انگریزوں کو گرفتار کر کے قلعہ میں لایا گیا تو نبی بخش خاں نے بہادر شاہ ظفر کو ایک عرضی اس مضمون کی لکھی تھی کہ مذہب اسلام میں عورتوں اور بچوں کا قتل ممنوع ہے اور بھی کسی مذہب میں یہ جائز نہیں ہے، اگر حضور عورتوں اور ناکردہ گناہ بچوں کا قتل سے باغیوں کو روکیں تو یہ بات حضور کے حق میں دنیا اور عقبیٰ میں بہتر ہوگی، جب دہلی فتح ہوئی تو اتفاق سے یہ عرضی دفتر سے برآمد ہوئی۔ اس

(باقی اگلے صفحہ پر)

بسنت

دہلی میں بہت سی رسمیں رائج ہیں جن میں ایک رسم بسنت بھی ہے جو ہندوؤں کا بڑا دن ہے طرفہ تر یہ ہے ان رسموں کو منانے کا زیادہ تر اہتمام صلحا کی قبروں اور مشائخ کی محفلوں میں ہوتا ہے ہندوؤں میں اس کی تعظیم اس قدر نہیں ہوتی جتنی کہ شہر کے مشائخ میں ہوتی ہے جب گلدستوں کو مطرب لاتے ہیں تو سب بزرگ استقبال کرتے ہیں اور مجلس سماع وجد گرم ہوتی ہے ان اسرار و رموز کو بے کار نہیں کہنا چاہیے، موسیقاروں نے راگوں کے لیے جو صورتیں اور اوقات مقرر کئے ہیں، وہ ہندوؤں کے اعتقاد کی بناء پر ہیں۔

چشتیہ سلسلے کے مشائخ خاص طور سے بسنت کو اہمیت دیتے ہیں حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی لکھتے ہیں

"دیکھو نیاز اس رنگ، کیسی سہاتی ہے بسنت ناز و ادا سے جھومنا خواجہ کی چوکھٹ چومنا"

شاہ مرداں

ایک اور جگہ ہے جس کو شاہ مرداں کہتے ہیں یہاں بھی قدم شریف کی طرح کا دستور ہے[۱]

رسم حنابندی

دوسری رسم حنابندی ہے یہ نئی رسم سے ہے مذہب امامیہ کے لوگوں اور عوام کا عمل اس کا ماخذ ہوگا کیونکہ یہ لوگ عشرۂ محرم کے دنوں میں ساتویں تاریخ کو قاسم بن حسن رضی اللہ سے حنابندی منسوب کرتے ہیں

[۱] ادہم بائی زوجہ محمد شاہ بادشاہ جس کو احمد شاہ کی سلطنت میں اول نواب بائی اور پھر نواب قدسیہ صاحب زمانی کا خطاب ملا شیعہ مذہب کی تھی، ۱۱۳۰ھ / ۱۷۲۴ء میں ادہم بائی کے پاس ایک پتھر آیا جس پر ایک نقش قدم تھا بیان یہ کیا گیا کہ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نقش قدم ہے ادہم بائی نے اس نقش قدم کو سنگ مرمر کے حوض میں نصب کروا دیا اس حوض کے نیچے مرمر کا فرش کر کے مجر بنوایا اور اس کے کنارے پر یہ شعر کندہ ہے۔

سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود

کوٹلہ فیروز شاہ

مشہور مکانوں میں سے کوٹلہ فیروز شاہ ہے اس میں ایک مینار ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی پتھر ہے اس کی لمبائی چوڑائی اس کا انکار کرتی ہے کیونکہ اتنے بڑے پتھر کو کھڑا نہیں کر سکتے اور اگر سب پہاڑ ہو اور اس کو تراش تراش کر اسے چھوڑ دیا ہو تو یہ بھی تعجب کی بات ہے۔[۱]

۱؎ فیروز شاہ تغلق نے ۷۵۵ھ / ۱۳۵۴ء میں فیروز آباد کے نام سے دہلی سے متصل ایک بنا وسیع شہر تعمیر کیا جو نہایت شاندار تھا، مدرسے حمام۔ سرائیں۔ حویلیاں اور محلات تعمیر ہوئے۔ ایک محل کوشک فیروز شاہ یا فیروز شاہ کے کوٹلے کے نام سے مشہور ہے یہ عمارت اب بالکل ختم ہو گئی۔ صرف اس کوٹلے کی فصیل کہیں کہیں باقی ہے۔ جو دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا اعلان کر رہی ہے۔ یہ فصیل ۶۰ فٹ بلند ہے کوٹلے کے غرائبات میں سے تین بڑی بھاری اور لمبی لمبی سرنگیں ہیں ان کے علاوہ کوٹلے میں دو نادر چیزیں اور قابل دید ہیں۔ ایک فیروز آباد کی بے نظیر مسجد جو فیروز شاہ نے بنوائی ہے اور دوسرے اشوکا کی لاٹ جو عموماً فیروز شاہ کی لاٹ کہلاتی

سر سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں "سرکار دولتمدار انگریزی نے اس کوٹلہ کے ٹوٹنے کا حکم دیا ہے اور جہاں کہیں پتھر کی خواہش ہوئی ہے یہاں سے ٹوٹ کر جاتا ہے۔ عن قریب یہ بھی نیست و نابود ہو جائے گا اور قلعوں کی طرح اس کو بھی کوئی نہیں جانے گا کہ کیا تھا اور کیا ہوا۔"

۲؎ گویا ایں فقرا ایں باغ ہمایوں را ببیں — ہر کہ می خواہد کہ بیند شکل فردوس بریں

۱۱ ربیع الاول ۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء کو ہمایوں بادشاہ نے کوٹھے سے گر کر انتقال کیا اور اس مقبرہ میں جو شہر دہلی سے تقریباً پانچ میل جنوب کی طرف موضع کیلوکھیڑی کی حدود میں ہے۔ دفن کیا گیا بادشاہ کی حرم محترم حمیدہ بانو بیگم ملقب بہ مریم مکانی المعروف بہ نواب حاجی بیگم صاحبہ نے جو اکبر بادشاہ کی والدہ تھیں۔ اپنے شوہر کا بے نظیر مقبرہ تعمیر کرایا جس کی تکمیل ۹۷۳ھ / ۱۵۶۵ء میں ہوئی۔ ہمایوں کا مقبرہ نہایت عالی شان اور قابل دید ہے۔ عمارت سنگ سرخ اور سنگ مرمر سے بنی ہے ہمایوں کا مقبرہ دراصل خاندان تیموریہ کی ہڈروا ہے۔ حمیدہ بیگم دارالشکوہ فرخ سیر، جہاندار شاہ، رفیع الدولہ، رفیع الدرجات عالمگیر ثانی وغیرہ اسی مقبرہ میں آسودہ خواب ہیں۔ آخری تاجدار مغلیہ شاہ سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں آخر اسی مقبرہ میں پناہ لی تھی۔

"نظام الدین اولیاءؒ"

ایک مزار نظام الدین اولیاء کا ہے جو بدایوں کے قاضی زادہ تھے[۱] علوم رسمیہ حاصل کرنے اور بحاث (بہت بحث کرنے والا) کا لقب پانے کے دہلی پہونچے تاکہ عہدۂ قضا کی سند حاصل کریں۔ قسمت نے ان کو فقر کی جانب کھینچا اور اجودھن میں جاکر شیخ فریدالدین گنج شکر کی خدمت میں اصلاح نفس کی پھر دہلی میں آکر دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔

---

[۱] شہر بخارا کے دو بزرگ سید علی بخاری و سید عرب بخاری ترک وطن فرماکر شمس الدین التمش کے عہد میں لاہور ہوتے ہوئے بدایوں آئے۔ یہ دونوں بزرگ سگے بھائی تھے۔ سید علی کے صاحبزادے سید احمد اور سید عرب کی صاحبزادی زلیخا تھیں۔ بعد کو ان دونوں اولادوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کردیا گیا جن کے نورعین حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء بدایونی صفر ۶۳۱ھ/۱۲۳۳ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے بدایوں میں حضرت محبوب الٰہی کے مکانات متصل سید بازہ تنگی ٹیلہ پر اس جگہ پہ تھے جہاں آج کل کالیے رہتے ہیں۔ وہاں ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا کے بچپن ہی میں سید احمد کا انتقال ہوگیا۔ (۶۳۵ھ/۱۲۳۸ء) حضرت سید احمد کا مزار ساغرتال (بدایوں کے قریب نہایت پرفضا مقام) پر واقع ہے مسجد، گنبد اور چہار دیواری کی تعمیر حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے کرائی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ نے بہ احسن وجوہ فرمائی بچپن میں مسجد محلہ سوتھ (بدایوں) میں بیٹھ کر مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس مسجد میں ایک طاقچہ بطور یادگار موجود ہے نظام الدین اولیاء نہایت ذکی و ذہین تھے۔ بحث و مباحثہ میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ اسی لیے حضرت کا لقب بحاث اور نظام محفل شکن مشہور ہوگیا۔ حضرت نظام الدین اولیا نے قرآن شریف کا ایک پارہ حافظ شادی مقری بدایونی سے پڑھا اس کے بعد مولانا علاء الدین اصولی سے پڑھا کتاب مشارق الانوار کی سند مولانا کمال الدین سے حاصل کی۔ بدایوں میں جب انہوں نے علوم سے فراغت پائی تو علماء و مشائخ وقت کے سامنے دستاربندی ہوئی۔ بدایوں کے ایک عالم اور صاحب باطن بزرگ مولانا علی نامی بدایونی نے اپنے ہاتھ سے حضرت نظام الدین اولیاء کے سر پر دستار باندھی۔ یہ دستار حضرت کی والدہ نے خود سوت کات کر بنوائی تھی۔ پھر مزید علوم کی تکمیل دہلی پہونچ کر حضرت مولانا شمس الدین خوارزمی

کی خواب گاہ اس وقت ویرانہ میں ہے چشتی نظامی سلسلہ ان ہی سے جاری ہے۔
شاہ عالم بادشاہ تک جس نے ۶ رمضان ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء بروز سہ شنبہ آخر شب میں ۴۸ سال ۴ ماہ ۶ یوم سلطنت کر کے اس خاکدان کو چھوڑا اور خواجہ قطب الدین کاکی کے جوار میں ابدی آرام گاہ

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ)
قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ مروجہ علوم وفنون نہایت توجہ سے حاصل کیے۔ شاعری کی طرف شروع سے ہی میلان تھا چنانچہ فن شاعری میں کمال حاصل کیا۔ امیر خسرو شہزادہ محمد شہید اور دوسرے سلاطین کے دربار سے وابستہ رہے۔ امیر خسرو حضرت نظام الدین اولیاء کے ممتاز خلفا میں سے تھے ۷۲۵ھ / ۱۳۱۴ء میں فوت ہوئے۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں دفن ہوئے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔
(۱) سوانح حیات امیر خسرو از پروفیسر محمد مجیب، مترجمہ حیات اللہ انصاری (ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۴۷ء)
(۲) حیات امیر خسرو از خان بہادر محمد خاں (کراچی ۱۹۵۶ء) شعر العجم حصہ دوم از مولانا شبلی صفحہ ۹۶۔ ۱۷۵ (اعظم گڑھ ۱۹۵۷ء) (۳) تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی کلکتہ ۱۸۶۲ء (۵)

ل نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے والد شیخ محمد یحییٰ لاہور میں پیدا ہوئے اور پھر اودھ میں منتقل ہو گئے۔ شیخ محمود پشمینہ کے تاجر تھے۔ نصیر محمود کی پیدائش اودھ میں ہوئی۔ والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا اور والدہ نے نہایت اہتمام سے آپ کی تعلیم وتربیت فرمائی۔ ۴۳ سال کی عمر میں حضرت نظام الدین اولیاء کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ حضرت چراغ دہلی کے تعلقات سلطان محمد تغلق کے ساتھ خوشگوار نہیں رہے۔ ۱۸ رمضان ۷۵۷ھ / ۱۳۵۶ء میں رحلت فرمائی۔ حضرت کے ملفوظات کے دو مجموعے خیر المجالس اور مفتاح العاشقین ہیں جو طبع ہو چکے ہیں۔ اول الذکر پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بڑی محنت سے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔
(۲) خیر المجالس مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ (علی گڑھ)

باؤلی

وہاں (درگاہ نظام الدین اولیا) پر ایک کنواں ہے جس کو ہندوستان میں بہ اختلاف لہجہ باؤلی اور باوری کہتے ہیں۔ یہ کنواں بہت گہرا ہے اور اس کے کنارے پر اونچے اونچے درخت ہیں شہر کے فاقہ مست، شرابی اور جواری مردہ کی نعش اٹھاتے اور بلّم ہاتھ میں لے کر سواری ساتھ چلتے ہیں اور کل کے لیے اپنے پاس ایک پائی نہیں رکھتے ہیں، ان درختوں پر بیٹھ جاتے ہیں لوگ ان کو پیسہ دکھا کر پانی میں ڈال دیتے ہیں وہ لوگ اتنی جلدی اس میں کودتے ہیں کہ پیسہ کو تہ میں نہیں پہونچنے دیتے اور ہاتھ میں لاکر پھینکنے والے کو دکھاتے ہیں اور رکھ لیتے ہیں مگر یہ گروہ چوری اور خیانت نہیں کرتا۔

لہ یہ باؤلی حضرت شاہ نظام الدین اولیا نے غیاث الدین تغلق کے زمانے میں تعمیر کردائی تھی۔ اس باؤلی کے چاروں طرف دیوار نما پختہ بندش ہے اور شمال کی جانب اترنے کی سیڑھیاں ہیں جو باؤلی کی تہ تک چلی گئی ہیں۔ یہ باؤلی مکمل سنگ خارا کی بنی ہوئی ہے باؤلی کے جنوبی رُخ کی تمامی عمارات فیروز شاہ کے عہد کی بنی ہوئی ہیں جن میں درے درے بنے ہوئے ہیں اور باؤلی کے اوپر آنے کا راستہ ہے۔ یہاں ایک نہایت بدخط کتبہ بخط عربی یہ ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعہد دولت شاہ معظم خجستہ خسرو اولاد آدم	مدار دین احمد شاہ فیروز شہ صاحب قرآن سلطان اعظم
موفق گشت از حق بندہ معروف اساس ایں عمارت کرد محکم	جوار روضۂ شیخ المشائخ نظام الحق والدین قطب عالم
وحید الدین قریشی دار الامن کہ با اہل ارادت بود ہمدم	بحسن اعتقاد و صدق اخلاص در اسرار ولی اللہ محرم

مجرّ محمد شاہ بادشاہ

محمدؐ شاہ بادشاہ کی قبر بھی وہیں (درگاہ نظام الدین اولیاء میں) ہے۔[1]

[1] درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے احاطے کے صحن میں محمد شاہ بادشاہ کا مجر ہے۔ یہ بادشاہ ایسے زمانہ میں تخت نشین ہوا جب کہ سارے ملک میں بدنظمی اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ باج گزار راجاؤں اور امراء نے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا سب سے بڑی مصیبت نادر شاہ کا حملہ تھا، جو دہلی کو تباہ کر گیا محمد شاہ، حملۂ نادری کے بعد آٹھ سال تک زندہ رہا۔ انتقال کے بعد درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں دفن ہوا۔

مجر محمد شاہ کا احاطہ مستطیل ۲۰×۱۶ فٹ ہے۔ جس کے چاروں گوشوں پر سنگ مرمر کے چھوٹے چھوٹے منارے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی مجر کی تمام تعمیر سنگ مرمر سے ہوئی ہے۔ اس کی نفاست و خوب صورتی کے سلسلے میں سر سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں:۔

"نفاست اور لطافت اس کی بیان سے باہر ہے۔ گل بوٹے پتے منبت کاری کے ایسے خوب بنائے ہیں کہ گویا کارسامری ہے نگار خانۂ چین بھی اس کے آگے مات ہے۔ جالیاں سنگِ مرمر کی ایسی تحفہ بنی ہوئی ہیں کہ بیان سے ہے بے تامل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا آسمان سے تارے جگمگ کرتے ہیں۔ اور کبھی معلوم ہوتا ہے کہ چادر نور ہے کہ گرد قبر کے تان دی ہے۔"

(۱) اخبار الصنادید باب اول ص۳۹ (۲) یادگار دہلی ص۳۰۲ (۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم صفحہ ۹۶-۹۷۔۹۷ (۴) تاریخ پادشاہانِ دہلی از مولوی مقبول احمد ابن مولوی قدرت احمد گوپاموی ص۱۵ (مطبع حسنی میر حسن رضوی لکھنؤ ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء)

مجرّ جہاں آرا بیگم

شاہی خاندان کی بیگمات میں سے ایک بیگم کی قبر بھی وہاں موجود ہے۔ قبر کا ایک شعر یہ ہے۔ [لہ]

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا   کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیا بس است

مرے مزار کے چادر نہ کبھی پاس رہی   ہمیشہ گورِ غریباں پہ اگی گھاس رہی

لہ یہ مجرّ جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں بادشاہ کا ہے جہاں آرا بیگم حسن و جمال و عقل و فراست میں مشہور زمانہ تھی تعلیم نہایت اعلیٰ ہوئی تھی۔ مشائخ چشت کے حالات میں مونس الارواح اس کی مشہور کتاب ہے جو چھپ چکی ہے۔ شاہجہاں بادشاہ کے زمانۂ نظربندی میں وہ بھی باپ کے ساتھ آگرہ کے قلعہ میں رہی اورنگ زیب نے ناراض ہو کر جہاں آرا بیگم کے کچھ معمولات بھی بند کر دیئے تھے۔ شاہجہاں نے ۱۰۷۶ھ / ۱۶۶۶ء میں انتقال کیا۔ اس کے باپ کے انتقال کے پندرہ سال بعد جہاں آرا بیگم نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ جہاں آرا بیگم نے اپنی زندگی ہی میں زمین خرید کر سنگ مرمر کا خطیرہ بنوایا۔ تعویذ کے بیچ میں مٹی بھری ہوئی ہے۔ جہاں آرا بیگم کی قبر کے

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) سرہانے ایک پتلی سی سنگ مرمر کی تختی نہایت خوشنما لوح کی کھڑی ہے جس پر بخط عربی سنگ موسیٰ کی پچیکاری سے درج ذیل نہایت خوشخط کتبہ بنایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شعر خود شہزادی مرحومہ کا ہے۔

هو الحی القیوم

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا   کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

الفقیرۃ الفانیۃ جہاں آرا مرید خواجگان چشت بنت شاہجہاں بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ (۱) اخبار الصنادید باب اول ص۳۹ (۲) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم صفحہ ۹۴، ۹۵ (۳) یادگار دہلی ص۲۰۲ (۴) بزم تیموریہ از صباح الدین عبدالرحمٰن ص۴۴۔۱۵۵ (مطبع معارف الحکم ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء)

خواجہ قطب الدین کاکی

اس مینار کے قریب جو ہاپوڑ سے جمنا کی جانب نظر آتا ہے خواجہ قطب الدین کاکی کا مزار ہے کہتے ہیں کہ شمس الدین ایک مسجد بنوا رہا تھا یہ اس کا ایک مینار ہے۔

---

۳ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے والد کا نام کمال الدین تھا ماوراء النہر کے قصبہ اوش میں پیدا ہوئے۔ حضرت خواجہ کاکی، حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے اکابر خلفا میں سے تھے خواجہ قطب الدین کاکی نے شمالی ہند میں چشتیہ سلسلہ پھیلانے میں بہت سعی فرمائی اور انہوں نے عہد التمش میں دہلی آکر ارشاد و تلقین کا ہنگامہ برپا کر دیا۔ حضرت خواجہ کاکی کا وصال ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء میں ہوا۔ مفصل حالات کے لیے ملاحظہ ہو:- (۱) تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۰، ۱۵۲ (۲) خزینۃ الاصفیا جز اول ص۲۶۷-۲۷۶ (۳) اخبار الاخیار ص۱۵-۳۷ (۴) آثار الصنادید ص۶۵-۷۰ (۵) دلیل العارفین۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء) (۶) سیر العارفین ص۱۶-۳۱ (۷) سفینۃ الاولیاء صفحہ ۴۸-۵۷

۵ حضرت شیخ فریدالدین مسعود عام طور سے بابا فرید گنج شکرؒ کے لقب سے مشہور ہیں۔ ولادت باسعادت ۵۷۱ھ/۱۱۷۵ء میں قصبہ کھوتوال (ضلع ملتان) میں ہوئی۔ والد کا نام شیخ جمال الدین تھا سلسلہ نسب خلیفہ دوم سیدنا عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ میں حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے ملتان گئے ملتان میں حضرت خواجہ قطب الدین سے بیعت کی۔ حضرت فریدالدین نے مختلف دیار و امصار میں علمائے کرام سے علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل و تکمیل کی۔ ایک مدت تک سیاحت فرمائی۔ پھر خواجہ کاکی کی خدمت میں دہلی ہوئے مرشد نے خلافت سے ممتاز فرمایا۔ مغربی ہند میں خاص طور سے اسلام کی بڑی اشاعت کی۔ پاک پٹن کے اطراف کی بہت سی غیر قوموں کے لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء میں وصال ہوا۔ حضرت کے ملفوظات کے دو مجموعے اسرار الاولیا اور راحت القلوب مشہور ہیں۔ ان کے مشہور خلفا میں حضرت نظام الدین اولیا بدایونی (دہلی)، علاؤالدین احمد صابر (کلیر)، شیخ جمال الدین قطب (ہانسی) بہت مشہور ہیں۔

پاک پٹن میں ہے۔ ان کے مرید نظام الدین بدایونی ہیں جو نظام الدین اولیاء کے نام سے مشہور ہیں۔ دہلی میں ان کا مزار لوگوں کی زیارت گاہ ہے۔ ان کے مرید امیر خسرو دہلوی ہیں جو سلطان الشعرا ہیں تھے۔ ان کا مزار پیر کے قدموں میں ہے۔ دوسرے مشہور مرید و خلیفہ نصیر الدین چراغ دہلی ہیں۔ ان

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ)
سے فرمائی۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر علیہ الرحمۃ کی خدمت میں جب اجودھن حاضر ہوئے تو وہاں حضرت بابا صاحب سے چند پارے کلام اللہ کے اور کچھ کتابیں پڑھیں۔ حضرت بابا صاحب سے نظام الدین اولیاء بدایونی بیعت ہوئے۔ اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ مخلوق کی ہدایت کے لیے حضرت الحکم حضرت بابا صاحب، نظام الدین اولیاء دہلی پہونچے، موضع غیاث پور میں قیام کیا اور مخلوق الٰہی کی ہدایت و رہنمائی میں مصروف ہوئے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے بانی ہوئے۔ خواجہ حسن سنجری، امیر خسرو، نصیر الدین چراغ دہلی جیسے اجل مشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفا میں ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کا وصال ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ / ۱۳۲۴ء کو ہوا۔ مزار غیاث پور بستی نظام الدین اولیاء میں ہے۔ مسجد کی دیوار پر تاریخ وفات کندہ ہے۔

نظام دو گیتی شہ ماہ وطین — سراج دو عالم شدہ بالیقین
چو تاریخ فوتش بجستم ز غیب — ندا داد ہاتف شہنشاہ دیں ۷۲۵ھ

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:۔ (۱) تذکرۃ الواصلین از مولوی رضی الدین بسمل بدایونی ۱۳۳۴ھ (نظامی پریس بدایوں) (۲) سیر الاولیاء صفحہ ۹۱-۱۵۵ (۳) القرآن کراچی مئی ۱۹۵۲ء "حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا بدایونی از محمد ایوب قادری ص ۶-۱۱ (۴) سفینۃ الاولیاء صفحہ ۱۳۳-۱۲۲ (۵) حصہ دوم صفحہ ۹۴-۵۸ (۶) بزم صوفیہ صفحہ ۱۸۰-۱۳۴ (۷) سیر العارفین صفحہ ۵۹-۹۱ (۸) مونس الارواح ص ۱-۱۱۰ (۹) اخبار الاخیار ص ۲۰ (۱۰) خزینۃ الاصفیا ج اول ص ۳۲۸

لے حضرت امیر خسرو کے والد سیف الدین سرداران لاچین میں سے تھے۔ امیر خسرو ۶۵۲ھ / ۱۲۵۴ء میں

دہلی قدیم کی یادگاریں

کیلی

دھات کا ایک ستون ہے جس کا حلقہ دو ہاتھ سے کچھ کم ہوگا اس کو کیلی کہتے ہیں اس کی اصلیت کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں کوئی کہتا ہے کہ یہ اس مسجد کے دائرہ ہندی (دھوپ گھڑی) کی کیلی ہے جس کے مینار بہت بلند تھے مگر وہ مخروطی نہیں ہے دوسرے لوگ تواریخ ہنود سے نقل کرتے ہیں کہ راجہ پرتھی راج نے برہمنوں سے کہا تھا کہ کوئی ایسا جادو کرو کہ ہمارے خاندان سے سلطنت نہ جائے انہوں نے کہا کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اگر اس وقت اس سانپ کے سر میں جس کے اوپر تمام زمین ہے ایسی کیلی ٹھونک دیں کہ وہ نہ مل سکے تو یقیناً تیرے خاندان سے سلطنت زائل نہ ہوگی راجہ نے اس کے بنانے کا حکم دیا، کیلی بنائی گئی اور ٹھونکی گئی راجہ نے کہا مجھے یقین نہیں آتا اس کو نکالو ہر چند ان لوگوں نے کہا کہ پھر یہ گھڑی ہاتھ نہ آئے گی راجہ نے اصرار کیا کیلی کو نکالا گیا دیکھا کہ خون آلود ہے۔ افسوس ہوا، اس کے جائے وقوع کا پتہ لوگ وہاں تک بتاتے ہیں جہاں کیل اکھڑی محلہ آباد ہے پھر وہاں سے دوسری جگہ لے جا کر اس کو نصب کیا گیا ہے۔ کلجگ کے زمانے میں جادو کا اثر نہیں رہا کیونکہ کہتے ہیں کہ مہادیو نے جادو کے تمام الفاظ کو ایسا منتشر کر دیا کہ پھر کوئی درست کر ہی نہیں سکتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس جنگ کے ہتھیاروں میں کا ایک ہتھیار ہے جو دریودھن اور جدھشٹر میں کروکشیتر کے میدان میں ہوئی تھی۔ اس کو کسی نے لاکر یہاں کھڑا کر دیا ہے ان لوگوں کی بعید از خیال طاقت سے قطع نظر کر کے کہ ایسی مستعد باتیں ہر فریق کی تاریخوں میں ہیں ایک بات اور غور طلب ہے کہ مسلمان سلاطین ہندوؤں کے بیکار ہتھیار کو کیوں ایستادہ کراتے۔

محیط پانچ فٹ تین انچ ہے اور اس کی نسبت یہ کہانی مشہور ہے جو بالکل غلط ہے، کہ راۓ پتھورا کے وقت میں پنڈتوں نے اس کو باسک ناگ کے سر پر اس غرض سے گاڑا تھا کہ راۓ پتھورا کے خاندان کی عملداری کبھی نہ ٹلے۔ اس پر سنسکرت اور ناگری حروف میں تین اشلوک کندہ ہیں۔ جن کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ سندھ کے راجہ، راجہ دھارا سے لڑنے کو فوج جمع کی تھی۔ بعد لڑائی کے راجہ دھارا نے فتح پائی اور یہ لاٹھ بطور یادگار اپنی فتح کے بنائی، مگر اس کے بننے سے پہلے مر گیا۔

اس راجہ کا

کچھ حال معلوم نہیں ہوا بجز اس کے کہ ہستنا پور کے راجاؤں میں کا ایک راجہ ہے اور اس قسم کے ناگری حروف تیسری یا چوتھی صدی عیسوی میں مروج تھے

ہمارے نزدیک یہ لاٹھ راجہ بیدی راۓ عرف راجہ دہارا کی بنائی ہوئی ہے جو راجہ ہشٹر کی اولاد میں سے انیسواں راجہ ہے اور اگرچہ یہ راجہ اندرپت سے آ بسے تھے ورنہ قدیم تخت گاہ ان کا ہستنا پور ہی تھا اور اس سبب سے ہستنا پور کے راجہ کہلاتے تھے۔ مذہب اس راجہ کا بشنوی تھا اور اس لاٹھ کے کتبہ سے بھی یہی مذہب معلوم ہوتا ہے۔

تاریخ کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ راجہ میدہاری ایک ہزار نو سو برس۔ برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام مسند نشین ہوا لیکن انگریزی مورخوں نے جو صحیح حساب راجہ جدہشٹر کی مسند نشینی کا نکالا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ راجہ آٹھ سو بچانوے سال قبل حضرت مسیح علیہ السلام مسند نشین ہوا تھا۔ اور اس سبب سے ہماری راۓ میں یہ لاٹھ نویں صدی میں قبل حضرت مسیح علیہ السلام بنی لیکن ناتمام پڑی رہی، اور ایک بعدت بعد کسی راجہ نے راجہ دہارا کا فتح نامہ جس مقصد سے اس راجہ نے اس کو بنایا تھا کھدوا کر لاٹھ کو نصب کر دیا اور کچھ عجب نہیں کہ یہ بات تیسری یا چوتھی صدی عیسوی میں ہوئی ہو۔ اس لاٹھ پر سمت کندہ نہ ہونے سے یقین پڑتا ہے کہ بکرماجیت سے پہلے ہے کیونکہ بکرماجیت کے بعد سمت لکھنے کا اور کوئی نہ کوئی سنہ مقرر کرنے کا رواج ہو گیا تھا۔

بعد چوہانوں کی حکومت ہوگئی۔ یہاں تک کہ راجہ سمیر کی نوبت آئی۔ اس کا لڑکا پرتھی راج چوہان (رائے پتھورا) ہوا ہے جو ناہر رائے پربار مارواڑ کے راجہ کو زیر کر کے اس کی لڑکی کو پکڑ لایا اور اس سے تعلق کر لیا اور قندھار پر بھی یورش کی اس وقت بھولا بھیم سولنکی حاکم گجرات نے دہلی پر چڑھائی کر کے راجہ سمیر کو قتل کیا۔ پرتھی راج اس کا تعاقب کرتا ہوا وہیں پہونچا اور اس کو اس کی بداعمالی کی سزا دی، سات مرتبہ معزالدین سام کو شکست دی، قید کر لیا اور پھر چھوڑ دیا جے چند راٹھور حاکم قنوج کی لڑکی سنجوگتا کے سوئمبر سے اس کو اٹھا لایا تھا بالآخر معزالدین سام کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا اور مارا گیا اس کے باذخوان چند و نامی نے راسا نام کی ایک کتاب میں اس کی رزم و بزم کے حالات لکھے ہیں

معزالدین سام خود اپنے ملک کو چلا گیا اور اپنے غلام قطب الدین ایبک کو یہاں چھوڑ گیا۔ ایبک چھ انگلی والے کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا غلام شمس الدین التمش قائم مقام ہوا جس کا صدقہ جاریہ حوض شمسی اور خواجہ قطب الدین کاکی کے مزار کے قریب بلند مینارہ (قطب مینار) ہے۔

پرتھی راج راسا مصنفہ چند کوی پرتھی راج چوہان سے متعلق یہ کتاب پرتھی راج کے زمانے کی نہیں ہے۔ بلکہ بہت بعد میں لکھی گئی ہے اور تاریخی اعتبار سے اس کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ پروفیسر محمود خاں شیرانی کا یہ تحقیقی و تنقیدی "پرتھی راج راسا" (مطالب و تنقید و تبصرہ) کے عنوان سے ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے طبع ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ کبھی پرتھی راج نے قندھار پر یورش کی اور نہ سات مرتبہ معزالدین سام کو شکست دی۔ یہ سب افسانوی خیال آرائیاں ہیں واقعہ یہ ہے کہ یہ کبھی ان معزالدین سام کی زندگی میں ہندوستان کا دروازہ ۵۷۱ھ میں کھلتا ہے۔ وہ ملاحدہ سے ملتان لیتا ہے (۵۷۱ھ / ۱۱۷۵ء) میں پشاور پر قبضہ کرتا ہے (۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء) میں لاہور فتح کرتا ہے (۵۸۶ھ / ۱۱۹۰ء) میں پرتھی راج کے مقابلہ میں ناکام ہوتا ہے اور ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء میں ترائن کے میدان میں پرتھی راج سے مقابلہ کرتا ہے۔ پرتھی راج مارا جاتا ہے سلطان معزالدین سام فتح پاتا ہے (۱)

(۱) پرتھی راج راسا از پروفیسر محمود خاں شیرانی مطبوعہ مفید عام پریس لاہور ۱۹۴۳ء

۔ التمش سورج گرہن کو کہتے ہیں گرہن کے وقت اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ اسی لیے اس کو التمش کہتے ہیں۔ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا سچا مرید تھا اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی خواجہ معین الدین چشتی کے مرید ہیں۔ اور ان کے نامور مرید شیخ فرید گنج شکر اجودھن ہیں جن کا مزار

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ)

پہنچکر اس نے اپنے فوجی سپاہیوں کو گھر جانے کی اجازت دے دی اور خود بھی وطن کی طرف مراجعت فرما ہوا۔ ۳ شعبان ۶۰۲ھ مطابق ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو جب سلطان لاہور سے دمیک میں پہنچا تو ملاحدہ نے سلطان کو شہید کر دیا۔ صاحب طبقات ناصری نے اس کی سن وفات یہ تحریر کی ہے۔

شہادت ملک بحر و بر معز الدین کز ابتدائے جہاں شہ چو او نیامد یک
سوم ز غرۂ شعبان بسال شش صد دو فتاد در رہ غزنین بمنزل دمیک

سلطان معز الدین سام کا مقتل ایک روایت کے مطابق موضع دھمک (دمیک) ضلع جہلم میں بیان کیا جاتا ہے۔ دھمک کے بالکل قریب ایک راستہ "غوریوں کی بٹھر" کے نام سے مشہور ہے۔ تاریخ ہندی قرون وسطی صفحہ ۲۰۷، ۲۰۸

؎ ایبک ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "چاند کا سردار" ہے۔ ترکوں کے ایک قبیلہ کا نام بھی ایبک تھا۔ مرزا غالب بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں؛

ایبکم از جماعۂ اتراک
در تمامی زماہ دہ چندیم

قطب الدین ایبک کا عہد حکومت ۱۲۰۶ء سے ۱۲۱۰ء تک رہا۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات از خلیق احمد نظامی صفحہ ۴۸ مطبوعہ الجمعیتہ پریس دہلی ۱۹۵۸ء۔)

؎ حضرت خواجہ معین الدین چشتی ہندوستان کے اولیائے کبار اور حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے اجل خلفاء میں سے ہیں۔ حضرت خواجہ اجمیری نے برصغیر ہند و پاک و ہند میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں بڑا کام کیا ہے۔ حضرت خواجہ اجمیری کا وصال رجب ۶۳۲ھ / ۱۲۳۶ء میں ہوا۔ تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو "خزینۃ الاصفیاء" از مفتی غلام سرور لاہوری جلد اول صفحہ ۲۵۶۔ ۲۶۷ (لکھنؤ ۱۹۱۴ء)

حوضِ شمسی

ایک بہت بڑا تالاب ہے جس کو حوضِ شمسی کہتے تالاب کے اندر ایک چھوٹا سا مکان ہے جس کی چھت گول ہے کہتے ہیں کہ بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں وضو کیا ہے اور صبح کو اس مقام پر نئی گھاس جمی ہوئی پائی تعمیر میں وہ جگہ چھوڑ دی ہے۔ کاش اگر مقام کو اپنا دِل اور وضو کو اس کی طہارت کا حکم سمجھ کر دل کی تعمیر کی کوشش کرتا تو اس کی بنیاد پائیدار ہوتی لیکن بادشاہ ہو یا فقیر ہر ایک اسی تصنع اور بناوٹ کو صحیح سمجھتا ہے اور عالم ارواح کے تخت نشینوں کو بھی اس خاک دان کی اشیاء کا نیاز مند خیال کرتا ہے [1]

---

[1] سر سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں:۔

"یہ حوض بھی عجائب روزگار سے تھا اس واسطے حوض شمسی کر کے مشہور ہے کسی زمانہ میں یہ حوض تمام سنگ سُرخ سے بنا ہوا تھا اب (۱۸۴۶ء) دیواریں اور پتھر بالکل اکھڑ گئے ہیں اور تالاب کی سی صورت رہ گئی ہے۔ اسی واسطے اس حوض کو لوگ قطب صاحب کا تالاب کہنے لگے اور بعضے تالاب شمسی کہتے ہیں اسی تالاب میں سے جھرنے میں پانی جاتا ہے اور اسی کا پانی تغلق آباد کے قلعہ کی خندق میں گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنا بڑا حوض شاید روئے زمین پر نہ ہوگا اب بھی یہ تالاب دو سو چھہتر ۲۷۶ بیگہ ۸ بسوہ پختہ ہے۔"

سلطان فیروز شاہ تغلق نے اپنے دورِ حکومت میں اس حوض کی مرمت کرائی اور پانی آنے کے راستے صاف کرائے۔ تقریباً ۱۸۹۰ء میں ڈپٹی کمشنر ڈیوس نے اس حوض کو کسی قدر صاف کرایا تھا جس میں کچھ پانی جمع ہونے لگا تھا مگر بعد کو پھر یہ تالاب پٹ گیا۔

(۱) آثار الصنادید باب اول صفحہ ۳۔۴

(۲) یادگارِ دہلی صفحہ ۲۳۹

(۳) فتوحاتِ فیروز شاہی (علیگڑھ اڈیشن) صفحہ ۱۵

دہلی اور لکھنؤ کی زبان

اکثر لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے محاورے میں جب اختلاف ہو تو کس کو ترجیح دی جائے یہ اختلاف بھی آپس میں تعصب کی وجہ سے ہے دو بڑے شہری اور ادبی مرکزوں میں ایسا ہوتا بھی ہے ۔ میری رائے یہ ہے کہ زبان ریختہ اردو کا مولد شاہجہاں آباد، اکبر آباد، لاہور اور سندھ ہے۔ اس لیے کہ مسلم سلاطین کا قیام ان ہی مقاموں میں رہا ہے اور ہندوستان کی ضرورت سے شاہی لشکریوں کے بعض الفاظ ہندی میں داخل ، اور اکثر ہندی الفاظ لشکریوں کی زبان پر جاری ہو گئے ۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان دونوں زبانوں کا اختلاط اس حد کو پہنچا کہ لشکری ہندو بعض ہندی الفاظ کے معانی بھول گئے اور بعض ہندی الفاظ فارسی زبان میں داخل ہو گئے، خصوصاً دفتر مال اور محاسبہ میں، اب ان الفاظ کی ریختہ میں گنجائش نہیں رہی ۔ جنھیں شہری ہندو کبھی زبان پر نہیں لاتے ۔

تذکیر و تانیث کے متعلق اس کا سماعی ماخذ ہندوؤں کی زبان پر ہے ۔ اس سرزمین میں ایسے مدتوں سے ہندو اور مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں رہی ہے ۔ پنجاب اور بنگال کے محاورے میں اصل تذکیر و تانیث ہندی الفاظ کی سُستی ہوئی ہے ۔ اسی طرح وہ شہر جو دریائے شور کے قریب ہیں ۔ البتہ سندھ اور مارواڑ جو سندھ سے ملا ہوا ہے اس میدان میں نہیں ہے ۔ بلکہ ملک وسط میں جو دوآبہ میں ہے ۔ دریائے گنگا اور جمنا کے قریب بقدر پچاس پچاس کوس کاشی، اودھ، مالوہ، اور بندیل کھنڈ بھی اس میں شریک ہیں ۔ گر اس کا یہ ہے کہ سرحد کے باشندوں کو زیادہ تر دوسرے ملک کے آنے والوں سے معاملہ رہتا تھا ۔ اس لیے وہ آنے والوں کے طرز کلام اور لہجہ کو بہت جلد لے لیتے تھے ۔ بلکہ اگر آنے والے شاہی لشکر ہوں تو لشکر کے طرز گفتگو کو دوسرے لوگوں پر اپنے رعب اور شان اور شوکت کا سبب سمجھتے ہیں ۔ مثلاً بنگال میں میں مِلِش کو بھیڑ سی آخر میں سی، کی زیادتی سے کہنا انگریزی لہجہ کی تقلید میں رواج پا گیا ۔

وہ الفاظ کہ جن کے ہم معانی یا جن کے آخری حروف ہندی الفاظ کے موافق مؤنث سنے ہوں یا ہندی میں ان کے انواع واقسام کو مونث پایا ہوں۔ مونث بولنے چاہئیں ایسے الفاظ میں اکثر یہ طریقہ رہا ہے کہ دہلی آگرہ اور فیض آباد میں تذکیر و تانیث کا فرق نہیں ہوتا اور اگر لکھنو اور دہلی میں فرق ہو جائے تو ان دونوں جگہوں کے لوگوں کا محاورہ جس کے بھی موافق ہوگا اسی کو ترجیح ہوگی۔ اور ہندی کے سنے ہوئے الفاظ کی تذکیر و تانیث میں لکھنؤ والوں کو چاہیے کہ دہلی کے ان شعرا کی تقلید نہ کریں جو فیض آباد میں اور لکھنؤ میں آگئے ہوں۔ بلکہ نواب سالار جنگ کے خاندان اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی اولاد کی اولاد کی تقلید کریں۔ دہلی کے محاورے سے مراد شہر پناہ سے باہر کی زبان نہیں ہے جیسا کہ مغلپورے کے باشندے پتھر یعنی سنگ ،کو "پتھر" بولتے ہیں اور نہ شہر کے اندر سب کی زبان کا نام ہے۔ کیونکہ کشمیری کٹڑے کے لوگ" خدا کے واسطے "کی بجائے" خدا کا واسطا" کہتے ہیں۔

پنجابی دہی کو مونث اور داہنے بائیں کو یعنی چپ وراست کو سجا کھبا "کہتے ہیں۔ اور علاقہ سونی پت وغیرہ کے لوگ جو شاہجہاں آباد میں آبسے ہیں، اب تک" یہ بات کہی نہیں۔" یعنی۔ این سخن گفتنی نیست، کی بجائے یہ بات کہینی نہیں، بولتے ہیں اور روشن پورے کے باشندے نکلی کے بجائے ' جواہر آمد کے معنی ہیں۔ نکسی اور "چچا" یعنی عمو کو چاچا "کہتے ہیں۔ بندیلکھنڈ اور کالپی کے لوگ ' والہ' کی جگہ جو نسبت کا کلمہ ہے" ہارا "کہتے ہیں۔ یہ محاورے شاہجہاں آبادی اردو کے نہیں ہیں بلکہ بنگالی مغل بچے یا ہندی فرنگی دو غلے کلمۂ "ہارا" کو اردو ظاہر کرتے ہیں۔ سندی محاورہ قلعہ مبارک، قلعہ کے بادہلی دروازہ سے کھڑکی کی فراشخانہ اور بازار خانم تک ہے۔

تخفیف الفاظ میں مثلاً ادھر بجائے ایدھر اور کدھر کیدھر میں لکھنو حق بجانب ہے۔ شاہجہاں آباد کے لوگ جن کو اس سلسلہ میں خود اختیاری حاصل ہے۔ حتی کہ مقامات کے ناموں میں بھی تخفیف کر کے سونی پت کو سنیپت کر دیا اور دوسرے الفاظ میں بھی کہ " چاچا کو چچا بنا لیا۔ جب لکھنؤ میں جا کر مقیم ہوئے تو کیوں

مجبور ہوئے۔ محاورے کی سند میں شہر دو طرفہ پتھر اور اینٹ کی دیوار نہیں ہے بلکہ اس شہر کے فصحا کا نام ہے کہ جہاں کہیں ہوں۔

اس زمانہ میں دونوں شہروں (دہلی اور لکھنؤ) کے فصحا نے بعض الفاظ کے ترک میں اتفاق کر لیا ہے۔[1] جیسے اُور (طرف) بِک (جہاں) بھیتر، اندر، بعض دوسرے الفاظ مثلاً تروار اور تلوار یعنی شمشیر کہ دہلی کی بول چال میں پہلا (تلوار) اور لکھنؤ کے محاورہ میں دوسرا (تروار) استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ یہ ہندی لفظ ہے اور دیہاتی ہندو تروار بولتے ہیں۔ اس لیے دہلی کا محاورہ پختہ دلیل ہے۔ انصاف یہ ہے کہ دہلی کی پیروی کریں۔ اور اس وجہ سے کہ اب وہاں (لکھنؤ) کا ہر ایک امیر و فقیر انگریز کی حمایت کی بنا پر دہلی کے اتباع سے غیرت رکھتا ہے تو انہیں اختیار ہے۔ لیکن دوسروں کو بے جا مواخذہ سے معاف رکھیں۔

ایک لفظ ہے کہ ہندوؤں میں "بھاری" مستعمل ہے اور شاہجہاں آباد والے "بھاری" کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح اندھیاری بمعنی تاریکی کہ دہلی کے استعمال میں شروع سے "اندھیری" تخفیف کے ساتھ ہے۔ اب کسی کو اندھیری بڑھا کر لکھنا اور کلمات فارسی اور عربی کو اردو زبان کے اشعار میں نئے سانچے میں ڈھالنا نہیں چاہیے۔ امیر اور کھتری اور دوسرے نومسلم جو ابھی اپنی مادری زبان کو نہیں بھولے تھے کہ اسی زمانہ میں لکھنؤ میں ایک گروہ عہد آصفی سے برگشتہ ہو گیا اور بہت کچھ پس و پیش کرنا پڑا۔ اس نے ان لوگوں میں جن کی اصل زبان پچاس سال پہلے "متفکری ما" فکر یہ ہے اور آپ کی تھی۔ بڑا اعتبار حاصل کر لیا اور جو چاہا کہہ ڈالا۔

گھوڑے کی ایک آنکھ بند ہوتی ہے۔ جس کو اصل ہندی زبان میں اندھیری تخفیف

---

[1] اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو دریائے لطافت از انشاء اللہ خاں انشا صہ ۹ تا ۲۱۔ انجمن ترقی اردو ہند، اورنگ آباد ۱۹۱۶ء)

[2] اس سلسلے میں ملاحظہ ہو دہلی کا دبستان شاعری صہ ۴۷۔ ۳۹۸

کے ساتھ بولتے ہیں۔ حاکم اودھ کے اصطبل میں بھی اس لفظ کے علاوہ دوسرا لفظ نہیں ہے اگرچہ میر تقی سے لے کر میر انشاء اللہ خاں تک اور مصحفی تک بلکہ دہلی اور لکھنؤ کے تمام شعرا اندھیاری اس معنی میں بولتے ہیں لیکن جب تک لشکریوں اور سائیسوں میں عام نہ ہو جائے لغت گر شمار ہوں گے نہ کہ محاورہ داں اور مرزا رفیع سودا نے ایک شعر میں جو شیدی فولاد خاں کی ہجو میں ہے۔

چور جاتے رہے کہ اندھیاری "

کہا ہے۔ لوگوں نے گمان کیا کہ اس زمانہ میں "اندھیاری" بمعنی تاریکی اردو میں مروج تھا یہ نہ سمجھے کہ یہ ایک مشہور مثل ہے۔ اور امثال میں تغیر جائز نہیں۔ اگر اب کوئی انگریزی یا رومی لفظ اردو میں نیا داخل کریں تو اس کی تذکیر و تانیث اس جیسے فارسی اور عربی لفظ کی تذکیر و تانیث کے مطابق ہوگی اور آج کل لکھنؤ میں "جان و گمان" کے نون کو شعر میں ظاہر کرنا چھوڑ دیا ہے اور شاہجہان آباد میں جاری ہے۔ یہ خواہ مخواہ کی ہٹ دھرمی ہے۔ کیوں کہ نثر میں نون کو نہیں چھوڑا ہے اور ہر جگہ بعض چیزیں نظم میں جائز رکھی ہیں اور نثر میں منع کرتے ہیں اور تعلقات وزن و قافیہ کے علاوہ کون سی چیز ایسی ہے جو نثر میں جائز ہو نظم میں ناجائز، اور اگر کوئی بات مختفی (پردہ۔ بندہ) کو الف (دعویٰ۔ چلنا) کے قافیہ میں جو ریختہ میں مروج ہے ترک کر دے تو بہتر ہے۔ دوسروں کو منع نہیں کر سکتے۔ بادشاہی جلوس کے آرائشی سامان میں دہلی، آگرہ بلکہ شوالہ بنارس کے محاورہ کو لکھنؤ کے محاورہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ تین سو سال سے ان مقامات پر یہ سامان مروج ہے اور لکھنؤ میں ابھی تیس سال بھی پورے نہیں ہوئے۔ بس۔ "چنوٹ دہلنا" بالکل فصیح ہے۔ کیوں کہ دہلی کے ہر شاہ و گدا کے روز مرہ میں شامل ہے۔ ماخذ اس کا راجپوتانہ ہے اور ایک کلیہ بتاتا ہوں جس سے زبان دان کو بوزنہ سرشت مقلد سے ممتاز کر سکو۔

اردو زبان میں عربی و فارسی لغات

جس کسی کو اردو نظم و نثر میں فارسی عربی اور ترکی کے الفاظ کے

مقابلہ میں ہندی کے رائج الفاظ زیادہ ہوں تو وہ زبان دان ہے اور اگر دوسری زبان کے لغت کا ہندی پر غلبہ ہے تو وہ اس راستہ کا مرد نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس حیلہ سے اپنی کم مایگی کا عیب چھپالے۔ خاص طور سے وہ لفظ جس کو عام اردو دانوں کے علاوہ فارسی جاننے والے بھی نہ سمجھتے ہوں۔ غرابت کے عیب کی وجہ سے فصاحت میں خلل انداز ہے خواہ شہر دہلی کا استاد کہے یا لکھنؤ کا سحبان فرمائے خواہ آگرہ کی ہزار داستان زبان سے یا بلب گڑھ کے طوطی دہن سے نکلے۔ عصافیر¹ ثنا، نشیمن چشم غول اردو کی عاشقانہ غزل میں اور رکوب آمادہ²، تعالی اللہ چہ، فندق چہ انگشت³، نادرہ کار⁴، حبذا⁵، بلے⁶، مثنوی' افسانہ عشق میں ایسے کان میں کھٹکتے ہیں گویا کوئی سرشام ہی بیہودہ راگ گا رہا ہے۔ البتہ جہاں خواص مخاطب ہوں جیسا کہ اکثر قصائد اور مسائل علمیہ کے بیان میں اتفاق پڑتا ہے تو اس جماعت کے مستعمل الفاظ لانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی احمد شاہ درانی اور بھاؤ کی جنگ کو اس عبارت سے بیان کرے کہ: جب دلی سے لے اودھ تک مغل پٹھان کا مرہٹے کی چڑھائیوں سے جی ناک میں آیا۔ سب نے آپس میں ایک ہو کے یہ ٹھیرایا کہ نجیب خاں کو بیچ میں ڈال کر ٹوپی والوں کو بلائیں اور ا سے ساتھ لے کر برگیوں پر چڑھ جاویں۔ جب بات پکی ہوئی تو اُسے لکھا کہ آپ جس دن سے ادھر کو چلیں اور ان دکھنی لیٹروں سے جب ہمارا سامنا ہو تو آپ ہاتھ ہمارے سر پر رکھیں جو ٹھیراویں سو ہم سے جھگڑا نبیٹے پیچھے ترت لیں وہ یہ سنتے ہی نجیب خاں سے سب بات ٹھیک کر کے اپنے کیل کانٹے، گھوڑے ہتھیار سے بن سنور سور ما تر دریوں کو اپنے ہاتھ سے لے کے چلا اور دکن سے برگی ڈیڑھی دن دوڑے، بات کی بات

۱۔ سبزیاں ۲۔ آمادہ سواری

۳۔ کیا ناخن کے پورے اور کیا انگلیاں ۴۔ تعجب خیز

۵۔ مرحبا ۶۔ نعرۂ تحسین

بس پانی پت پر دونوں دلوں کا جماؤ ہوا، ادھر والوں نے دیکھا کہ ہم برگیوں کے آگے جیسے آئے ہیں لون میں۔ سنگر اپنے آس پاس باندھا اور برگیوں نے گھیرا ڈالا سنگر والے بھوک سے مرنے لگے تو مرنا کیا نہ ہیں کرنا سب نے یوں ٹھانی کہ باہر نکل کر برگیوں کا دو دو ہاتھ کریں۔ ٹوپی والے تو ادھر سنگر سے نکلے اور کچھ داہیں کچھ بایں بچ کر گو بند۔ پر جب وہ دکن سے آتا تھا گئے اور ادھر مرہٹوں کی مت گٹ گئی کہ انھوں نے سنگر باندھا اب تو ٹوپی والوں کا کھیل بن گیا اور وہ چال چوکے ادھر کے تو چھکے چھوٹ گئے اور ادھر لو بارہ۔

جب ٹوپی والے گو بند کا سر کاٹ لائے اور احمد شاہ نے بھاؤ پاس بھیجا وہ دیکھتے ہی اوپر نیچے دیکھنے لگا اور سر پکڑ کر رہ گیا اور بولا کہ یا لنا پڑے سوداؤ۔ دیکھا چاہیے کہ کون جیتے کون ہارے۔ گو بند کا مارا جانا مجھے پکارے کہتا ہے کہ جک ٹوٹا گوٹ کرمری، اس کے پیچھے ایک دن دونوں آپس میں بھڑ گئے۔ یہاں تک کہ لہو کی ندیاں بہیں اور بھاؤ مارا گیا۔ اور گی سب کے سب جس کا جدھر کو منہ اٹھا چل دیا۔ کھیت ٹوپی والوں نے لے لیا۔ اور لوٹ بہت ہاتھ لگی۔ دکھنی نربدا پار اتر گئے۔ مغل پٹھان کا منہ اجالا ہوا۔ ٹوپی والے کا بول بالا ہوا وہ یہاں سے جو ٹھیرا تھا وہ بھی اور بہت سا لے کر اٹک پار گیا۔ یہ سب اپنے ٹھکانے دندناتے منگل گاتے آئے۔"

اس داستان میں نہ اردو کے خلاف کوئی لفظ ہے نہ کوئی فارسی وغیرہ کا لغت اور دوسرے کا طرز بیان اس طرح ہے کہ:

"جب یہ دارالخلافہ شاہجہاں آباد سے لے کر تا لصوبہ اودھ قوم مغلیہ وافاغنہ کے قلوب جنوبیوں کی یورش سے قریب حناجر کے پہنچے کلہم اجمعین نے باہم کنفس واحدہ ہو کے یوں استقرار دیا کہ بوساطت نجیب خاں کے صاحب القلنسوہ کو بلاویں اور اس کی معیت میں جنوبیوں پر یورش کریں۔ جب یہ رائے اذہان میں مستقر و مستحکم ہوئی تو اس سے درخواست کی کہ جناب والا جب یوم مسعود سے اس سمت کو نہضت فرما ہوں اور ان جنوبی قطاع الطریق سے جب ہماری رہائی ہو ظل عاطفت ظل الٰہی ہمارے مفارق پر رہے اور جو امر فیصل معین فرماویں معتقدین با اخلاص سے بعد طے منازعت کے

بہ تعجیل رخم قبض میں لاویں وہ بمجرد استماع کے بخیب خاں سے کل امور اور بتیقین الوقوع فرما کے اپنے مسمار و قلاب دخیل و اسلحہ سے مرتب و مزین ہو کے ابطال سیافوں کو اپنی معیت میں لیکے روانہ ہوا۔ اور جنوبی برگی بھی بجبود لاقبل لہا کبرق خاطف آئے۔ مستقر عسکرین کلیج البصر میں، پانی پت ہوا۔ اس جماعت نے بعیون بصیرت مشاہدہ کیا کہ برگیوں کے جنب میں باعتبار قلت کالملح فی الدقیق ہیں۔ حصار خشیات حول اپنے نصب کیا اور برگیوں نے محاصرہ کیا متحصر جوع سے معدوم ہونے لگے۔ لبقول مشہور الفریق تیثبث لکل حشیش یوں عزم جزم کیا کہ بروز کر کے برگیوں سے ضرب و حرب کریں اصحاب انقلانس تو ادھر حصار سے باز رہے اور بعضے یمین ولیسار بکلہ گو بند پر جو وہ جنوب سے جائے تھا گئے۔ مرہٹوں کی جمع عقل قطع ہو گئی کہ انھوں نے حصار خشی نصب کیا۔ اب اصحاب انقلانس کا لعب درست ہو گیا اور سلوک مسلک خیر کے ناشی ہوا ادھر خیلان الکعاب حسب طلب واقع اور جب اصحاب انقلانس راس گو بند قطع کر لائے اور احمد شاہ نے بھاؤ پاس ارسال کیا، یہ مجرد معاینہ نے نظر بجانب تحت و فوق کی اور اخذ الراس بالید کر کے یہ مقال کیا کہ بناء فخار وفوع خیلان الکعاب ہے، اب تذبذب ہے کہ کون مظفر اور کون منہزم ہو قتل گو بند باعلیٰ صورت مجھے کہتا ہے کہ تفرقہ جمع موجب قتل افراد ہے۔ من بعد یوم ایک میں تلافی فئتین عظیمتین ہوا اور قتال ہوا اور برگی با جمعہم متفرق فسار ہوئے اور معرکہ نربدا سے عبور کر گئے۔ مغل پٹھان کا وجہ انور ہوا اور صاحب القلنسوہ کا قول ارفع، وہ ما تقرر کے علاوہ مال کثیر یہاں سے اخذ کر کے نہر اٹک سے عابر ہوا اور یہ منجزانہ غنا کرتے ہوئے اپنے اپنے مقر میں آئے۔"

پہلی عبارت انشا اللہ خاں کے افسانہ کی سی ہے کہ اس میں سوائے ہندی کے الفاظ کے دوسری زبان کا لغت نہیں آیا اور دوسری عطا حسین خاں کے قصۂ چار درویش کا طرز ہے۔ جو عربی فارسی کے الفاظ شہری اور دیہاتی عوام کی زبان پر جاری ہیں ان کے بدلے ہندی الفاظ لانا ریختہ سے دور ہے۔ جیسے باغ و بہار، گلاب، غنچے، (گذارش) حاکم، راضی، خوش، عقل یاد، حویلی، تنور، دیوار، شہر۔ شاید لوگ

جو لفظ عربی اور فارسی وغیرہ میں جس معنیٰ میں مستعمل ہو اور وہ معنیٰ اردو میں چھوڑ دیے گئے ہوں اور دوسرے معنیٰ میں اس کا استعمال عام ہو گیا ہو تو اردو میں اس کو اصلی معنیٰ میں استعمال کرنا نہیں چاہیئے اور اگر کریں گے تو غرابت کے عیب کی بناء پر فصاحت سے گر جائے گا، جیسا کہ لفظ لحد کہ عربی اور فارسی میں قبر کے معنیٰ میں مستعمل ہے اور اُردو کے محاورہ میں وہ جگہ ہے جہاں مردہ کو غسل دیتے ہیں، اب اُردو میں اس کو قبر کے معنیٰ میں لانا ...... اور ثناء کے استعمال سے بھی زیادہ بُرا ہے، کیونکہ یہ دونوں الفاظ اُردو میں اجنبی اور دریافت طلب ہیں اور سننے والا ان کو اپنے اصلی معنیٰ میں سمجھ کر پریشان ہو جائے گا، اور اس کی صورت ایسی ہو جائے گی کہ کوئی اُردو میں کہے کہ "دم نکل گیا" اور مطلب اس کا یہ ہو کہ "خون نکل آیا" یا کال اور کالا کہکر یہ امید رکھے کہ مخاطب "اس نے وزن کیا یا انہوں نے وزن کیا" کے معنیٰ میں سمجھ لے گا یا "کان" کو بمعنیٰ "تھا" اور "ناک" کو بمعنی "جماع کیا" استعمال کرے تو ہندوستانی فاضل اگرچہ عربی لغت میں یہ معنیٰ دیکھ چکا ہو لیکن اُردو میں ہرگز نہیں سمجھے گا، یا کوئی "مشفق" کو "خائف" کے معنیٰ میں لادے اور کہنے لگے کہ قرآن کریم اور فوائد ضیائیہ میں اسی معنیٰ میں ہے اور سوداؔ کے مصرعہ "صید خائف کی طرح رو بقصا" جاتا ہوں کہ "صید مشفق کی طرح" پڑھنے لگے تو یقیناً دیوانہ ہے، اسی طرح اگر کوئی اردو میں لحد کے دوسرے حرف ح کو حرکت بھی دیدے کہ عربی لغت کو معتبر کتابوں میں وہ ساکن ہے، خواہ عربی لغت والے ہوں یا ہندوستانی اُردو داں سب کے بدن کا رونگٹا کھڑا ہو جائے گا۔[۱]

رام پور میں لفظ کی تذکیر   نوں کی پیروں سے ہندیوں کی زبان پر بھی جاری ہے۔ پنجابیوں کی تقلید میں لفظ دہی یعنی حضرات کو مونث نہیں کہنا چاہیئے بلکہ دوسرے ہندوؤں کے محاورہ کے مطابق مذکر کہنا چاہیے۔ دوسری زبانوں کے الفاظ جو ہندی زبان میں مستعمل ہیں اور مغلوں نے ان کو اپنے محاورہ میں مذکر استعمال کیا ہے۔ ان کو مذکر بولنا چاہیے لیکن

۱ے مصنف کی یہ بحث نہایت صحت مندانہ رجحانات کا پتہ دیتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لسانیات میں کامل مہارت اور دسترس رکھتا ہے۔

یہ خیال کریں کہ اردو نظم اس طرح کی بدنما معلوم ہوگی۔ اس لیے اردو زبان کی تھوڑی ہر قسم کی نظم جو دوسرے لغات سے خالی ہے قلم برداشتہ لکھتا ہوں۔

مثنوی

میلے میں ایک بنیا رات — بیٹے سے کہتا تھا بات
بُرا بول مت منہ سے نکال — اور چلا چل سیدھی چال
پوچھیں مول تو جھوٹ مت بول — جو تولے سو پورا تول
چاول دال گڑ اور دال — سب کی ایک ایک ڈھیری ڈال
چھان پھٹک کر بیچا کر — مول پر رکھ، تھیلی میں بھر
ایک تو دیوے پیسے چار — ایک کہے دس کہے اُدھار
چار کو لے اور دس کو چھوڑ — بیچ چکے تب بکری جوڑ
پھر یہ جانچ کہ آیا کیا — کیا رکھا اور کھایا کیا
پونجی کو مت ہاتھ لگا — بڑھتے میں کچھ رکھ کچھ کھا
اسی ڈول سے تو دن کاٹ — نہیں تو بیٹھ الٹ کر ہاٹ

رُباعی

جب تک چلیں ہاتھ پاؤں چل پھر کے کما!
کچھ اس میں سے کھا اور بھوکوں کو کھلا!
مت ڈر کے جو تھک جاؤں گا کیا کھاوے گا
جب پیٹ میں تھا ماں کے تو کیا کھاتا تھا!

نواب محتشم الدولہ

سیر المحتشم

نواب صاحب نے سیر المحتشم کے نام سے اپنا ایک سفر نامہ ترتیب دیا تھا جس کی اشاعت ۱۲۶۶ھ النبوی مطابق ۱۸۵۰ء میں عمل میں آئی اس کا سرورق بہت دیدہ زیب اور کلاسیکی طرز آرائش کا بہت عمدہ نمونہ ہے اس نادر اشاعت کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ کتابت اچھے خاصے جلی قلم سے ہوئی ہے اور جگہ جگہ زینت صفحات اور زیبائش اوراق کے لیے گل پھول بھی بنائے گئے ہیں۔

طرز املا قدیمانہ ہے اور مختلف لفظوں کو ملا کر لکھا گیا ہے زبان پر بھی کلاسیکی طرز نگارش کے گہرے اثرات ہیں اسلوب ادا پر لکھنؤ اور دہلی کے قدیم اساتذہ کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

نواب صاحب نے مختلف تاریخی عمارتوں کے کتبات بھی اپنے یہاں نقل کیے ہیں۔ راقم الحروف نے اخذ و انتخاب کے سلسلے میں بیشتر نثری کتبات کو شامل نہیں کیا اس سے کتاب کا حجم بڑھ جانے کا خطرہ تھا۔ یہ کتبات آثار الصنادید میں موجود ہیں۔

شاہجہاں آباد میں زیرِ قلعۂ مبارک کوٹھی برادر صاحب مکرم محمد علی خاں میں فروکش ہوئے وہ مکان اپنا تھا۔ دوسرے روز اس شہر کی سیر کے واسطے سوار ہوئے تو ارک شاہی سے جانب مغرب تا بہ دروازۂ لاہوری شہر پناہ کے ایک بازار ہے بقدرِ طول یک کردہ۔

اس بازار کی رونق و فضا کو دیکھ کے سب بازاروں کا تصورِ خوبی دل سے محو ہو گیا اور اس کی روشنی و دلکشائی کو معائنہ کر کے خاص بازار لکھنؤ کا بھی خیالِ خاطر سے محو ہو گیا۔

اگرچہ آسودگی و آبادی میں اور عرض و طول میں اس شہر کو لکھنؤ سے کچھ نسبت نہیں جو انوار و برکاتِ آسمانی اس شہر پر نزول کرتے ہیں کہیں نہ دیکھنے میں آئے اور نہ جو رشحاتِ مراحمِ رحمانی اس خطۂ پاک پر برستے ہیں۔ ہر مکان اس کا مطلعِ انوارِ سعادت ہے اور ہر مقام ہر چشمۂ آثارِ کرامت۔

جس مکان کو دیکھا مخزن نفائس قدرتِ الٰہی ہے اور جس صناع کو خیال کیا مظہرِ صنعتِ کبریائی غرض اس بازار میں دو طرف دکانیں، چونے گچ کی کرسی دار بہت موزوں و خوش قرینہ ہیں اور ان کی سقفِ بام پر بالاخانے یک منزلہ دو منزلہ سہ منزلہ اور بیچ میں اس کے دو سڑکوں کو سنگ ریزہ و بجری سے ایسا پختہ و مصفّا کیا ہے کہ آدمیوں کا منہ اور عمارت کا چہرہ اس میں مثالِ آئینہ کے دکھائی دیتا ہے۔

ہر روز اس پر آب پاشی ہوتی ہے۔ اہلِ گذر کی روح تازی ہوتی ہے

مابینِ دونوں سڑکوں کے بیچ نہر جاری ہے اور کناروں پر سر درختی ہے کہ اس کی ہیئت مجموعی، جدولِ بین السطورِ کتابِ گلستان نظر آتی ہے۔ اسی بازار میں دست راست کو قاضی کی مسجد ہے مولوی محمد حیات صاحب اس میں رہتے تھے اب بھی طالب علم اس میں تحصیلِ علوم کرتے ہیں۔

اس سے آگے کمرہ و باغیچہ مرزا فتح الملک بہادر خلفِ بزرگ حضور والا اور حویلی رام رتن مشہور ہے اور بائیں طرف کوچہ بلاقی بیگم اور نواب محمد میر خاں بہادر اور مکان منشی خلیل اللہ خاں صاحب اور نواب عبدالصمد خاں اور بعض مکاناتِ طوائف اور حویلی منشی آموجان صاحب واقع ہے۔

اور بازار سے جانبِ راست کو باغ و کوٹھی خوش تعمیر ہے کہ شاہجہاں آباد میں اس کی عمارت بھی بے نظیر ہے اور باغ بھی کمال پاکیزہ و دلپذیر اور دست چپ کو سڑک سے خونی دروازہ ہے اس بازار میں بھی عماراتِ عالی اور سڑک پختہ ہے اس کا راستہ بازار خانم اور مسجد جامع کو جاتا ہے اور اس بازار میں سراسر صرافہ اور ساہوکارہ بستا ہے۔

اگرچہ اس بازار میں مسجدیں بہت واقع ہیں مگر ایک مسجد بہت بزرگ و سنگین ہے اس کی تاریخ لکھی جاتی ہے۔

تاریخ

در زمان شہ خورشید سریر
ظلّ حق ماہ زمین شاہ زماں
ناصر الدین کہ محمد شاہ است
تیغ او کفر شکن در دوراں
شرف الدولہ بنا بہ نمودہ
مسجد و مدرسۂ عالی شاں

این دو بیت الشرفِ علم و عمل
ہمچو سعدین فلک کردہ نشان
سال تاریخ بنا گفت خرد
قبلۂ حج ارادت کیشان

اور سڑک سے شمال رو ایک بازار ترپولی کا کہلاتا ہے کہ اس کا راستہ کوڑیا پل اور کشمیری دروازہ کو نکلتا ہے اور محاذی ترپولیہ کے چبوترۂ کوتوالی اور مسجد طلائی نواب روشن الدولہ ہے یہی تاریخ اس پر کندہ ہے۔

تاریخ

بعہدِ بادشاہِ ہفت کشور،
سلیمان فر محمد شاہ داور
بہ نذرِ شاہ بھیک آن قطبِ آفاق
شد این مسجد بزینت در جہان طاق
خدا، بانی ست لیکہ از روی احسان
بنام روشن الدولہ ظفر خان
بتاریخش زہجرت تا شمار است
ہزار و یکصد و سی و چہار است

اسی سمت کو دروازہ چھوٹے دریبہ کا ہے اس بازار میں دکانیں بزازوں کی بکثرت ہیں زربفت سے گزے تک وہاں بیچتے ہیں۔ اور اسی کوچہ میں بہت مکانات جوہریوں کے اور حویلیاں مہاجنوں کی نہایت تکلف و استحکام سے معمور ہیں اور زیور و اسباب تموّل روپے کے بابِ تجارت میں ان کے پاس مہیا اور موجود ہیں۔

باہر اس کوچہ کے شیش محلِ قدیم مرزا اشرف بیگ اور کمرہ حکیم رکن الدولہ مشہور ہے سیر بازار کے واسطے یہ بھی دونوں موفور السرور ہیں۔

اسی سڑک پر ایک طرف جوہری بازار ہے اور دوسری جانب کناری
بازار ہے آگے اس کے چاندنی چوک شاہجہانی ہے کہ اس میں صبح سے تا
نصف شب رونق و آبادانی ہے۔ گرد اس کے دکانیں لداؤ کی کمانچہ دار اور
وضع و قطع میں نامدار شبِ ماہ میں وہ قطعہ مدور بھی ماہِ زمین کہلاتا ہے
اور اس کے بیچ کا حوض نقطۂ مرکزِ دائرہ قمر نظر آتا ہے۔

عصر کے وقت مجمع خلقت سے وہاں ایک کیفیت ہوتی ہے ہر قسم کے
سودے والوں کی وہاں جمعیّت ہوتی ہے ہر امیر و غریب سوار و پیادہ بطریق
تفنّن ہواخوری کو اسی طرف سے نکلتا ہے وہاں بھی ہر اقلیم و ولایت کا آدمی
دکھائی دیتا ہے اور بغل میں اس چوک کے شمال رو ایک سرا و چوک بادشاہی
ہے اور نہر بھی اس میں بہت کیفیت و خوبی سے جاری ہے۔

اگرچہ اس باغ میں کہنگی آگئی ہے مگر اس کی عمارت و سر درختی وہی لطف
دکھا رہی ہے آگے چاندنی چوک کے میوہ فروش و ترکاری والے بیٹھتے ہیں
میوے رنگین اور سبزی طراوت آئین سے دیدہ و دل کو تازگی بخشتی ہیں اس
سے بیشتر دستِ چپ کو بازار بلّی ماران ہے وہ بازار بھی طوالت میں بے پایاں
ہے کہ خاندان حکیم شریف کا وہیں سکونت رکھتا ہے۔

یہ قطعہ ہندو و مسلمانوں سے دُور تک بستا ہے اور دستِ راست کو ایک
کوچہ ہے اسے نیل کا کٹرہ کہتے ہیں اس میں کھتری لوگ بہت متمول و اہل تجارت
رہتے ہیں اس قوم کا حسن و جمال شہرہ آفاق ہے ہر نازنین اس گروہ کی لطافت
و نزاکت میں طاق ہے اس سے بیشتر حویلی بخشی بھوانی شنکر کی سر بازار ہے
اس کو بھی زینت و خوشنمائی میں تمام شہر کی عمارت پر افتخار ہے۔

سامنے اس کے مسجد سنگِ سرخ کی بہت وسیع موسوم بہ فتح پوری تعمیر حرمِ
شاہجہاں ہے اور اس میں طالب علم رہتے ہیں اور شب و روز درس قرآن رہتا ہے
اس سے آگے بازار کھاری باؤلی اور لاہوری دروازہ اس بازار میں بھی کمال آبادی

اور ہر جنس بے اندازہ ہے جس بازار کا کہ یہ بیان ہوا اس میں سے اور صدہا کوچے اور راستے نکلتے ہیں۔

قلعہ کے نیچے، ایک حوض، بہت طویل و عریض، سرکار انگریزی نے بنایا ہے اور اس میں واسطے فیض رسانی کے نہر کو ڈالا ہے ہمیشہ لبالب رہتا ہے ایک جہاں اس سے آرام پاتا ہے اس کے غرب رویہ بارہ دری قدیم نواب اسد خاں وزیر کی تھی اب اس میں عوام لوگ بستے ہیں اُن کو وزیر صاحب مدبیر اورنگ زیب عالمگیر کہتے ہیں اس کے آگے بازار خاص ہے دکانیں اس میں اگرچہ ہر جنس کی موجود ہیں مگر رونق خاص بازارِ لکھنؤ کے آگے بالکل مفقود ہے۔

اس کے برابر بادشاہی فیلخانہ ہے اسی کے پاس قدیمی قہوہ خانہ اور قلعہ کے نزدیک سمت جنوب کو، دوسری سنہری مسجد نواب قدسیہ بیگم زوجہ احمد شاہ بن محمد شاہ کی تعمیر ہے، بالفعل بسبب شکستگی برج کے بادشاہ نے اس کی صورت بدل دی ہے یہ تاریخ اس پر کندہ ہے۔

تاریخ

شکرِ حق در عہدِ احمد شاہِ غازی بادشاہ
خلق پرور، داد گر شاہانِ عالم را پناہ
مسجدے کردہ بنا نواب قدسی مرتبت
باد دایم فیضِ عام آن ملایک بارگاہ
سعی نوابِ بہادر صاحبِ لطف و کرم
ساخت تعمیرِ چنین جاوید عالی دستگاہ
چاہ و حوضِ صافِ صحنش آبروی زمزم است
ہر کہ از آبش طہارت کرد شد پاک از گناہ

اور اسی سمت کو مسجد اکبر آبادی تمام سنگِ سُرخ کی حرم شاہجہاں بادشاہ نے بنائی ہے اس کی وسعت و رفعت سے اپنی ہمّت و عفت دکھلائی ہے۔

اس مسجد کے آگے دہلی دروازہ تک ایک بڑا بازار وسیع ہے اس کو فیض بازار کہتے ہیں بیچ میں اس کے نہر ہے اور دو طرفہ سڑکیں ہیں اور ایک مسجد ستھری روشن الدولہ کی بنائی ہوئی اس بازار میں بھی ہے اس کی تاریخ یہ ہے۔

تاریخ

شکر حق کز یمنِ فیضِ سیّدِ عرفاں پناہ
شاہ بھیک آں مرشدِ کامل ولایت دستگاہ
در زمانِ شاہ اسکندر نشاں جمشید قدر
معدلت گستر محمد شاہِ غازی بادشاہ
روشن الدولہ ظفر خاں صاحب جود و کرم
کرد تعمیرِ طلائی مسجدے عرش اشتباہ
مسجدے کاندر فضائے صحن قدرش آسماں
کردہ جاروب از شعاع مہر شام و پگاہ
حوض صافِ او نشان از چشمۂ کوثر دہد
ہر کہ از آبش وضو سازد شود پاک از گناہ
سال تاریخش رسائی یافت از الہام غیب
مسجدے چون بیت اقصیٰ مہبط نور الٰہ

اور بازار سے متصل شرق رویہ چھاؤنی دریا گنج مشہور ہے اور اس میں ہر کوٹھی و بنگلہ صاحب لوگوں کا، ایک بیت السرور ہے اور نواب شمس الدین خاں کی کوٹھی اور زینت المساجد بھی وہیں ہے فضا و نورانیت میں اس مسجد کا بھی ثانی نہیں ہے یہ مسجد بھی شاہجہاں آباد میں منتخب ہے سنگ سرخ و سنگِ مرمر سے

مرتب ہے اس مسجد کو نواب زینت النسا بیگم دختر اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی حین حیات میں بنوایا ہے مجر تربت بیگم مذکور بھی اسی صحن مسجد میں زینت افزا ہے۔ زینت النسا بیگم بنت بادشاہ محی الدین محمد عالمگیر غازی انار اللہ برہانہ ۱۱۲۲ سنہ ھ۔

اور فیض بازار کی دست راست کو تمام مکانات اُمرا ہیں اور عمارات رؤسا چنانچہ محل کلاں اور کوٹھی نواب فیض طلب خاں اور چیلوں کا کوچہ اور حویلی نواب دبیر الدولہ اور بہت رستے اور گلی کوچے اس طرف واقع ہیں اور اکثر شرفا و فضلا و قضات واہل کمالات وہاں رہتے ہیں اور قلعہ سے دست راست کو نہر و پنچکیاں ہیں اور آگے اس کے میگزین سرکاری اور کوٹھی رزیڈنٹی ہے کہ وہ قدیم حویلی نواب مجد الدولہ عبدالاحد خاں کی تھی اور محاذ میں اس کی حویلی دلکشا، نواب منصور علی خاں وزیر کی واقع ہے کہ اس کی شوکت و شان کے بیان میں زبانِ صدق ترجمان قاصر اور اس کی شمار و تعداد مکانات میں لسانِ قلم عاجز۔ چونکہ "زیب المکان بالمکین" اب وہ بے سرو سامان پڑی ہیں اور ان میں غریب و غربا کرایہ دار رہتے ہیں۔

اس سے آگے کوٹھی نواب حامد علی خاں صاحب کی ہے اور بعض کوٹھیاں عدالت دیوانی و فوجداری کی اور کشمیری دروازہ اور کوٹھی سکندر صاحب اور فخر المساجد اور چند کوٹھیاں سوداگروں کی اور مدرسہ انگریزی و فارسی اسی طرف واقع ہے مسجد مذکور سنگ سرخ و سفید سے تعمیر ہے اگرچہ عرض و طول میں اور مسجدوں سے چھوٹی ہے مگر انداز و خوش وضعی میں بے نظیر ہے یہ مسجد فخر النسا بیگم زوجہ شجاعت خاں نے ۱۱۴۱ سنہ (گیارہ سو اکتالیس) میں بنائی ہے۔

اس محل سے نکل کر صاحبہ محل کی ڈیوڑھی مشہور ہے اور اس کے مشرق رو آگے بڑھ کر نہر اور زینت باڑی ہے کہ وہاں ایک باغ و بارہ دری نواب زینت محل کی بنائی ہوئی ہے اور وہیں پنجابی کٹرہ ہے اور اکثر کوٹھیاں پنجابی سوداگروں کی

اسباب ولایتی سے مرتب ہیں اور شیشہ آلات انگریزی سے مزین (سجی ہوئی)، وہاں ایک مسجد سنگِ سُرخ کی بہت وسیع و فراخ بنا یافتہ ہے اس میں بھی فضلا و طلبا کا گذارہ ہے۔

اس کی جانب شمال و مغرب میں تا بدر روازہ بہت آبادی ہے اور سمت جنوب کو دیوارِ باغ بیگم اور نہر ہے اور اس سے آگے کوٹھی بہادر جنگ خان اور سڑک و بازار و نہر سعادت خاں مشہور ہے۔ اس سے دست چپ میں حویلی و باغ و بارہ دری نواب مذکور ہے۔ اس حویلی میں باون چھتے اور چونسٹھ دروازے بنائے ہیں اس کے جلوخانے اور خواص پورے مانند "حصن حصین" (مضبوط قلعہ) کے تیار کئے ہیں۔ اس کے استحکامِ وسعت کو دیکھ کے بنانے والوں کی ہمّت پر حیرت ہوتی ہے اور اب ان کے وجود سے ان مکانوں کو خالی مشاہدہ کر کے عبرت اور اس کے جنوب رویہ اور بازار و عمارات قدیم و جدید اور بود و باش سوداگرانِ پنجاب کی بہت ہے اور مکان وسیع بی بی جرنیل لونی اختر کا بھی اسی طرف ہے اور اکثر مہاجن و ساہوکار بھی وہاں سکونت رکھتے ہیں آگے اس کے کابلی دروازہ اور فصیل شہر ہے۔

ذکرِ جامع مسجد

بعد اس کے جامع مسجد کو دیکھا اللہ اکبر۔ اس مسجد نور آگین کا مقابلہ صومعہ عالم ایجاد میں کسی نے نہیں دیکھا اور اس مقامِ بیضا جبین کا کسی نے نشان نہیں دیا زینہ اس کا مثالِ منازلِ ولایت کے "سُلّمِ معراجِ عرفانی" اور ہر دروازہ اس کا مانند چہرۂ اہلِ اخلاق کے کشادہ پیشانی صحن وسیع سنگِ سرخ، عقیق یمنی۔

حوضِ سنگِ مرمر آبِ حیات بخش سے تختۂ دریائے نور اور سفیدی سنگِ مرمر خطوطِ سیاہ میں مثالِ بدر الدجیٰ فرشِ سنگِ رخام نور الانوار جائے نماز سویدائے دلِ کعبۂ جہاں مدار محرابِ سعادت سیما فروغِ جبیں ہلال، منبر سراپا ضیا زینہ اوج

عزّ و جلال اس کے سلالہ جگر گوشۂ صخرۂ بیت المقدس کلس زرنگار چشمۂ خورشید درخشاں مینار بلند جہاں نما ستون سقفِ آسمان، حقیقت میں شاہجہاں سے جو کام نیک فرجام ظہور میں آیا ہر ایک خیر و نیکی سے خالی نہیں۔ اور کوئی کردارِ فیض آثار بغیر اظہارِ نیک نامی و ہمّتِ عالی کے نہیں۔

مگر وہ امر کہ سراسر حسناتِ دنیوی و آخروی اور ثمرِ سعادات صوری و معنوی اور باعثِ تحسین ابدی اور موجبِ ثوابِ سرمدی ہے۔

مسجد شاہجہان آباد کی تعمیر ہے کہ اس کا ہر ذرّہ ذریعہ شفاعت خواہی ہے اور ہر گوشہ نشیمن افضالِ الٰہی۔۔ ہر جمعہ کو نمازیوں کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ محراب سے ایواب تک برابر خلقت ہوتی ہے۔

رمضان شریف میں قاری ---- و حافظ ہر طرف کلام اللہ سناتے ہیں میدانِ ایوان تک صفوفِ تراویح سے کوئی جائے خالی نہیں پاتے ہیں بنیاد اس مسجد کی بتاریخ دہم شوال ۱۰۶۰ھ ایک ہزار ساٹھ مطابق سال بست و چہارم جلوس یومِ جمعہ انقضائے ہفت گھڑی روز کہ ستارہ شناسوں نے ساعت مختار قرار دی تھی روبرو نواب سعد اللہ خاں دیوانِ اعلیٰ اور فاضل خاں خانِ سامان کے بحکم اقدس شاہجہاں ڈالی گئی۔

اول جعفر خان کو اہتمام اس عمارت عالی کا پانچ مہینے تک تفویض رہا۔

اس مسجد کے نیچے تیسرے پہر کو گذری لگتی ہے عجب طرح کی کیفیت ہوتی ہے صدہا قسم کا کپڑا اور انواع طرح کا اسباب نو و کہنہ بکتا ہے اور ہر نوع کے جانور یعنی اسپ و شتر و گاؤ خر و طوطی و بلبل و مرغ و کبوتر خرید و فروخت ہوتے ہیں عقب میں اس مسجد کے دار الشفا اور دار البقا واسطے مرضا و طلبا کے بنائے ہیں بالفعل دار الشفا میں بعض سلاطین رہتے ہیں اور دار البقا میں کچھ طالب علم سکونت رکھتے ہیں اور مولوی محمد صدر الدین خاں صاحب ان کی خبرگیری اور تدریس تعلیم کرتے ہیں۔

خلیل اللہ خان نے دو سال تک اس کو بنوایا بعد اس کے نواب سعد اللہ خاں تین برس پانچ مہینے اس کا مہتمم رہا اور بادشاہ بھی گاہ گاہ واسطے ملاحظہ کے تشریف لاتے تھے بعد انتقال سعد اللہ خاں کے سپرد گی روح اللہ خان داروغہ عمارتِ بادشاہی میں بیچ عرصہ شش سال، کے بصرف دہ لاکھ روپیہ بے آخر رمضان اختتام کو پہنچی۔

اور اس مدت تک ہر روز پانچ ہزار بنّا و سنگ تراش و پرچین کار و بیلدار وغیرہ کی مدد رہتی تھی طول اندر سے اس بنائے اشرف کا نوے درعہ اور عرض تیس گز اور بلندی بائیس درعہ اور قطر گنبد کا پندرہ گز اور صحن ایک سو چھتیس درعہ اور عرض و طول اس کے وسط میں پندرہ اور بارہ گز۔

اور گوشۂ کنارۂ حوض پر سمتِ غربی میں، ایک گوشہ سنگِ مرمر کا بطور جانشین کے محمد حسین خاں محلی نے بنایا ہے مشہور کرتے ہیں کہ اُس محلی نے حضرت رسالت مآب کو خواب میں اس مقامِ سعادت التزام میں بیٹھے دیکھا تھا۔ بانیٔ جائے ادب دائی محمد حسین محلی بادشاہی سنہ ھ اور چارگانہ اضلاع پر چار بنگلے بطور بارہ دری کے اور نیچے اس کے ایوان میں حجرے وسیع واسطے اسباب روشنی و جائے نماز وغیرہ کے اور برابر میں جانبِ شمال آثار شریف حضرت نبوی سے ہیں کہ ہر جمعہ کو وہاں درود صلوٰۃ پڑھتے ہیں اور زیارت ان تبرکات کی کرتے ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں، الماس علی خاں، خواجہ سرائے ایک محجر تنگ سرخ کی جالیوں کا بنوایا ہے اور اس پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

تاریخ

پیشِ آثار مبارک سرورِ آخر زمان
در زمانِ شاہِ عالمگیر خاقانِ جہان
باسعادت ساخت دیوارِ حجر از سنگِ سرخ
بندۂ با عتقاد از صدقِ دلِ الماس خان

سالِ تاریخ بنا چون جُست از عقل و خرد
گفت ہاتف بہر خود و اکردُ ابوابِ جنان

اور دونوں بازوؤں میں دو مینارِ رفیع زینہ دار تا بحد نشست گاہ بنگلہ اور اس کے صحن میں تین دروازے سنگین مع مصراعِ برنجی کے آراستہ کئے ہیں اور ان میں دو طرفہ دالان و حجرے واسطے فراش و دربان و ساعت نوازوں کے ترتیب دئے ہیں اور سوائے بیچ کے در کے دو طرفہ دس چشمیں ہیں ہر ایک کی پیشانی لوحِ سنگ مرمر سے پر نور ہے اور سنگِ سیاہ کی پرچین کاری سے یہ عبارت اس پر مسطور۔

کتبہ لوح اوّل

بفرمان شہنشاہِ جہان بادشاہِ زمین و زمان گیہان خدیو کشورستانِ گیتی خداوند گردوں توان موئسس قوانینِ عدل و سیاست۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قضا فرمان قدر قدرت فرخندہ رائے خجستہ منظر فرخ طالع بلند اختر آسمان حشمت انجم سپاہ خورشید عظمت فلک بارگاہ۔ الخ

عبارت

یہ دروازہ دوم مظہرِ قدرت الٰہی مُوردِ کرامت نامتناہی مظہر کلمتہ اللہ العلیا الخاقان الاعدل ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی اس مسجد کی سیڑھیوں پر کلاہ دوز دکان لگاتے ہیں اور کسی جانب خونچے والے اور کبابی اور فالودہ ساز بیٹھتے ہیں۔

اور اس مسجد کی چار سو بازار ہے کہ وہاں سے قلعہ چھ سو گز کے فاصلہ پر واقع ہے اور شمال کی طرف پائی والوں کا بازار ہے اس کی سڑک بھی بہت وسیع ہے اور دو طرفہ دکانیں اور اوپر بالاخانے ہیں۔

اور اس کے دست چپ کو اکثر مکانات و کوٹھیاں مہاجنوں کی ہیں اور دست راست کو بازارِ خانم ہے اس میں آئینہ ساز و خاتم بند و سادہ کار صیقل گر اور شمشیر ساز و کوفت گر و بندوق ساز و نقاش و گھڑی ساز و آہنگر وغیرہ سوداگر بہت رہتے ہیں سمت مغرب کو چاوڑی کا بازار ہے وہ بھی بہت وسیع و آبادان اور عمارات زنگارنگ سے رشک نگارستان ہے اس بازار میں ہر قسم کی اشیا کی دکانیں ہیں جانب راست کو حویلی واملاک شاہ نظام الدین صوبہ دار سابق دہلی کی بنی ہوئی ہے جانب چپ میں چتلا دروازہ اور میر عاشق کا کوچہ کہلاتا ہے اور سمت راست کو روشن پورہ نیا بازار وغیرہ ہے اور کسیری اور ظروف ساز و آہن فروش اُسی طرف بیشتر بستے ہیں آگے اس سے قاضی کا حوض ہے اور دست راست کو ایک اور بازار وسیع دو طرفہ عمارات و مکانات دلکشا اور دکانیں ہر جنس واشیا کی معمور ہیں حویلی و رنگ محل پاینده بیگ خاں کا اور اکثر عمارات عالیشان امرائے قدیم کی اُس طرف واقع ہیں بالفعل احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کا مکان عظیم الشان وہیں ہے۔

اس سے آگے لال کوے کا بازار ہے اور دست راست کو کوچۂ قاسم جان ہے نواب فتح اللہ بیگ خان اور نواب ضیاء الدین خان اور نواب غلام حسین خان اور نواب امین الدین خان اور میاں کالیصاحب کے مکانات اُسی کوچہ میں واقع ہیں اور لعل کوئیے سے آگے دستِ چپ کو ایک مکان قدیم لطافت علی خان کا ہے بالفعل نوابِ زینت محل نے خرید کے خوب مرتب کیا ہے اور اُسی سمت کو بازار کھڑکی فراش خانہ ہے وہاں بھی اکثر عمارات قدیم و جدید دیکھنے میں آئیں شاہجہاں آباد کی اطبا اکثر اُسی طرف رہتے ہیں اور اکثر شرفا لوگ اس میں سکونت رکھتے ہیں۔

اور قاضی کے حوض سے دست چپ کو پہاڑی املی کا محلہ ہے وہ بازار بھی بہت وسیع و فراخ ہے ہر جنس کے دکانداروں سے آباد ہے ہر قوم کے لوگ وہاں بستے

ہیں مگر کشمیری پنڈت لوگ اکثر وہیں رہتے ہیں اس سے آگے مسجد کلاں مشہور کالی مسجد ہے کہ جونا عشاہ مخاطب نخانجہان وزیر فیروزشاہ نے ۷۸۹ ہجری میں یہ مسجد تعمیر کی تھی قبر بھی اس کی وہیں ہے اور یہ کتبہ اس کے دروازہ پر مرقوم ہے

کتبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بفضل وعنایت آفریدگار بعہد دولت بادشاہِ دیندار الواثق بتائید الرحمٰن ابوالمظفر فیروزشاہ السلطان خلّد ملکہ این مسجد بنا کرد بندہ زادۂ درگاہ جونا شہ مقبول المخاطب نخانجہان خدا بریں بندہ رحمت کند ہر کہ دریں مسجد بیاید بدعاء خیر بادشاہ مسلمانان ایں بندہ بفاتحہ واخلاص یاد کند حق تعالیٰ ایں بندہ رابیا بحرمت النبی والہ مسجد مرتب شد بتاریخ دہم ماہ جمادی الآخر ۷۸۹ ہجری وثمانین وسبع ماتہ ہجری۔

اور حویلی شاہ حاجی مرحوم کی بھی وہیں ہے وہ بھی ایک زمانے میں صوبہ دار دہلی اور قریب اس کے درگاہ حضرت شاہ ترکمان صاحب کی ہے۔ یہ بزرگ مرید شیخ شہاب الدین سہروردی کے ہیں ہمیشہ مستغرق رہتے تھے اور بڑے صاحب تصرف تھے۔ تاریخ بست وچہارم رجب ۶۳۸ ہجری عہد سلطنت معزالدین بہرام شاہ میں وفات فرمائی۔

اور وہاں نواب مظفر خاں کی شاندار حویلی ہے وہ مکان بھی شاہجہاں آباد میں عمارات محمد شاہی سے بہت مشہور ومعروف ہے اور وسعت وبزرگی میں نامور اب اس میں غربا لوگ رہتے ہیں۔

اور قاضی کے حوض سے پیشتر سمت جنوب میں اجمیری دروازوں کا بازار ہے اس میں بھی کمال وسعت ہے اس طرف عمارات قدیم نواب قمرالدین خاں وزیر محمد شاہی اور حویلی رضیہ بیگم وغیرہ مکانات عظیم الشان امرائے سابق کے شکستہ وریختہ افتادہ ہیں۔

جامع مسجد کے سمت جنوبی میں بڑا بازار وسیع ہے دو طرفہ دکانیں اور عمارات عالی قایم ہیں اس کے گوشہ جنوبی و شرقی میں باغ و حویلی نواب خانِ دوران خان محمد شاہی واقع ہے اور آگے اُس سے دستِ چپ کو نواب محمد علی خان مُحتسِب کا مکان ہے اور دستِ راست کو حویلی مفتی محمد صدرالدین خان صدر الصدور اور مکان سید محمد امیر خوشنویس کا اور حویلی نواب مرتضیٰ خاں کی اور بازار چتلی قبر کا ہے۔

اس سے دست چپ کو ایک اور بازار امیر خاں مشہور ہے اور مدرسہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کا اسی طرف ہے اس سے آگے رستہ چیلوں کے کوچہ کا اور چاندنی محل واقع ہے یہ بازار بخطِ مستقیم تا بدہلی دروازہ چلا گیا ہے اور چتلی قبر سے آگے دستِ راست کو بھوجلہ پہاڑی ہے وہاں بھی نہایت کثرتِ آبادی ہے آگے اس کے خانقاہ حضرت غلام علی شاہ صاحب کی ہے۔

اس سے آگے ترکمان دروازہ ہے۔ غرض راقم نے یہ تمام بازار سرِ سواری بنظرِ سرسری دیکھا اور بہت سے کوچہ و بازار اور مقامات و مکانات باقی رہ گئے اور اتفاقات سے دو ایک میلے بھی دیکھنے میں آئے ایام ہولی ہم کو وہیں بسر ہوئے، ہر کوچہ و بازار میں شب و روز مردم عوام سانگ بنتے ہیں اور عجیب و غریب نقلیں بناتے ہیں اور ساز و سامان اور لباس و زیور سے آراستہ ہو کر رقص و سرود کرتے ہیں اور دُلہنڈی کے روز باغِ بیگم سمرو میں بڑا عمدہ میلہ ہوتا ہے اور انبوہِ خلقت سے ایک مجمع کثیر رہتا ہے اور تمام شہر کے امیر و غریب وہاں موجود ہوتے ہیں اور بعض فیل و اسپ پر سوار ہو کر پھرتے ہیں۔

اسی طرح دیبی کی چھڑیوں کا میلہ دیکھا ہر شش ماہی میں وہ میلہ بھی بہت پُر کیفیت ہوتا ہے۔

شہر سے تا باغ محل دار خان دو کوس تک سوائے ہجوم زن و مرد کے کچھ نہیں نظر آتا اور سوائے اس کے اور بہت سے محلے ہندو مسلمانوں کے اس شہر میں

ہوتے ہیں کہ بغیر سکونت ایک سال کامل کے اُن کا دیکھنا اور تماشائے قدرت الٰہی کا لطف اُٹھانا محال ہے۔

کہتے ہیں کہ اول اس شہر کی فصیل ناپختہ بحکم شاہجہاں سال ہست وچہارم جلوس میں چار مہینے کے اندر ڈیڑھ لاکھ روپے کے صرف میں فقط سنگ وگل سے تیار ہوئی مگر چند روز میں کثرت بارش اور شدت برسات سے اکثر منہدم ہوگئی پھر سال بست وششم جلوس میں حکم شہر پناہ پختہ کا صادر ہوا بعدہ پانچ لاکھ روپے کے خرچ میں تا دہم جمادی الآخر سنہ ۱۰۶۹ ایک ہزار انسٹھ میں اختتام کو پہنچی اس حصار کا طول چھ ہزار تین سو چونسٹھ گز عرض دیوار چار درعہ اور ارتفاع (بلندی) نو گز اور برج ستائیس اور دروازہ گیارہ اور کھڑکیاں چھ۔

ذکرِ قلعہ مبارک شاہجہاں آباد

بعد انفراغ تماشائے شہر کے اتفاق قلعہ مبارک کے دیکھنے کا ہوا یہ قلعہ حصار اکبرآباد سے دوچند بڑا ہے اور یک لخت سنگ سُرخ سے بنایا ہے طول میں ہزار گز اور عرض میں چھ سو گز اور بلندی پچیس درعہ اور تمام زمین اندرونِ حصار کی چھ لاکھ درعہ اور اس میں چار دروازے دو دریچیاں اور اکیس برج ہیں سات سادہ اور چودہ مُثمن اور گرد خندق پختہ چوڑائی میں پچیس درعہ اور عُمق میں دس گز سمتِ شرقی اس قلعہ مبارک کی، شہر سے شامل ہے اور غربی کنارہ دریائے جمن سے۔

یہ قلعہ حسن وخوشنمائی میں یکتا ہے مگر قابل جنگ ولڑائی کے نہیں ہے اور حقیقت میں شاہجہاں نے اس کو بطریق حویلی کے واسطے بود وباش کے بنایا تھا نہ بارادہ حرب وضرب کے ایک روز دارالشکوہ نے عرض کیا کہ قبلۂ عالم کرسی مسجد جامع کی فصیل قلعہ سے بہت بلند ہے اگر خدا نخواستہ حریف بعد دخل یابی شہر کے مسجد سے توپ داغے تو گولے کی زد محل شاہی تک ممکن ہے فرمایا کہ بابا جان دولت خانہ بادشاہی کا قلعہ وفصیل دریائے اٹک ہے۔ ہرگاہ وہ مقام سدّ راہ مخالف

نہ ہوا تو اس قلعہ کا کیا وجود ہے۔

غرض ہم قلعہ کے لاہوری دروازہ سے داخل ہوئے وہاں ایک احاطہ وسیع ہے اور اس جگہ کمپنی تلنگوں کی رہتی ہے۔

اس سے آگے دروازہ دویم ہے اس دروازے پر ایک عمارت عظیم الشان سنگ سرخ کی منبت کاری سے نہایت بلند و خوش تعمیر بنی ہوئی ہے کہ نیلا آسمان اس کا سرخ رنگ کا محل معلوم ہوتا ہے

اس میں ایک صاحب قلعہ دار سرکار انگریزی کی طرف سے رہا کرتے ہیں اور صاحب ریذیڈنٹ کے نائب کہلاتے ہیں جو رئیس و امیر نو وارد قلعہ کے دیکھنے کو آتا ہے اُن صاحب سے ضرور اجازت چاہتا ہے غرض نیچے اس قصرِ عالی کے ایک بازار یعنی چھتہ قالبی بشکل قوس قزح نہایت بلند و روشن ہے اور طول اس کا بقدر سو گز کے اور دو طرفہ دکانیں کرسی دار مع حجرہ ہائے دو طاقہ بنہایت رفعت و دلکشا ہیں اور چھتہ کی تمام سقف و دیوار نقش و نگار رنگا رنگ سے بکمال زینت و زیبائی ہیں۔

جب اس کی حدِ آخر کو قطع کیا تو ایک چوک جلو خانے کا دیکھا طول میں دو سو گز اور عرض میں ایک سو چالیس گز اور گرد اس کے طاقہائے بلند با حجرہ ہائے وسیع آراستہ اور دو ترپولیے جنوب و شمال میں اور دونوں طرف دو دو سڑکیں اور دو بازار شاہجہانی ہیں، ایک قلعہ کے دہلی دروازہ تک ہے اور دوسرا اصطبلِ خاص اور سلیم گڈھ تک پہنچتا ہے۔

بیچ میں حوض و نہر بھی اسی طرح گذرتی ہے اور سمتِ جنوبی کو خندقِ حصار میں جا کے گرتی ہے۔

اس بازار کے شرق و غرب میں دو دروازہ ہیں مشرقی دروازے کے اندر کی عمارات کو "نو محلہ" کہتے ہیں وہاں سلاطین و شاہزادے رہتے ہیں اور تا فصیل قلعہ اکثر عمارات کارخانجات شاہی اور شاگرد پیشہ لوگوں کے رہایش خانے مثل خواص

و چوبدار وغیرہ واقع ہیں اور سمتِ شمالی میں بھی علی ہذا القیاس چیتر خانہ و توپخانہ و رتھ خانہ وغیرہ مقانات ہیں اور یساول اور بادشاہی نقیب سکونت رکھتے ہیں۔

چوک کی جانبِ شرقی ایک دروازہ کلاں ہے اس پر بھی عمارات عالیشان اور ایوانِ روح افزا واقع ہیں وہاں نقارخانہ سلطانی رہتا ہے اس کے آگے دیوانِ عام ہے اس میں ایک احاطہ وسیع و صحن دلکشا ہے طول میں دو صد و چار درعہ اور عرض میں ایک سو ساٹھ گز اور گرد اُس کے تمام ایوان سنگین اور دروازے جنوبی و شمالی سنگِ سرخ کے منبت کار و سرکشیدہ ہیں۔

سمت شرق کو غرب رویہ ایک دالانِ رفیع الشان با سقف گردوں نشاں و ستونہائے عظمت توامان] سنگ سرخ کا مرمریں سفیدی سے مجلے طول میں شصت و ہفت درعہ اور عرض میں بست و چہار درعہ، سات چشمے طاق ہائے مرغولہ دار سے مُشبّن ہر ایک ستون خطوط زرنگار سے مُزیّن۔

آگے اس کے صحن چبوترہ ہے طول میں ایک سو چار درعہ اور عرض میں ساٹھ گز اور تینوں طرف مُحجّر سنگِ سرخ کی نہایت زیبا اور زیبچ میں اس ایوان والاشان کے ایک شہ نشین سراپا تزئین جھروکہ انبساط آئین۔ خوش رنگ پتھروں کی پرچین کاری سے دیدہ زیب و دل نشین، رنگین تصاویر و گلدستہ ہائے حسین کی معجز نمائی سے سحر آفریں یہ مطلع خورشید جہانبانی نشست گاہِ صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی ہے اور رستہ اس کا اندرون امتیاز محل سے رکھا ہے۔

پیچھے اس کے ایک چوکی بہت عریض و طویل سنگ رُخام کی نہایت پاکیزہ و دُردانی مرصع بہ نگینہ ہائے عقیق یمانی یہ مقام وزرائے عالی وقار کے قیام کے لیے ہیں۔ اس کے اضلاع سہ گانہ میں بیشتر مُحجّر ہیں اور ان کے قبے طلاکار و زرنگار ہیں اس ایوان عالی شان میں تمام فرش قالین ہائے ایرانی اور مخملِ کاشانی کا بچھتا تھا اور پردہ ہائے کارچوبی اور سائبان سقرلاتی پڑے رہتے تھے اور وہاں اپنے اپنے

مراتب پر امرائے اہلِ دربار اور منصب دارانِ ذی اقتدار اور راجگانِ شوکت آثار اور منشیانِ عطارد شعار اور ایلچیان ملوک اور وکلاے ذی احترام رونق افزا ہوتے تھے۔

جب سے کہ سلطنتِ تیموریہ کو انحطاط ہوا اور دولتِ چغتائیہ میں زوال آیا جیسے یہ مکان بھی بے رونق و بے مرمّت اور بے سامان و بے زینت پڑے ہیں۔ اس کے صحن مصفّا میں دو دروازے سے جنوبی و شمالی سنگ سرخ کے منبت کار و سربفلک کشیدہ ہیں ایک رستہ مہتاب باغ کو جاتا ہے اور متصل مہتاب باغ کے ایک مسجد چوبی بہت وسیع و فراخ تعمیر احمد شاہ بن محمد شاہ کی دیکھنے میں آئی۔

دوسرا خواص پورے اور نو محلے کو اور دو دروازے ایوان عام کی بغلوں میں ہیں ایک کو ڈیوڑھی نقار خانہ کہتے ہیں کہ محل کو اُسی طرف سے جاتے ہیں اور دوسرا دروازہ دیوان عام سے جانبِ شمال کو ہے اس سے گذر کے دیوانِ خاص میں داخل ہوتے ہیں۔ اس سے آگے سراپردہ دویم ہے وہاں ایک لال پردہ پڑا رہتا ہے جو شخص دیوان خاص میں داخل ہوتا ہے اسی جائے سے آداب بجالاتا ہے۔

جب ہم نے اس دروازے کو طے کیا تو ایک قصرِ عالی نور مجسّم نظر آیا یعنی ایک بارہ دری سراسر مرمر کی دیکھی گویا عرش کو زمین پر اُتارا ہے اس کی پرچیں کاری کو تفسیر بیضاوی کہیے اور اس کے نقش و نگار کو ترجمہ سورۂ نور لکھیے۔

جدولوں طلائی سے ہر لوح مرمر صفحۂ مُصحف نظر آتی ہے اور سقفِ زرنگار اس کی آفتابِ سوا نیزہ معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرف ایک چوکی دانۂ بلّور کی بوزن دو سہ من بوضع مطبوع تراشیدہ نصب ہے کہ وہ بھی نایاب و منتخب ہے۔ اس نشیمنِ خاص کے تین تین چشمیں ہیں بلند مرغولہ دار ہر جانب کو درجہ اوّل میں اور پانچ پانچ ایوان دویم میں اور سمت شرقی کو جالیاں ایک ایک تختۂ سنگِ مرمر کی بہت حسن و لطافت سے نصب ہیں۔

ایک مُجرّ جانبِ غربی زیر کُرسی "باشبکہ سلیمی" ترتیب دیا ہے اور جانبِ جنوب وشمال صحنِ سنگ مرمر مصفا ہموار ہے کہ دلِ ماہ تمام سو جان سے اس پر نثار ہے بیچ میں اس کے نہر بعرض چار درعہ بشکل مار پیچ میں مع بیل بوٹہ ہائے پرچین کاری کے جاری ہے اور اس کے پیش گاہ میں صحن وسیع ہے بطول ہفتاد درعہ اور گرداگرد ایوانِ رفیع باسنگ سرخ بعرض شش گز راستہ کے چاروں گوشوں پر چار قبہ طلائی سر پر افراختہ نامِ دیوانِ خاص اصلی شاہ محل ہے طول ہیں تمام کرسی عمارت مع صحن دو طرفہ ہشتاد گز اور عرض بست وشش گز اور طول اس نشیمن خاص کا چھتیس درعہ اور عرض چھبیس درعہ

نگینے اس کے پرچین کاری کے بسبب بے غوری وناقدروری شاہانِ متاخرین کے بہت گر گئے اور پھر نصب نہ ہو سکے اور جو آرائش وزینت، صفائی وپاکیزگی پیشتر ان مکانوں میں تھی اب اس کے عشر عشیر بھی نہیں ہے۔

اندرون دیوان خاص کے یہ شعر باب طلا مرقوم ہے:

شعر

اگر فردوس بر روئے زمیں است

ہمیں است وہمیں است وہمیں است

سبحان اللہ بالفعل حضور لامع النور کرامت منشور نے اس قصرِ شاہجہانی اور محل صاحب قرانی کی جس کو فردوس ثانی او جلوہ نورانی کہتے ہیں اپنی رائے عالم آرا اور عقل آسمان پیما سے اصلاح فرمائی ہے یعنی ان چشمہ ہائے ماہ سیما اور ایواب روح افزا میں تختۂ قنات چوبی بکمال ناہمواری وناموزونی لگائی ہیں اور اس پر تکلف اضافہ کیا ہے کہ گلِ سُرخ سے اسے رنگ دیا ہے گویا چاند کو گہن لگایا ہے ماہ کو داغ دکھایا ہے زاغ کو ہما سے ملایا ہے زربفت میں ٹاٹ کا پیوند لگایا ہے۔

نہیں شاید اس شاہ سکندر جاہ حقیقت آگاہ نے اُس تختہ چوب کو آئنہ نمائی دون پروری زمانہ بنایا ہے دگرنہ اس چوبِ کندہ ناتراش کو اس ایوان خوش تراش سے کیا نسبت اور اس خاک بدرنگ کو اس جوہر پاک سے کیا قربت ماشاءاللہ اس

قسم کے اور بھی تصرفات معجز آیات حمام و حیات بخش میں صادر ہوئے ہیں کہ وہ بھی نمونۂ ید بیضا اور یادگار زمانہ ہیں۔

غرض جنوب میں دیوانِ خاص کے ایک اور دالان ہے تمام سنگ مرمر کا بکار طلا و پرچین کاری کہ اس کو "تسبیح خانہ" کہتے ہیں اور عقب میں اس کے خوابگاہ سلطانی اور برج طلائی ہے کہ منظر سیرِ دریا اور نشستگاہِ حضور ہے اور تمام عماراتِ عالیات و محلِ بیگماتِ سنگ مرمر آبِ طلا سے آراستہ ہیں۔

خصوصاً امتیاز محل کہ بزرگ ترین دولتخانہ والا ہے کہ طول اس کا ستاون گز اور عرض چھبیس درعہ ہے اور وسط میں اس کے ایک ایوان بلند ہے درازی میں اٹھتیس درعہ اور عرض میں چھبیس گز با چشمہ ہائے مرغول و طاق ہائے مقبول سرتاپائے سنگ رُخامِ صفا گزیں و در دیوار آئینہ آئین سقفہائے لاجوردی و زرّیں و حجرہ ہائے صبح آثار اور تہ خانہائے خلد نگار

اسی قسم کے مکانات حیرت افزا و دلکشا شرق رو ساحلِ دریائے جمن و تاانتہائے حدّ طولِ قلعہ واقع ہیں

جس قدر عمارات و مکانات اس قلعہ میں بنائے ہیں حصار اکبر آباد میں اس کی ربع بھی نہیں ہیں لیکن وہ مقام دو سو برس سے حوادث بود و باش سے خالی و مامون ہے اور یہ مکان تاحال اپنے ساکنوں سے بھرا ہے۔ اس سبب سے اس کی طراحی و پرچین کاری ہنوز باقی ہے اور اس کے اکثر جائے سے شکستہ و زائل۔

دیوانِ خاص سے سمت شمال کو حمام بہشت نظام یک لخت سنگِ مرمر کا بہت رفعت و وسعت سے تعمیر کیا ہے واقع میں جواہر زواہر اس کے ہر پارۂ سنگ کا پاسنگ ہے اور گوہر و الماس کے تشبیہ سے اس کو ہزار عار و ننگ۔

اس نزہت کدۂ دلنواز کے وسط میں ایک حوض مربع سنگ مرمر سیم پیکر رنگین پتھروں سے پرچین کاری اور سنگ رُخام سے تراشے ہوئے گل و برگ سے "چمنِ ہمیشہ بہار" معلوم ہوتا ہے یا کشتئ جواہر آبدار۔

چاروں کونوں پر چار فوارے اس حوض کو شرمسار ہیں جوش مارتے ہیں اور بالِ ہما سے اس طبق گل پر مگس رانحا کرتے ہیں اس حمام کا بھی ثانی اب تک کہیں نہیں بنا اور اس کی پرچین کاری پر بھی تا حال کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔

عقب میں اس کے ایک اور قصرِ حسین اور ایوانِ فردوس آئیں کہ اس کو آرام گاہ سلطانی کہتے ہیں اور ہم اس کو بہشت ثانی لکھتے ہیں اس کو بھی یک لخت سنگ مرمر سے بنایا ہے اور پرچین کاری کا اس پر گلستانِ بے خزاں لگایا ہے۔

شاہجہان اکثر اسی میں بیٹھتے تھے اور خواب راحت یہیں کیا کرتے تھے۔ اس کی بھی تمام پرچین کاری تحقیق مرجان وغیرہ سے جن میں سے بعض گر پڑے ہیں حضور لامع النور نے اس میں کانچ کے ٹکڑے اور رنگ میں شیشی جمواکر قمر در عقرب کر دیا ہے

اس خوابگاہ کی محراب فلک اشتباہ اور طاق ملا ایک بارگاہ پر علامی سعد اللہ خان وزیر نے کتابہ اس کی تعریف میں انشا کر کے مرقوم کرایا۔

دیوان خاص کے چوک میں ایک چھتہ جنوب رو ہے کہ اس میں ایک دروازہ شرقی زیر فصیل دریا کی طرف جانے کو نکالا ہے اور چوک مذکور میں ایک دروازہ شمالی حیات بخش کھلا ہے کہ اس کے متصل موتی مسجد سراپا سنگ مرمر کی عالمگیر اورنگ زیب نے اپنے سنہ دو جلوسی میں بصرف ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے کے بنا کی ہے یہ مسجد بھی ایک دانہ مروارید معلوم ہوتی ہے۔ عاقل خاں نے یہ آیت تاریخ مصحف مجید سے نکالی ہے۔ اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔

بعد اس کے باغ حیات بخش کو دیکھا کہتے ہیں کہ بادشاہ نے ایک لاکھ چھکڑہ خاکِ کشمیر کا مع انواع گل و ریحان رنگین بہار اور نہال و اشجار میوہ دار کے واسطے اس باغ کے منگوایا تھا اور اقسام کے اثمار و فواکہات سے رشک بہشت نزہت سرشت بنایا تھا اور اس کے عناصر اربع کو ایسا معتدل کیا تھا کہ جو سلاطین والا مقام اور امرائے ذی احترام میں سے کسی کو بیماری مہلک ہوتی تھی اور اطبا کو اس کی چارہ جوئی میں بیچارگی تو

اس مریض کو بحکم بادشاہ وہاں لاتے تھے اور چند روز میں صحیح و سالم گھر کو لے جاتے تھے گویا آب و ہوا اس کی حکمِ دم عیسیٰ رکھتے تھے اور خاک اس کی تاثیرِ اکسیر بخشتی تھی۔

بالفعل اس تر و تازگی و شادابی کا پتا بھی نہیں اور اس فرحت جاں فزائی سے ذرا بھی اثر نہیں مگر اشجار بزرگ و نہار و سیع اس میں بدستور ہیں اس باغ میں ایک درختِ یا کھیل بہت نادر دیکھا کہتے ہیں کہ سوائے اُس کے ہندوستان میں اور کہیں نہیں ثمر اس کا سبز بقدر ناشپاتی کے ہوتا ہے اس کا اچار و مُربہ واسطے مرضِ تحال کے اکثر مفید ہوتا ہے۔

عمارات بشارت آثار و نشیمن ہائے طلسم نگار اسی طرح معمور ہیں لیکن مرمت و صفائی سے مہجور اور سامان آرائش سے معذور۔ چنانچہ بیچ اس کے ایک حوض سنگ سُرخ کا عرض و طول میں شصت در شصت گز کہ چھلّے دار فوارے نقرئی اس کے اندر چھوٹتے تھے۔ اس حوض کا ثانی سوائے تفسیر انا اعطینا کے کہیں نہیں دیکھا۔

بالفعل اس کے وسط میں حضور والا نے سنگِ سرخ کا ایک جل محل بنایا ہے یا آبگینہ کی چھاتی پر پتھر گاڑا ہے گویا سینۂ صفا پر کوہِ الم رکھدیا ہے اور چاروں طرف اس کے فرش و خیابانہائے سنگ سرخ اور نہر ہائے روح پرور ایک طول میں بیس گز اور پنہائی میں چھ گز بہ زیب و زینت جاری ہیں اور ایک میں تیس تیس فوارے سب نقرئی سربلند تھے اب آہنی بھی نہیں ہیں۔

چپ و راست اس حدیقۂ خُلد نشان کے ۲ عمارات دلنشیں سراسر سنگ مرمر سے کُرسی دار بنائی ہیں کہ انکو ساون بھادوں کہتے ہیں اور ہر ایک میں سولہ ستون دو دیوان بنگلہ دار قرار دیے ہیں اور اس پر چار چار چھ گھنڈیاں کلس ہائے زریں موجود ہیں اور بیچ میں اُن کے حوض سنگِ مرمر اور اوپر سے چادر ہائے آبشار موجود ہیں اور عقب چادرِ آب میں طاقچہ ہائے گلدان بنے ہوئے ہیں کہ دن کو اس میں گلدستہ ہائے مرصع جواہر رکھتے تھے اور شب کو شمع ہائے کافوری روشن کرتے تھے۔ یہ کیفیتِ آبشار جوئے بار بار اور لطفِ خیابان دانہار بسبب نہر کے اب بھی اس میں موجود ہیں مگر وہ

شمع کافوری اور گلدستہ طلائی نابود ہیں۔

غرب رو اس کے مشرق کو حیات بخش کی زمین باغ سے یک و نیم درعہ سراسر سنگ سرخ کا بنایا ہے اور بیچ میں اس کے نہر سنگِ مرمر، مرغولہ دار کو ڈالا ہے گویا صفحۂ حنائی پر سفیدۂ صبح سے مد بسم اللہ کھینچا ہے یا تختۂ یاقوت پر سلکِ گوہر کو جڑا ہے۔

وسط میں اس کُرسی کے ایک ایوانِ عالی تمام سنگ مرمر مصفّا کا پرچین کاری سے زنگار رنگ ہے کہ اس کو "موتی محل" کہتے ہیں۔ طول اس کا تیس گز اور عرض پندرہ درعہ ایک سمت اس کے طرف باغ کے ہے اور دوسری جانب واقع ہے سمت دریا کے اور دو طرفہ اس کے شاہ نشین ہیں ہر ایک طول میں آٹھ گز اور عرض میں پانچ گز اور نیچے اس کے ایک حوض سنگِ مرمر کا ہے طول میں چار گز اور عرض میں تین درعہ ایک دانہ سنگ کا اور اندر دو حوض گل عذار اور ہر در و دیوار پرچین کاری سے رشکِ گلزار۔

اوپر اس کے چار برجیاں مذہب کلس دار اس مقام ارم آرام کو جس طرف سے دیکھا سراپا نگار ہے مگر اب اس مکان عظمت نشان میں چند بتر فلاکت اثر سپاہیانِ سراسر ابتر کے پڑے ہیں کہیں ان کی چار پائیاں بچھتی ہیں اور کہیں چولھے بنے ہیں۔

موتی محل کے شمال رو ایک اور ایوان بلند باسقف (چھت) آسمان پیوند ہا آسمان سے ملی ہوئی اور ستون ہائے فلک فرسا (آسمان کو چھونے والے) اور محرابہائے (محرابیں) عالم آرا تمام سنگِ مرمر نور گستر سے معمور ہے۔ ایک حوض دلفروز بحاشیہ پرچین کاری مانند دستِ دُعا اور منظر نزولِ رحمت ہے اور اس لوح کی پیشانی نورانی سے پانی مثال فیض آسمانی کے اس حوض مایۂ زندگانی میں گرتا ہے اور اس کو لبریز و سرشار کر کے نہر بہشت سے گذرتا ہے۔ وہ وہاں سے ہر طرف اس راحت آباد میں پہنچتا ہے جو نہر کہ دولتخانہ ہائے شاہی میں ایک لخت سنگِ مرمر کی گذری ہے شاہجہان نے

اس کا نام نہر بہشت رکھا تھا اور سراسر اس میں فوارہائے نقرئی نصب تھے اور قلعہ میں کوئی جائے ایسی نہیں کہ اس میں یہ نہر نہیں۔

غرض اس چادر مذکور کے عقب میں برج شمالی یعنی "شاہ برج" کو دیکھا یہ برج اور بروج سے بہت مزین و مرتفع ہے اس کے درجہ اول میں ایک نشیمن ہے تمام سنگِ مرمر ماہ پیکر کا جدول ہائے گل دریا حسین، پرچین کاری رنگ برنگ سے زینت آرا کہ گویا مصورِ قدرت نے ندرت طرازی کی ہے، یا نقاش ازل نے خامہ تقدیر سے لوح محفوظ پر گلکاری کی ہے اور اس کے طاق و محراب غربی میں ایک آبشارِ مرصع کاری سے آب خوشگوار جاری ہے اور اس کے نیچے حوض ہے بشکل بیضاوی ایک دانہ سیپ کا یا پرچین کاری عقیق و مرجان اور اس کے آگے ایک چھوٹی سی نہر سنگِ مرمر کی ہے اور اس کے آگے ایک اور حوض مثمن ہے اور اس کے ہر گوشہ پر فوارے چھوٹتے ہیں۔ اس سے پیشتر ایک اور نہر خورد ہے کہ اس میں سے پانی نکل کر دریا میں گرتا ہے۔

اِس محراب میں بھی طاقچہ ہائے گلدان واسطے شمع و گلدستہ ہائے طلائی کے رکھتے ہیں اور اس کے سقفِ گنبددار میں تمام خوردہ ہائے آبگینہ حلبی خانہ طلائی میں مرصع کئے ہیں اور اس منزل عالی کے دو چشمہ سمت شرقی میں سیرگاہِ دریا ہیں اور ایوانِ جنوبی سے موتی محل کو جاتے ہیں اور مغربی سے زینہ بالائی درجہ دوئم اور راستہ باغ مشہور بباغیچہ مرزا جہانگیر کا ہے۔

چند زینوں کے بعد ایک ایوان سنگِ سرخ کا ہے کہ اس میں دیوار باغِ حیات بخش اور برج قلعہ اور فصیل شہر کے اوپر سے آتی ہے اور متصل کنگرہ حصار کے شتر گلو ہے کہ اس میں سے پانی اُبل کے بالا بالا ایوان مذکور تک آتا ہے۔ وہاں ہر طرف چشمیں اور خزانے بنے ہوئے ہیں اس جگہ سے ہر جانب پانی تقسیم ہوتا ہے اور اس سے چند زینے بالاتر برابر کنگرہ قلعہ کے، دورِ فصیل حصار ہے اور نیچے اس سقف کے تمام ایوان مجحر ہائے سنگِ سُرخ واقع ہیں اس سے چند زینہ بلند ایک نشیمن مثمن نہایت

ہوادار و پاکیزہ با سقف قالبی اور چشمہ ہائے ہشت گانہ، جامِ جہاں نما سے ہم چشمی کرتا ہے۔

روبرو اس کے دریائے جمن آئینہ داری کرتا ہے قطر اس نشیمن بہشت کا ہشت در ہشت گز اور عرض غلام گردش بقدرِ دو گز اور سمت غربی میں صحن بھی ہے مگر مختصر اور طبقہ سوم پر ایک برج قایم ستون ہشت گانہ پر اور بیچ میں اس کے چبوترہ ہے تمام سنگین و پہنا ور اور بنگلہ اس کا یک لخت سنگِ مرمر کا ہے کہتے ہیں اس برج کی خوبی وارتقاع کو کوئی مقام قلعہ مبارک کا نہیں پہنچتا۔

اگرچہ اس کے جواب میں برج جنوبی واقع ہے مگر اس کے حسن کی برابری نہیں کر سکتا۔

بالفعل اس برج میں نیرِ سپہرِ خلافت اخترِ آسمانِ سلطنت صاحب عالم و عالمیان مرشد زادہ جہان و جہانیان مرزا محمد فتح الملک شاہ بہادر رہتی ہیں اسی فخر و امتیاز سے وہ برج فلک ہفتم پر قدم رکھتا ہے۔ غرض اس کے پائیں باغ سے رستہ بنیاد کے ڈیوڑھی کو آتا ہے وہاں اکثر مکانات بیگمات و سلاطین کے واقع ہیں۔

اس سے آگے بڑھ کر دستِ راست کو قلعہ سلیم گڑھ ہے کہ وہ قلعہ سلیم شاہ بن شیر شاہ نے اپنے عہد سلطنت میں دریائے جمن پر بنایا تھا اس کے تاریخ جلوس یہ ہے۔

سلطان سلیم شاہ با فر و شکوہ
کز عدلش ظلم در عدم محبوس است
بنشست چو عدل در رہ انصافش
در ملکش ظلم ز آمدن مایوس است
تاریخ جلوسِ سعد او از سرِ ہوش
سامان جلوس میمنت مانوس است

اور یہ تاریخ اس کے فوت کی ہے:

تاریخ سلطان سلیم شاہ کہ از حسن عاقبت
آرام زیر سایۂ عرش خدائے یافت
بودم بفکر سال وفاتش کہ ناگہان
ہاتف بزد نوا کہ بجنات جائے یافت

اور مابین دونوں قلعوں کے ایک پل جہانگیر نے تعمیر کیا ہے اس کی تاریخ یہ ہے:

بحکم بادشاہِ ــــ ہفت کشور
شہنشاہِ بعدل و داد و تدبیر
جہان گیر ابن شاہنشاہ اکبر
کہ شمشیرش جہان را کرد تسخیر
چو ایں پل گشتہ در دہلی مرتب
کہ وصفش را نشاید کرد تحریر
پی تاریخ اتمامش خرد گفت
پلِ شاہنشاہِ دہلی جہانگیر

نیچے قلعہ سلیم گڑھ کے دریائے جمن پر سرکار انگریزی کی طرف سے پل تیار ہوتا ہے درازی اس پل کی یقین ہے کہ بقدر ایک میل کے ہو جائے گی اور یہ پل بطور انگریزی بنتا ہے خلق اللہ کو اس سے کمال راحت و آسایش ہو گی اگرچہ ہم نے قلعہ مبارک کی بہت سیر کی مگر اکثر مکان محل خاص کے اور عماراتِ سمت جنوبی نہیں دیکھے اور جو کچھ کہ لکھا ہے یہ اس کے چہرہ کا خال بھی نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ محمد شاہ کے زمانے تک اس قلعہ کی حیثیت نہیں بگڑی تھی اور عماراتِ خام اور سکونتِ عوام کو اس میں مداخلت نہیں ہوئی تھی۔ حق یہ ہے کہ جب ملک و دولت میں زوال آتا ہے تو سب چیزوں میں اختلال پڑ جاتا ہے۔

بنااِس قلعہ عالی کی عہد دولتِ صاحب قران ثانی شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ میں بتاریخ نہم محرم ۱۰۴۹ھ ہجری کو شروع ہوئی اور ۱۰۵۶ھ ہجری مطابق سال

بستم جلوس میں تمام ہوئی اور کتاب مفتاح التواریخ میں لکھا ہے کہ بتاریخ بست و پنجم یا دوازدہم ذی حجہ ۱۰۴۸ھ (ایک ہزار اڑتالیس ہجری) مطابق سال دوازدہم جلوسِ اقدس شب جمعہ کی پانچ گھڑی رات گئے زیچ معماری استاد احمد حامد کے شروع ہوئی اور چار مہینے اہتمام عزت خاں میں اس کی بنیاد کھدی۔

بعد اس کے دو سال و ایک ماہ اس کی تعمیر حکومت کی نگرانی میں رہی پھر مکرمت خان نے تاریخ بست و چہارم ربیع الاول سال بست و یکم جلوس ۱۰۵۸ھ (ایک ہزار اٹھاون ہجری) میں بصرف پچاس لاکھ روپے کے اتمام کو پہنچائی جس روز یہ مقام فرخ قدوم بادشاہ جمجاہ سے مشرف ہوا تو شاہجہان نے اس میں جشن عالی ترتیب دیا میر یحییٰ کاشی نے یہ تاریخ اس کے اتمام کی نذر گذرانی صلہ میں اس کے خلعت فاخرہ اور پانچ ہزار روپے مرحمت ہوئے تاریخ یہ ہے۔

شد شاہجہاں آباد از شاہ جہاں آباد۔

یہ قلعہ اس زمانے میں قابل دیکھنے کے تھا کہ جب بائیس صوبہ کی آمدنی اس میں آ کے صرف ہوتی تھی اور خلقت اس کی خاک سے زر و جواہر رول لیتی تھی۔

ہم حضرت ظل سبحانی کی زیارت سے مشرف ہوئے عمر شریف حضور اقدس کی قریب ہشتاد سال کے ہو گی شعر و غزل خوب کہتے ہیں علم موسیقی میں نہایت کمال رکھتے ہیں اس عالم پیری میں بندوق بھی خاصی لگاتے ہیں۔ تاریخِ میلاد اُن کی اسم مبارک "ابوظفر" سے مستخرج ہوتی ہے اور یہ تاریخ ان کے جلوس اشرف کی ہوئی ہے۔

ظلِ سبحانی از نشۂ دولتِ بہادر شاہی
شد پُر ز مئی طرب ایاغ دہلی
بنشست تختِ دولتِ روز افزوں
نزہت بفزود در دماغِ دہلی
تاریخ جلوس ان شہ والا قدر
آمد بلبِ خرد "چراغِ دہلی"

اور ان کا سکہ یہ ہے

بسیم وزر زدہ شد سکہ بفضل الٰہ

سراج دین شہ بوظفر بہادر شاہ

یہ اسما ان کے اخلافِ عالی درجات کے ہیں مہین پور سلطنت مرزا محمد دارا بخت علی بخت بہادر دویمی مرزا شاہ رخ بہادر ان دونوں صاحبزادوں نے انتقال فرمایا سیومی مرزا محمد فتح الملک عرف مرزا غلام فخر الدین بہادر چہارم مرزا مغل پنجم مرزا عبد اللہ ششم مرزا قیاش ہفتم مرزا بختاور شاہ نہم مرزا فرخندہ شاہ (متوفی) دہم مرزا محمدی یازدہم مرزا خضر سلطان دوازدہم مرزا جوان بخت

سلسلۂ نسب شریف بندگان حضور کا تا بحضرت امیر تیمور اس طرح پہنچتا ہے

ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ بن حضرت معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی بادشاہ بن محمد شاہ عالم ثانی بن عزیز الدین عالم گیر ثانی بن معز الدین جہاں دار شاہ بن قطب الدین محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول بن ابو المظفر محی الدین عالمگیر بن ابو المظفر شہاب الدین شاہجہاں بن ابو المظفر نور الدین محمد جہانگیر بن ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر بن نصیر الدین محمد ہمایوں بن ظہیر الدین محمد بابر بن عمر شیخ مرزا بن سلطان ابو سعید مرزا بن سلطان محمد مرزا بن سلطان جلال الدین میران شاہ بن امیر تیمور گورکان سوائے ان بادشاہوں کے اولاد بہادر شاہ بن عالمگیر اول میں اور بھی بادشاہ درمیان میں ہوئے ہیں۔

چنانچہ بعد معز الدین جہاں دار شاہ کے محمد فرخ سیر بن عظیم الشان بن بہادر شاہ مذکور اور بعد فرخ سیر کے شمس الدین ابو البرکات رفیع الدرجات بن رفیع الشان بن بہادر شاہ مذکور بعد رفیع الدرجات کے رفیع الدولہ بلقب بشاہجہان برادر رفیع الدرجات بعد ان کے ابو الفتح ناصر الدین محمد شاہ بن جہان شاہ بن بہادر شاہ مزبور بعد محمد شاہ کے مجاہد الدین احمد شاہ بن محمد شاہ بعد احمد شاہ کے عزیز الدین عالمگیر ثانی

چونکہ بسبب استماع اوصاف و مدایح معین الدولہ امین الملک اختصاص یار خان طامس ثیا فلس مٹکف صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی کے راقم بہت مشتاق ملاقات کا تھا یہ دولت بھی حاصل کی اور ان کے اخلاق و اشفاق سے سرمایہ فرحت و انبساط جمع کیا۔

غرض اس شہر کو ہم نے بخوبی دیکھا واقع میں یہ شہر تمام ہندوستان کے شہروں کا دل اور ہر دیار کا کعبہ ہے۔ ہمیشہ سے یہ شہر دار السلطنت خواقین اور قدیم سے اس کا استانہ مسجود سلاطین ہے ہندوستان میں جہاں کہیں شہر خوب اور نامور ہے اسی درخت کا ریشہ ہے اور جو دیار کہ مردم شرفا و رؤساء سے آباد ہے اسی دریا کا چشمہ ہے۔ جس مقام میں زر و جواہر ہے اسی معدن کا فیض عمیم ہے اور جس جگہ علم و ہنر ہے اسی مدرسہ کا درس و تعلیم ہے۔

زبان خاص و عام اِس کے فخر و مباہات پر ناطق ہے اور تحریر کتبِ تواریخ اس کے وصف میں گواہِ صادق ممالک ہند میں "ام البلاد" اسی کو کہتے ہیں اور اقلیم سوم میں "اشرف الامصار" اسی کو سنتے ہیں۔ اس شہر کی تعریف کرنی زیادہ ہے آفتاب کی روشنی کا بیان بیضاعتہ شیر کو شجاع کہنا لاحاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس قطعہ زمین کو ازل سے سعادت بخشی ہے اور روز میثاق اسے برکت عطا کی ہے ہزاروں تاجداروں کی تخت گاہ یہی شہ نشین ہے اور لاکھوں اولیا کی مولد اور مدفن یہی سرزمین ہے علما و فقہائے دار الاسلام اور صلحا و فقرا سے وجہ سعادت انام حکما و اطبا سے تختہ یونان حکام عدالت شعار سے دار الامان امرائے نامدار سے چشمہ فیضان حسن وجاہت میں طبقہ پرستان اہل بصیرت جانتے ہیں کہ خوبی بلدان نہ صرف آسودگی خلقت سے ہے نہ کثرتِ دولت اور بزرگیٔ مدائن نہ فقط وسعت بازار سے ہے نہ بلندی دربار بلکہ انتظام بلاد دین و امنیت سے ہے اور انصاف و عدالت اور حُسنِ دیار اخلاقِ مردم سے ہے اور اوصافِ خلقت۔

جیسا شوق علمِ دین کا اِس شہر میں ہے کہیں نہیں جو پابند صوم و صلوٰۃ کے

یہاں دیکھے کہیں نہیں۔ علمِ حدیث میں اگر اس شہر کو مکّہ معظمہ کہیں تو بجا ہے اور فقہ واصول میں ماوراالنہر سے بہتر سمجھئے تو سزا ہے اور شہروں میں اتنے گھر بھی نہ دیکھے کہ جس قدر یہاں مسجد خورد و کلاں ہیں اور ملک میں اتنے ناظرہ خوان نہیں کہ جتنے یہاں حافظِ قرآن ہیں۔

جو لطف نمازِ عیدین کا شاہجہاں آباد میں ہوتا ہے کسی شہر میں نہیں ہوتا بادشاہ بہت تزک و احتشام سے سوار ہوتے ہیں اور تمام جلوس مع جملہ سلاطین و امراء ہمراہ ہوتے ہیں اور تمام سے تا عیدگاہ برابر میلہ رہتا ہے قریب لاکھ آدمی کے نماز جماعت میں شامل ہوتا ہے۔

توپیں اور زنبورکین چھوٹتی ہیں بالاخانوں پر ہزاروں آدمی واسطے زیارتِ سواری حضورِ انور کے بیٹھتے ہیں عجب طرح کا جلوہ اور کیفیت ہوتی ہے۔

زبان یہاں کے جہال و عوام کی اور جا کے بعضے خواص سے بہتر ہے اور عقل بھی یہاں کے طفل کی اور مقام کے پیر سے سالم تر۔ عجب زمین مردم خیز ہے۔ باوجود اس زمانہ ناقدردانی کے ہر ایک کو علم و ہنر میں کوشش وسعی ہے۔ انداز ہر شخص کا بہت پسندیدہ و خوش قرین اور پوشاک و لباس ہر متنفس کا نہایت نفیس و دلکش، معلوم ہوا کہ شہر سو برس سے طرح طرح کے حادثات میں مبتلا رہا۔

انواعِ ظلم و جفا سے نشانہ تیر بلا

چناں چہ اول نادر شاہ نے قتل و غارت کر کے دولتِ تیموریہ سے اپنی سلطنت کو زیب و زینت بخشی اور زیادہ اسّی کروڑ روپے کے مال و جنس یہاں سے لے گیا۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے چند بار اس شہر میں جھاڑو پھیری اور کروڑہا روپے کا زر و جواہر لوٹا پھر رہا سہا جاٹوں نے اور مرہٹوں نے برباد و تباہ کیا اور کسی کے پاس ذرا اثاثہ اور سرمایہ نہ چھوڑا۔ اب فقط ایک لاکھ روپے ماہواری بادشاہ کی اس شہر میں رونق و عزت ہے یا متعلقان سرکار انگریزی اور مردم تجارت پیشہ سے۔

اس شہر کے لوگ باوصفِ مفلسی و ناداری کے اپنی وضعداری کو ہاتھ سے نہیں دیتے اور بہ سبب تباہ حالی کے عالم بیکاری و تنگیٔ روزگاری میں بھی اپنی آبرو اور سفید پوشی کو نہیں چھوڑتے۔

بخلاف باشندگانِ راجستھان اور ساکنانِ ملکِ جنوب کے شاہجہاں آباد کے ہندوؤں میں بھی میرزائیت پائی جاتی ہے اور بعضے جوہری اور بنیوں میں بوئے امارت و ریاست نکلتی ہے۔ حسنِ خطاب و انتظامِ کلام ہر وضیع و شریف کی زبان سے مترشح علمِ مجلس و آدابِ صحبت ہر کہ ومہ کے انداز سے واضح۔

ہرچند کہ راقم بعد چند روز کے شاہجہاں آباد میں علیل ہوگیا اور عارضۂ بخار سے تا وقتِ روانگی کمال مشوش و رنجور رہا۔ اس سبب سے ملاقات وہاں کے علما اور اکابر سے متیسر نہ ہوئی اور ان کے فیضِ صحبتِ ظاہری سے دولتِ معنوی نہ حاصل کی مگر مدارج و مراتب سب کے معلوم کیے اور فضائل و معارف ہر ایک کے دریافت ہوئے اگر مناقب و مقامات علمائے دین و فضلائے متقدمین کے کہ جنھوں نے اسی صدی سیزدہم میں بحکم 'کُلُّ مَن علیہا فان' سفر دارالبقا و آخرت اختیار کیا اور حکمِ ربی کو بیان کیے جاویں یا جو کہ بالفعل مدرسہ میں مصروف تعلیم و تلقین ہیں۔ فرداً فرداً ان کے اوصاف لکھے جائیں تو ایک دفتر چاہیے۔ اس واسطے دو چار بزرگوں کے نام کہ فی زمانہ موجب فخر و باعثِ برکت شاہجہاں آباد ہیں۔ ضمناً و تبرکاً اس کتاب میں لکھے جاتے ہیں۔

مولانا شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ محدّث شاہجہاں آباد میں ایسے گذرے ہیں کہ آج تک ہندوستان میں جہاں کہیں کوکب درخشندۂ علمِ حدیث اور تفسیر ہے اسی نور سے پرتو پذیر ہے۔ اب اس دودمان فیض بنیان میں زبدۂ خاصانِ الٰہی پروردۂ انوار نا متناہی فنا فی الحبِ اللہ مولوی مخصوص اللہ صاحب ہیں۔ ان کے علم و عمل سے آسمان والوں کو حیرت ہے اور زمینوں کو سعادت۔

مولانا اسحاق صاحب کے شاگردانِ رشید میں قدوۃ الصالحین مقتدائے راہ دین مولوی محمد قطب علی خاں صاحب ایسے عالم باعمل اور فاضل اجل ہیں کہ انجمن اہل اسلام میں شمعِ ارادت

اور کاشانہ دین متین میں چراغ ہدایت اُنھیں کو کہتے ہیں اور اب فیوضات وعظ و نصیحت اور بیان تفسیر و حدیث بجائے مولانائے مغفور انہیں سے جاری ہے۔ عقدہ ہائے عقائد دینیہ اور مشکلات مسائل شرعیہ وہی حل کرتے ہیں۔

خانقاہ حضرت غلام علی شاہ صاحب میں اخلافِ ابوسعید میں سے پیشوائے اہل شریعت و طریقت، رہنمائے جلوہ حقیقت و معرفت، اصحاب صورت و ملائک سیرت مولوی عبدالغنی صاحب ہیں کہ ان کے علم کو ساتھ عمل کے اتحاد روحانی ہے اور ان کے آئینہ ظاہر کو جلائے باطن سے رابطہ جسمانی، توکل ان کے صدق اعتقاد سے توام ہے اور قناعت ان کی ہمت عالی سے مستحکم، آفتاب آسمانِ فضل و کمال، مہر سپہر افکار و اعمال و منقول و معقول کے عقدوں کو حل کرنے والے اور فقہ و اصول کے اسرار و رموز کے نکتہ شناس۔

حکمت الٰہی کے محقق مسائل ریاضی و طبعی امام العلماء عمدۃ الفضلاء علامۂ عصر سرچشمۂ فیض مولانا محمد صدرالدین خان بہادر صدرالصدور کہ عربیوں کو ان کی فصاحت و بلاغت سے افتخار اور عجمیوں کو ان کی نظم و نثر سے اعتبار، باوجود ہجوم کار احکام محکمۂ عدالت کہ وہ بھی سعادت و عبادت سے خالی نہیں۔ ہمیشہ درس و تدریس طلبائے تفسیر و حدیث میں مصروف رہتے ہیں۔ زاداللہ مجدہم و شرفہم۔

مولوی نصیرالدین صاحب اور مولوی محبوب علی صاحب اور مولوی نظیر حسین صاحب، یہ تمام علما علم و فضل اور تقویٰ و طہارت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اور شب و روز سوائے عبادت و ریاضت اور تعلیم و موعظت کے اور کوئی کام نہیں کرتے۔ الحمدللہ کہ شاہجہاں آباد کا کوئی کوچہ حافظ و مولوی سے خالی نہ پایا اور کوئی بھی گھر بے نمازی نہ دیکھا۔

حکما

حکما اطبا بھی اس شہر میں یونان سے زیادہ ہیں۔ اگرچہ حکمائے نامور اور اطبائے حاذق مثل حکیم شریف خان اور حکیم ذکاءاللہ خاں اور صادق علی خاں اور عزیز اللہ خان اور اشرف خان اور قطب الدین خاں اور منور خاں رکن الدین خاں اور شرف الدین خاں اور حکیم حسن بخش

حکیم نجف بخش وغیرہ، کہ ہر ایک اپنے فن میں بوعلی و فارابی تھا۔ اسی قرن میں مطلب حیات سے دار الشفاء ممات کو نقل کر گئے۔

در بیولا شاہجہاں آباد میں سرآمد حکما اور عمدۂ اطبا ارسطو زماں افلاطون دوراں حکیم امام الدین خاں صاحب ہیں۔ کہ سوائے علم طب کے جمیع علوم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں اور اس زمانے میں سقراط اور بقراط پر فوق لے جاتے ہیں۔ اور دوسرے سر دفتر مجموعۂ حکمت سرلوح نسخۂ حذاقت احترام الدولہ عمدۃ الحکماء حاذق الزماں حکیم احسن اللہ خاں معالج بادشاہی ہیں کہ سوائے تکمیل علم طبابت اور رتبۂ جلیلہ امارت کے بہت سے صفات حسنہ اور اخلاق عالیہ سے متصف ہیں۔ راقم نے ان کی ملاقات سے سرور وافر حاصل کیا اور ان کے نسخہ سے بھی بہرہ مند ہوا۔

تیسری کامل الفضیلت حکیم نصر اللہ خاں کہ شفا ان کے دست کی پروردہ ہے۔ اور صحت ان کی روبرو دست بستہ اور چوتھے عالم علم ظاہری و باطنی۔ خلاصہ خاندان نبوی سید میر فیض علی کہ ان کا نسخہ زوال عوارض میں نہایت کافی ہے اور دوا ان کی ازالۂ امراض میں شافی۔ پانچویں وسیلۂ صحت و شفاء باعث تقویت ضعفاء و مرضی عیسیٰ۔ مسیحائے دوراں ارسطوئے زمان حکیم غلام نجف خاں کہ ان کا نسخہ سرلوح قانون حکمت ہوتا ہے اور مداوا ان کا دستور العلاج حذاقت خدائے تعالیٰ نے عالم اسباب میں ان کو بہت فضل و کمال بخشا ہے اور مزاج میں بھی نہایت اعتدال عطا کیا ہے۔ ورعیسیٰ دم معجز قدم اعجاز الدولہ دوران بقراط عصر حکیم عبد الحق خان خلف حکیم حسن بخش خاں ہیں۔ ان کی بھی ذکاوت طبعی اور ذہانت خلقی کا جہان میں شہرہ ہے۔ اخلاق حمیدہ و آثار برگزیدہ سے موصوف ہیں۔ سوائے خدمت بارگاہ بادشاہی کے انتظام سرکار رئیس بلب گڑھ بھی انھیں کو تفویض ہے۔ شاہجہاں آباد میں بہت طبیب تجربہ کار مسیح کردار رہتے ہیں۔ کہ اگر فقط ان کے نام نامی کی فہرست لکھی جائے تو یہ کتاب ناتمام رہ جاوے۔ سوائے طبیبوں کے ہر عطار کو یہہ ملکہ ہے کہ اپنی دکان پر بیٹھا مطب کرتا ہے۔

شاعر

شاہجہاں آباد میں شعرا بھی بہت ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے اندازِ خوش بیانی اور طرزِ شیریں کلامی میں ہلالی و زلالی اور فیضی و عرفی ہے۔ مگر میرزا اسد اللہ خاں غالب عرف میرزا نوشہ کمال سخنوری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کا ہر مصرع مصرعۂ ہلال نہ آسمان سے بلند تر ہے اور ہر بیت بیتِ ابروی خوبان سے خوب تر، معانی دقیق گویا تنگی، دہان غنچہ دہناں اور مضمون باریک، میاں نازک زباناں خیالات میرزا جلال ان کے دامِ زلفِ خیال بندی میں سراپا اسیر اور معانی بلند پروازِ بیدل ان کی نظم مسلسل میں پابہ زنجیر، نزگہ بار نصیرائے ہمدانی، ان کی عبارت پُر لبشارت کے آگے معترف ہمدانی چار عنصر میرزا بیدل ان کے فقرات موزوں۔ کے روبرو نامعتدل، انشا، وحید و ابوالفضل ان کے رفعات بے بدل کے مقابل متبذل یہ شعرا تھیں کے ہیں۔

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

دل جگر تشنۂ فریاد آیا
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ولہ
ترے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

ولہ
دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک، ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

ولہ
ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

ولہ
یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ گھر میں آئے ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ساقی بادۂ لطف مضمون و معانی پیمانہ پیمائے خمخانہ شیرازی و اصفہانی نشہ افزائی سخن پیرائی مولوی شیخ امام بخش صہبائی کہ عالم علم زبان فارسی اور استاد صنایع و بدایع شعری شاہجہاں آباد دہلی ہیں اور اہل دانش و استعداد ان کی تصنیفات فیض آیات اور شروح و منشیات کو حرز جان کرتے ہیں۔ ان کے گلہائے طبیعت معطر ساز دماغ نکتہ سنجاں اُن کے سخن راحت پیرائے خاطر معنی شناساں، باوجود مدرسی کے تصنیفات بھی چلی جاتی ہیں۔

تاجدار کشور معنی پروری مقرب پائے تخت خسروی شیخ ابراہیم ذوق دہلوی اساتذائے متقدمین پر بھی فائق ہیں اور ہر دیار کی سخن شناس ان کے اشعار آبدار کے ہمیشہ شائق انھوں نے کلام اردو کو ایسا قالب فصاحت میں ڈھالا ہے کہ رتبہ ہندوستان کا اب ایران سے دوبالا ہے۔ واقع میں زبان ہندی سے لطف فارسی بھلا دیا ہے۔ اگر عنصری

عسجدی کو ان کے قصائد غرا کے مضمون بلند نصیب ہوتے تو ایازی سلطان محمود سبکتگین اکیا کرتے، اگر سعدی و حافظ ان کی غزلیں شیراز میں سنتے تو شوق فارسی چھوڑ کے ذوق ہندی اختیار کرتے۔ صاف بیانی اور محاورہ کوئی ان کے اشعار کی خاص و عام اور رعایت معنوی اور مناسبت لفظی ان کی گفتار پر ختم، ان کی اصلاح سے سینکڑوں شاگردوں کی غزلیات کی تدوین ہو گئی اگر یہ اپنا خاص دیوان جمع کرتے تو سو جلد سے کم نہ ہوتی۔ یہ چند ریزہ جواہر انھیں کے معدن سے اس کتاب مرصع میں ترصیع کیے گئے ہیں۔

سر بوقتِ ذبح اپنا اُس کے زیر پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

ہاں مددِ طاقت کہے ہے ضعف سے سینہ میں دم
دیکھیے لب تک خدا کیونکر مجھے پہنچائے ہے

واہ وا شورِ محبت خوب ہے چھڑکا نمک
استخوان میرے ہما کس کس مزے سے کھائے ہے

بس کر اے سوزِ دروں کھُن جائیں گے دل اور جگر
رحم جوشِ گریہ پھر چھاتی مری بھرائے ہے

نزع میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جانبِ در دیکھتا ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

ولہ تیرے کوچہ کو وہ بیمارِ غم دار الشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

نگہ کیا اور غمزہ کیا ہم دونوں کو بلا سمجھے
اسے تیرِ قضا اس کو پر تیرِ قضا سمجھے

ولہ بعد مردن بھی خیالِ چشمِ فتاں ہی رہا
سبزۂ تربت مرا وقفِ غزالاں ہی رہا

میں ہمیشہ عاشقِ پیچیدہ مویاں ہی رہا
خاک سے روئیدہ میرے عشقِ پیچاں ہی رہا

ولہ موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو
غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

کہتے ہیں شورِ قیامت جس کو وہ اے چشمِ یار
تیرے مستوں کی صفیرِ خوابِ غفلت ہو تو ہو

ولہ شوقِ نظارہ ہے جب سے اس رخِ پر نور کا
ہے مرا مرغِ نظر پروانہ شمعِ طور کا

گر لکھوں مضمون اپنے نالۂ پر شور کا
لوں صریرِ خامہ سے میں کام بانگِ صور کا

امراء

شاہجہاں آباد میں امرائے قدیم بادشاہی بہت ہیں مگر معاشش بموجب ان کے نام و نشان کے ہرگز نہیں۔ اور جو لوگ کہ کچھ تھوڑی جاگیر و جائداد رکھتے ہیں۔ البتہ فی الجملہ آسودہ ہیں مگر ایسا کوئی نہیں کہ جس کی سرکار میں ہزار یا پانسو آدمی متعلق ہوں یا اس سے غربا کو فیض یا خیر پہنچتی ہو۔ امرائے اکبر شاہی میں تعلیف بخشی محمود خاں نواب محمد میر خان حسام الدین حیدر خان نواب خادم حسین خاں، راجہ شیر سنگھ، راجہ کیدار ناتھ، راجہ جے سکھ رائے وغیرہ کی بہت سنی۔ یہ سب امیر انتقال کر گئے۔ ان کے اخلاف بااوصاف موجود ہیں۔ لیکن ان کی سی لیاقت و فضیلت ایک میں بھی نہیں پائی جاتی۔ اِلّا نواب مصطفیٰ خان اپنے خاندان میں مثالِ آفتاب پیدا ہوئے ہیں اور اپنے پدر بزرگوار سے فضل و کمال میں مراتب شرف رکھتے ہیں۔

میرزا مغل بیگ خاں صاحب سے اتفاق ملاقات کا ہوا۔ قدمائے شاہجہاں آباد میں سے ہیں اور دینداری و وضعداری میں منتخب، اور نواب فتح اللہ بیگ خاں صاحب بہت بزرگ و قابل ہیں اور نواب امین الدین خاں صاحب خلف نواب احمد بخش خان بہادر مغفور سے ملاقات ہوئی۔ اُن کی سی کسی امیرزادہ میں فضیلت و لیاقت نہ دیکھی۔ عقل و دانش میں بہت درست اور تقریر و تحریر میں نہایت چست، مگر نازک مزاجی بھی ان کی مشہور ہے اور صفت غضب معروف۔

سنا کہ بھائی ان کے نواب ضیاء الدین احمد خان بہت سلیم الطبع حلیم المزاج ہیں اور استعداد علم و فضل میں شہرۂ آفاق، شعر و اشعار اور تالیف و تصنیف بھی ان کا خاص شغف ہے۔ بہر حال یہاں کی خلقت تعریف ان کی بہت کرتی ہے۔ اور نواب غلام حسین خاں خلف نواب فیض اللہ بیگ خاں مرحوم سے بھی ملاقات ہوئی۔ بہت بے نفس و وسیع الاخلاق اور امیر درویش صفت ہیں۔ اپنی طبیعت پر نہایت ضبط رکھتے ہیں۔ چالیس برس ستار نوازی میں ید طولیٰ بہم پہنچایا اور پردہ زمین پر اپنی استادی کو بلند آوازہ کیا۔ کئی سال سے دفعتاً اس شوق کو ترک کر دیا ہے۔

نواب وحید الدین خاں سے حسرت ملاقات رہی۔ نہایت مرد بزرگ اور شخص مدبر ہیں۔ اور لائق وزارت وسفارتِ ملوک سلاطین۔

قدیم سے ان کا خاندان امارت وشرافت میں مشتہر ہے اور ذہانت وقابلیت میں مفتخر اور بھائی ان کے زین العابدین خان علم حکمت و ریاضی میں اپنے زمانے کے اقلیدس و فیثاغورس ہیں۔ ان کے بھی فضائل وکمالات کا انسان ہندوستان میں نہیں ہے شاہجہاں آباد زمرہ مہاجنان ذوی الاقتدار اور ساہوکاران ذی اعتبار سے لالہ رام جی داس راقم سے ملاقی ہوئے ان کے اوصاف واخلاق بیان سے باہر ہیں اور ان کی انسانیت ووضعداری ہر امیر وغریب پر ظاہر۔ ہندوؤں میں اس روش وڈھنگ کا آدمی نہیں دیکھنے میں آیا۔

انعام اللہ خاں اور عظیم اللہ خاں برادران منشی امان اللہ خاں اور خواجہ شمس الدین خاں عرف مرزا خواجہ جان شاہجہاں آباد صاحب اخلاق کم دیکھنے میں آئے۔ کمال صاحب لیاقت اور جوانان رشید ہیں اور یار باشی اور دوست نوازی میں ہر ایک وحید عصر اور یکتائے دہر ہے خواجہ موصوف سوائے استعداد علم ضروری کے علم موسیقی اور ستار نوازی میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ اور اپنا حظ روحانی اور لطفِ زندگانی خوب اٹھاتے ہیں۔ یہ سب بزرگانِ موصوف راقم پر کمال لطف مہربانی فرماتے تھے۔

شاہجہاں آباد میں اگرچہ ہزاروں اہل کمال اور صناعان بے مثال ہر علم وفنون کے رہتے ہیں۔ مگر یہ چند شخص روئے زمین پر اپنا عدیل ونظیر نہیں رکھتے۔ اول سید امیر خوشنویس کہ خطاطان ایران وطوران ان کو خط غلامی لکھتے ہیں اور جواہر رقم خاں انھیں کے فیض قلم سے خوشنویس کہلاتے ہیں۔ اگر امیر عماد ہوتا تو ان کے دائرے کے گرد پرکار وار پھرتا۔ اور اگر میر علی ان کا ایک نقطہ پاتا تو بجائے سویدا اپنی دل میں رکھتا۔

دوسرے غلام علی خاں مصور ہیں کہ ان کے روبرو نقاشان چین اور صورت گرانِ فرنگ دنگ رہتے ہیں۔ اگر لوح بناتے ہیں تو لوحِ محفوظ سے خبر دیتی ہے

تیسرے بدر الدین علی خاں وحید العصر مرصع رقم صنعت مہرکنی میں یکتا ہیں اور اس فن میں بے ہمتا ہوا ہیر اصفہان اور کشمیر کو ان کی مہروں کے سامنے مہر و سہا اور مطبوعات

شاہجہانی وجہانگیری ان کے نمونوں کے روبرو محض بدخط و بے معنی۔

چوتھے قاری محمد علی ہیں کہ سوائے تحصیلِ علوم ضروری اور تکمیل انشا و خوشنویسی کے لطائف و ظرائف اور صلح وجنگ ذو معنی میں انتخاب ہیں اور بذلہ سنجی و حاضر جوابی میں لاجواب ان کا ثانی بھی ہندوستان میں دوسرا نہ دیکھا اور جو دیکھا تو ان سے ادنیٰ تھا۔ اس شہر میں ارباب طرب اگرچہ بہت ہیں۔ مگر بالفعل مردوزن میں کوئی نامور گانے والا نہ سُنا۔ اور اگلے زمانے کا کچھ بیان نہیں کیا جاتا۔ البتہ سلطانوں طوائف ٹپہ خیال اچھا گاتی ہے۔

اگر شاہجہاں آباد کی شیرینیوں کا بیان کیا جاوے تو زبان شاخِ نبات اور دہن کوزہ مصری ہو جاوے۔ فواکہات ہر قسم کے وہاں ملتے ہیں اور میوے ولایت کے بھی اکثر وہاں بکتے ہیں۔

سُنا کہ آب و ہوا شاہجہاں آباد کی سو برس پیشتر بہت خوب تھی اب خراب ہو گئی ہے اور گرمی نہایت شدت سے ہوتی ہے۔ بغیر خس کی ٹٹیوں کے فصل تابستان نہیں گزرتی۔

مزارات اولیائے کرام دہلی کہنہ

بعد سیر و تماشائے شہر کے ارادہ زیارات کا اور دہلی کہنہ کے دیکھنے کا ہوا تو اول احرام طوافِ حریم حرم تعظیم اور خاک پاک قبرستان نبی کریم (قدم شریف) کا باندھا۔ سوار ہو کر لاہوری دروازے سے باہر نکلے تو دستِ راست کو چھاؤنی کی سڑک اور فریزر صاحب کی کوٹھی ہے واقع سوئے۔ پشت کوہ کے بہت پر فضا و مرتفع ہے۔ شہر باوجود ایک کوس کے فاصلے کے پیش نظر رہتا ہے اور میدان چھاؤنی انگریزی کا باوصف بُعد مسافت کے اس کا صحن معلوم ہوتا ہے اور تمام باغات و کشت زار اس نواح کے گویا اسی کے گلستان سرزمیں۔ اور دریائے جمن اس سے بہت بُعد رکھتا ہے لیکن اسی کے زیر پا ہے۔ اس کو بالفعل مہاراجہ ہندوراؤ نے مول لے لیا ہے۔ اور اکثر اس میں رہتے ہیں

ان کے باڑہ اور عملے کا مکان قریب اُس کے کچھ فاصلے پر علیحدہ ہے۔ اور چھاؤنی اگرچہ بہت بڑی ہے۔ مگر اس میں کچھ رونق و آبادی نہیں ہے اور سبزی منڈی بھی وہیں ہے کہ اس میں تمام باغات کے میوے آکے جمع ہوتے ہیں اور میوہ فروش وہاں سے لے کے شہر میں بیچتے ہیں اور اکثر باغہائے قدیم بادشاہی وغیرہ اسی طرف بہت ہیں۔

امحاذی لاہوری دروازہ کے عیدگاہ کہنہ شاہجہانی اور اس سے پرے کو عیدگاہ ثانی ہے۔ اُس کو عالمگیر نے تعمیر کیا ہے۔ بالفعل نماز عیدین اس میں ہوتی ہے

حضرت خواجہ باقی باللہؒ

اثنائے راہ میں مزار حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب قدس سرہٗ العزیز کا ملتا ہے۔ زیارت بھی بہت متبرک و نورانی ہے۔ یہ بزرگ خاندانِ عالی شان سادات اور سلسلۂ نقشبندیہ میں کاملینِ ہیں۔ اگرچہ ان کی کرامات متجاوز البیان ہیں۔ مگر ایک تصرّف ان کا صریح ظاہر ہے کہ چبوترہ ان کے مزار شریف کا بالکل سنگین ہے اور بے سایہ ہے کہ سنگ ہمیشہ تابشِ آفتاب سے مثل لو ہے کے ہو جاتا ہے اور چبوترہ عین تابستان میں مانند تختہ یخ کے سرد ہوتا ہے۔ یہ تاریخ دروازہ جنوبی پر منقوش ہے۔

نظم خواجہ باقی آں امامِ اولیا
عارفِ باللہ اسرار نہفت
نکہتِ بستاں سرائے انبیاء
از نہالِ جعفری خوش گل شگفت

"سال تاریخ وصالش خسرو نے، فی البدیہہ نقشبندِ وقت گفت" اور یہ کتابہ ان کے بالیں مزار مبارک پر مرقوم ہے:

قبلۂ اربابِ معنی کعبہ اصحابِ دیں
مظہرِ فیض الٰہی صاحبِ علم یقیں
نور پیچوں بر جبینش تافت از حق الیقین
شد زمین نیتش روشن قلوب المومنین
کی توانم گفت مدحِ آں خلاصہ واصلیں
ہست ذاتِ خواجہ باقیؒ رحمتہ اللعٰلمین
چوں کمالش وصل دایم بود و معنی دلنشیں
شد وصال غیب او آخر بسال اربعیں

دال ز ہجرت لبعد الفِ اثنا عشر بودہ ستین
از وفاتِ قطبِ دوراں تکیہ گاہِ مسلمین
ہر کہ آید بر مزارش از سر صدق و یقین
حاجتش گردد روا ہم مقصد دنیا و دین

قبر شاہ نظام الدین صوبہ دہلی کی بھی وہیں ہے اور برابر اس کے ایک مسجد ہے ستون اور مرغولی اس کے تمام سنگ ابری کے لگائے ہیں

قدم شریف

بعد اس زیارت کے تھوڑی دور پہ درگاہِ قدم فیض توام ہے۔ وہاں پہنچے تو ایک قلعۂ قدیم دیکھا کہ وہاں خدام لوگوں کی بستی ہے اور اس کے اندر ایک مسجد ہے اور جنوب رویہ اس کے ایک مقام بلند و متبرک بعمارتِ سنگین بطور ایوان سلاطین افاغنہ بنا ہے اور بیچ میں ایک حرم مُدوّر ہے اور اس کے اندر ایک چبوترہ سنگ مرمر ہے اور اُس میں تعویذ قبر مثل حوض مرتب ہے۔ اس کے بیچ میں تختہ سنگ قدم شریف رکھا ہوا ہے اور اس پر تمام نقش پائے مبارک نمایاں ہے۔ اس میں پانی اور پھول اور کبھی دودھ شربت لبالب ہوتا ہے اس میں سے مجاورین بطریق تبرک کے زائرین کو عطا کرتے ہیں۔ حقیقت میں حوض کوثر اس حوض سعادت منظر کا ایک قطرہ ہے اور چشمۂ حیواں اس چشمۂ کرامت کا ایک رشحہ۔

یہ قدم شریف معجزات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت صحیح و سندی ہے۔ اس کو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت خلیفہ مکہ سے لے کر ہندوستان عہد فیروز شاہ میں آئے تھے۔ اور مکہ سے دہلی تک اپنے سر پر رکھ کر لائے تھے۔ حالات سلطان فیروز شاہ میں منقول ہے کہ یہ بادشاہ بڑا دیندار تھا اور علماء و فقراء سے نہایت عقیدت و ارادت رکھتا تھا۔ چنانچہ تفصیل اس کی خیر جاریہ کی کتب تاریخ میں اسی طرح لکھی ہے۔

اپنے زمانہ سلطنت یعنی مدت اڑتیس برس چند ماہ میں چالیس مسجدیں اور تیس مدرسے اور بیس خانقاہ اور دو رباط شہر تیس اور حوض ایک سو اور بند آب چالیس اور کوشک ایک سو، چاہ

ڈیڑھ سو حمام دس، دارالشفا پانچ، منارے دس، مقبرے سو، پل ڈیڑھ سو اور باغات بیحد و بے شمار بنائے تھے۔

جبکہ اس نے خبر حضرت مخدوم کے آنے کی سُنی تو استقبال کو حاضر ہوا اور قدم مبارک کو اپنے سر پر رکھ کر شہر میں لایا اور حضرت مخدوم کی خدمت سے سعادت دنیا و آخرت حاصل کی۔ بعد تھوڑے دنوں کے شاہزادہ فتح خان بن فیروز شاہ ثانی ۷۷۵ھ میں انتقال کیا۔ وہ نقش قدم اشرف اُس کی تربت متبرک پر رکھا گیا۔ اس کٹہرے کے گرد یہ کندہ ہے۔

تاریخ

چو یوسف در قدم گاہے محمد
محجّر را بتوفیق خدا ساخت
پے "تاریخ اتمام بنائش
شنیدم تفے گفتا بجا ساخت

اور یہ شعر بھی کندہ ہے:

برزمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

پیشانی دروازہ پر یہ شعر مرقوم ہے:

تاریخ

گشتیم سرافراز چو با یک قدم شریف
تاریخ ہم بر آمدہ با یک قدم شریف

اب وہ زیارت گاہِ خاص و عام ہے اور ہر سال ماہ ربیع الاول میں بارہ دن تک وہاں میلہ رہتا ہے اور دور دور کے درویش و فقراء وہاں آ کے آستانہ بوس ہوتے ہیں اور اکثر علماء و مشائخ وہاں جا کے مشرف زیارت ہوتے ہیں۔ یہ بھی دہلی کے واسطے اور شہروں پر بڑا موجب شرف ہے کہ یہ مکان سعادت نشان تشریف مقدم خیر البشر سے قدم چرخ اخضر رکھتا ہے بلکہ یہ وہ نقش پا ہے کہ عرش بھی اس کے نیچے فرش ہونے کو اپنا فخر جانتا ہے۔

درگاہ حضرت سلطان المشائخ

بعد سرفرازی حاصل کرنے زیارت آستانہ قدم رسول کے ارادہ خاک بوسی مزار سلطان المشائخ قدوۃ الاولیا نظام الملتہ والدین حضرت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کا ہوا۔ اجمیری دروازہ کے پاس سنگ مرمر کا چبوترہ اور قبر نواب قمر الدین خاں وزیر کی دیکھی اور مسجد و مدرسہ غازی الدین خاں کا مشاہدہ کیا۔ پہلے اس میں مدرسہ سرکاری تھا اور طالبانِ علم فارسی اور عربی اور زبان ہندی و انگریزی رہتے تھے۔ بالفعل اس میں دار الشفائے سرکار کی طرف سے طبیب یونانی اور دواخانہ معیّن ہے۔ اندر کی طرف دروازہ کی پشت دیوار پر لوح سنگ مرمر پہ یہ عبارت کندہ ہے۔

نہ بر لوح نقشے بماند و لیک
جزائے عمل مانَد و نام نیک

"در بیاد حسنات نواب اعتماد الدولہ ضیاء الملک سید فضل علی خاں بہادر سہراب جنگ کہ یک لکھ ہفتاد ہزار روپے برائے ترقی علوم در مدرسہ ہذا واقع دہلی خاص مولد و موطن خویش بصاحبان کمپنی انگریز بہادر تفویض نمودند منقوش گردید در ۱۸۴۹ء کتبہ سید محمد امیر رضوی" اس سے آگے جبکہ دہلی دروازہ کے پاس آئے توجیل خانہ اور پاگل خانہ سرکاری واقع ہے اور ایک بڑا قلعہ وسیع ہے اس میں بند ہوئے رہتے ہیں اور دوسری طرف ایک مکان عمدہ ہے۔ اس کے حجروں میں دیوانے اور مجنوں محبوس ہیں ان کا بھی علاج و معالجہ سرکار کی طرف سے ہوتا ہے۔

کوٹلہ فیروز شاہ

فیروز شاہ کا کوٹلہ مشہور ہے۔ عمارت اس کی تمام گر پڑی ہے۔ بہ سبب واقع ہونے لبِ دریا کے عجب پرفضا و باکیفیت ہوگا اور اس کے اندر تہہ خانوں کا حال بہت عجائب و غرائب بیان کرتے ہیں۔

چنانچہ اکثر بعضے نکبت زدہ وہلاکت رسیدہ واسطے طمع نفسانی کے ان تہہ خانوں کے

اندر مشعلیں جلا کر گئے ہیں اور آخر وہاں کی بلیات و آفات سے جان کو سلامت نہیں لا سکے اور جو کوئی دس میں سے ایک زندہ بھی رہا تو وہ بیان کرتا ہے کہ جب ہم اُس کے اندر پہنچے تو دیکھا کہ اس کے ہر طاق میں رنگ برنگ کے سانپ بیٹھے ہیں اور شہتیر سقف میں زنجیروں سے کئی کڑھاؤ پر از اشرفی ہائے بزرگ لٹکتے ہیں اور ایک چھوٹا سا سانپ برنگ طلا ان کڑھاؤ میں کھیل رہا ہے۔ لوگوں نے چاہا کہ اس سانپ کو مار ڈالے اور گٹھڑی اشرفیوں کی باندھ کر لے چلیے۔ جب حربہ لے کے نزدیک پہنچے تو اس سانپ نے ایک فشکار ماری کہ سب کے سب پانی ہو کے بہہ گئے ایک آواز ہیبت ناک پیدا ہوئی کہ رستم بھی ہوتا تو اُس کا زہرہ آب ہو جاتا، میں کہ سب سے پیچھے تھا اور ان کی جرأت و جسارت میں شامل نہیں ہوا تھا۔ اس فشکار مسموم سے محفوظ رہا۔ اور ایک شخص مہیب و عفریت صورت نے مجھ کو کہا کہ بھاگ نہیں تو بھی ہلاک ہو جائے گا۔ میں وہاں سے بدحواس ہو کر بھاگا تو اثنائے راہ میں زینہ پر ایک روپیہ پڑا دیکھا۔ میں نے اُس کو اٹھا لیا اور باہر آ کے دیکھا تو پچیس روپیہ کے وزن کا ایک روپیہ نکلا اور اس وقت اپنی سلامتی جان کا شکر ادا کیا اور اس روپے کو صرف میں لایا

اس کوٹلے میں ایک لاٹ نصب ہے اُس کو بھی عجائبات عالم بیان کرتے ہیں ایک سنگ سے تراشی ہے طول اُس کا اڑتالیس فٹ اور سیطری اُس کے بیخ کی دس فٹ اور جس قدر زمین سے بلند ہے اُسی قدر زمین کے اندر ہے۔ ایسا بیان کرتے ہیں کہ یہ دو لاٹیں کوہ سوالک میں راجگان ہنود کے زمانہ سے پڑی تھیں اور اعتقاد ہنود میں ایسا تھا کہ یہ ہمارے اوتاروں کی چوبدستی تھیں اور گاؤ چرائی کیا کرتی تھی اور جس دن یہ ٹوٹ جائیں گی قیامت آ جائے گی۔ فیروز شاہ نے اس خیال کو باطل جان کے ایک کو توڑ ڈالا اور دوسری کو یہاں نصب کر دیا۔ اس پر کچھ حروف بھی کندہ ہیں مگر پڑھے نہیں جاتے

فیروز شاہ

فیروز شاہ کا حال ایسا لکھتے ہیں کہ فیروز شاہ بن سالار رجب برادر زادہ محمد بن تغلق پچاس برس کی عمر میں ۷۵۲ھ سات سو باون میں تخت دہلی پر بیٹھا۔ خدیم اسلام اُس کی

تاریخ جلوس ہے۔ اول دہلی میں نہر وہی لایا اور شہر جونپور ۷۷۲ھ سات سو بہتر ہجری میں فخر الدین جوناں خاں اپنے چچا کے نام پر آباد کیا۔ عددِ شہرِ جونپور سے تاریخ بنائے جون پور متخرج ہوتی ہے۔

فیروز شاہ دہ نے تاریخ اٹھارہویں رمضان ۷۹۰ھ سات سو نوّے میں وفات پائی۔

"وفات فیروز" تاریخ وفات فیروز شاہ ہے۔

وہاں سے آگے بڑھے تو رستہ میں قلعہ کہنہ دیکھا وہ ایک حصار بلند ہے اور نہایت مستحکم۔

نظم

از بلندیش فرق نتواں کرد
آتش دیدبان ز نور زحل

اکثر جا سے اُس کے بروج وفصیل منہدم ہو گئے ہیں اور بالفعل اس کے اندر کچھ دہقان و زمیندار لوگ رہتے ہیں۔

مورخین نے اس قلعہ کا حال الیسا رقم کیا ہے کہ ۴۴۰ھ چار سو چالیس بکرماجیت میں راجہ اننگ پال نے یہاں ایک قلعہ بنایا تھا۔ پھر وہ آفاتِ ارضی سے خراب و ویران ہو گیا بعدہٗ نصیر الدین ہمایوں نے اپنے عہدِ سلطنت میں اس کو از سرِ نو تعمیر کیا اور اس کا نام "دین پناہ" رکھا اور اس کے اندر ایک مسجد سنگ خارا اور سنگِ سُرخ کی بہت خوبصورت و خوش تعمیر بنوائی۔ جبکہ ہمایوں نے حوادثِ روزگار سے شکست کھائی۔ اور شیر شاہ نے ابوابِ خلافت دہلی پر فتح پائی تو اس نے ایک عمارت "جہاں نما" اس قلعہ میں تیار کروائی اور اس کا نام شیر منڈل رکھا۔

دوبارہ اپنے قدوم ہمایوں سے اس قلعہ کو زیب و زینت بخشی تو وہی شیر منڈل ہمایوں کے واسطے شیر بیشۂ اجل ہو گیا۔ ایک روز اس منڈل ماہ کنڈل پر چڑھ کر بہ تقاضائے شوق وسیلۂ دوربین سے سیر طلوع مشتری و شرف زہرہ کرتا تھا۔ اس وقت غروب آفتاب حیات اور ہبوط کوکب عمر اپنے سے کچھ نہ رکھتا تھا۔ بعد فراغت کے قصد اُترنے کا کیا اور درجہ اوسط میں پہنچا کہ مؤذن نے بانگ نماز مغرب کو بلند آوازہ کیا بیٹھ کے اذان کو سُنا اور "اِنّک لاتخلف المیعاد" کہہ کے اس مقامِ محمود سے عصا پر زور دے کے

اُٹھے تھے کہ وہ متحمل بارِ سلطنت نہ ہو سکا۔ پاؤں نے لغزش کی اور بادشاہ اس بامِ فلک مقام سے مانند اخترِ بخت ناکام ۔ عروجِ کمال سے نکبتُ وبال میں گر پڑے ۔ حقیقت وہ مؤذن داعی اجل تھا۔ مقولہ ایسے حالات کے دریافت سے انسان ضعیف البنیان کو لازم ہے کہ دنیائے بے ثبات پر دل بستگی نہ کرے اور ایسے ایسے حقائق گذشتگان سے عبرت پکڑے ۔

جب سلطان محمد بن محمود بن ملک شاہ سلجوقی عارضۂ سل میں شیشۂ حیات کو سنگ ممات سے توڑنے لگا اور تختِ شاہی کو تختِ تابوت سے تبدیل کرنے لگا ۔ امرا و نوکر جواری و غلام اور اموال و اسباب و خزانہ و جواہر اپنے روبرو منگوایا اور اس کو بنظر حسرت ملاحظہ کیا اور بے اختیار رویا اور کہا کہ یہ تمام لشکر و مال اور زر و زیور ایک دم میری ۔ کو زیادہ نہیں کر سکتے اور ایک ساعت پنجہ شاہیں سے میرے مُرغِ جان کو نہیں بچا سکتے ۔ بدبخت ہیں وہ لوگ کہ خاطر جمعیت اسباب دنیا پر مصروف کرتے ہیں ۔ حالانکہ وہ عین تفرقہ ہے

یہ قلعہ شہر سے دو تین کوس کے فاصلے پر واقع ہے ۔ اور اس قلعہ سے بقدر ایک کوس کے درگاہ شریف سلطان المشائخ ہے ۔ ہم وہاں پہنچے اور آستان ملائک آشیاں کی زیارت سے شرف یاب ہوئے

تمام درگاہ فلک بارگاہ کے چار دیواری سنگین بنی ہوئی ہے ۔ جب ہم نے اس کے دروازے میں قدم رکھا تو ایک باؤلی دیکھی ۔ بہت وسیع و عمیق باآب لطیف تمام سنگخارا کی اور گرد اس کے غلام گردش تعمیر محمد شاہ اور اوپر بروج و مقبرے قدیم سلاطین افاغنہ کے بہت بنے ہوئے ہیں ۔ یہ باؤلی خاص حضرت کے عہد کی تعمیر ہے ۔ اور اس کی بنیاد بھی اپنے دستِ مبارک سے رکھ دی تھی "چشمۂ دلکشا" اس کی تاریخ ہے اور جب ان کا عرس و میلہ ہوتا ہے تو اسی باولی پر اکثر خلقت جمع ہوتی ہے اور عجب لطف و کیفیت کی جا ہے لڑکے بلندی سے اس میں کودتے ہیں اور تیرتے ہیں پانی ایسا شفاف ہے کہ جو چیز اس میں گرتی ہے اوپر سے نظر آتی ہے ۔

اس باؤلی سے گزر کے اندر درگاہ مقدس و مطہر کے مشرف ہوئے اور فاتحہ و تکبیر سے ثواب و خوشنودی حاصل کی ۔ سبحان اللہ جیسے وہ سلطان الاولیاء تھے ۔ ویسا ہی ان کا

روضہ بھی سجدہ گاہِ ملائے اعلیٰ ہے۔ فرشِ صحن کا تمام سنگِ مرمر سے محمد شاہ نے ترتیب دیا ہے اور گنبدِ مبارک کے گرد بارہ دری اور سنگِ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ گنبد اور بارہ دری سید فریدون خان نے سنہ ۹ ہجری میں بنائی تھی۔ چنانچہ بالیں تربت پر ایک لوحِ سنگ ہے اور اس پر یہ ابیات کندہ ہیں :

تاریخ

شکر کہ از روضۂ حضرتِ غوث الانام
از پئے تعمیر شد خانِ فلک احتشام
مہرِ نسب را شرف، اوجِ شرف را شہاب
سیدِ عالی نسب، میرِ فلک احترام
بانیِ او ہاشمی، بانیِ او ہاشمی
آنکہ بدورانِ شاہ ہست سخن را نظام
از پئے تاریخِ آں چوں متفکر شدم
کلکِ خرد زد رقم "قبلہ گہِ خاص و عام"
روے بدرگاہِ زد ار فریدوں بصدق
شاید از الطافِ پیر کارِ تو گیرد نظام

(کاتب : حسین احمد چشتی)

پھر سنہ ۱۰۱۷ھ ایک ہزار سترہ میں فرید خان المخاطب بہ مرتضیٰ خان نے ایک چھپر کھٹ چندن کا چڑھایا کہ خوبی میں زر و جواہر سے بہتر ہے اور صنعت و ندرت میں نمونۂ قلمِ قدرت اور اس میں یہ شعر بہ چین کاری صدف سے بہت خوش خط مرقوم ہیں :

قطعہ

شیخ دہلی نظام را و فرید
کارِ دنیا و دیں مہیا کرد
یک فریدش مقامِ فانی داد
یک فریدش مقام احیا کرد

مرتضیٰ خان فرازِ مرقدِ او
قبّۂ چون سپہر برپا کرد
ابرِ فیروزیٔ از جہان برخاست
دُرِّ یک دانہ در صدف جا کرد
بر جہان کعبۂ مربّع او
چار در از چہار حدّ وا کرد
عزّتِ مرقدِ مُبارکِ او
بر زمین کارِ عرشِ اعلیٰ کرد
عرشؔ دریائے چار قائمہ اش
چار تکبیرؔ بے محابا کرد
ہر کہ رُخ از مقامِ او تابید
پشت بر کعبۂ معلّیٰ کرد
وانکہ رُو در سجودِ او آورد
رُخ چو آئینۂ مصفّا کرد
خاکروبِ مقامش ار باشی
می تواں کارِ صد مسیحا کرد
سالِ تاریخِ ایں بنا جستم
"قبّۂ شیخ عقل الفا کرد
قدر بانیٔ او رفیع کند
ہر کہ ایں ہفت سقف خضرا کرد

اور ہر زمانے میں جو امیر با اعتقاد ہوا اُس کی ترمیم و تعمیر کو اپنی سعادت سمجھتا رہا۔ چنانچہ عہدِ شاہجہاں میں نواب شکراللہ خاں نے گرد اس کے غلام گردش سنگ سرخ کی کہ جس کے چاروں طرف بیس درہیں بنوائی اور اس کی محرابوں پر یہ کتبہ مرقوم کیا:

"درعہد اعلیٰ حضرت صاحبقران ثانی اخفر العباد خلیل اللہ خاں بن میر میران الحسینی نعمت اللٰہی کہ حاکم شاہجہاں آباد ایں ایوان را بر در روضہ متبرکہ مرتب نمود۔"

پھر مولانا فخر الدین صاحب نے سنگ مرمر کے ستون اس غلام گردش کے واسطے خریدے ان کو نصب نہ کیا تھا کہ اُنھوں نے انتقال فرمایا۔ پھر نواب احمد بخش خان نے ان ستونوں کو بجائے ستونہائے سنگِ سرخ ایستادہ کے لگائے۔ بعدہٗ فیض اللہ خان بنگش نے سنگ سُرخ کی سقف پر تختہ ہائے مِس جڑوا کر اس کو منقش و مذہب کیا۔ اکبر شاہ نے اس کے گنبد کہنہ کو سنگ مرمر سے باکلس مُطلّا بنوایا۔

مزار شریف کے برابر ایک مسجد بڑی عالیشان سنگ سُرخ کی بنی ہوئی ہے کہ اس مسجد کا بھی روش اور انداز بہت شوکت و استحکام کے ساتھ ہے۔ قریب ساڑھے پانسو برس کے عرصہ گذرتا ہے کہ اس کی کسی شے میں تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے۔ اتنا بڑا برج لداؤ کا اور کسی مسجد و مقبرے کا نہیں دیکھنے میں آیا۔ مسجد کے پانچ گنبد ہیں ـــــــ اوسط کا برج بزرگ شاہزادہ خضر خان بن سلطان علاؤ الدین خلجی نے حضرت کے روبرو تیار کروایا۔ بہت عقیدت رکھتا اور دو طرف یمین و یسار ہیں دو در ہے اور چار گنبد سلطان تغلق عادل شاہ بن غیاث الدین تغلق نے تعمیر کیے۔ ان کے در و محراب پر تمام آیاتِ کلام اللہ بخط قدیم کندہ ہیں ــــ صحن درگاہ شریف میں تین حجرے سنگ مرمر کے ایسے لطیف و نورانی ہیں کہ مرأتِ ماہ اُنھیں کے عکس پُر نور سے منور ہے۔ اگر حجروں کا مدفن نصیب ہو تو حیات سے موت بہتر ہے اور جو ان کا ہمسایہ میسر ہو تو بہشت سے خوشتر وہ حجرے پاکیزہ جالیوں اور منبت کاری سے پھولوں کے چھپر کھٹ نظر آتے ہیں یا حضرت کے روضۂ مطہرۂ منورہ کے اصحابِ ثلاثہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں ایک حجرہ میرزا جہانگیر بن اکبر شاہِ ثانی کا ہے اور دوسرا احمد شاہ بادشاہ کا اور تیسرا جہاں آرا بیگم بنتِ شاہجہاں بادشاہ کا اور یہ شعر اس کی لوحِ مزار پر بخطِ نسخ کندہ ہے:

ہو الحی القیوم

تاریخ وفات محمد شاہ

شہ فلک حشم و روشن اختر انکہ ازو
چو آفتاب جہاں جملگی فروغ گرفت،
چو شد بجادۂ فردوس زین سرائے پیچ
سرو و ہاتفِ غیبی کہ گو بہ جنت رفت

تاریخ فوت میرزا جہاں گیر

قطعہ

چون از جہان برفت جہانگیر میرزا
نورِ نگاہِ اکبر و سالارِ دو سرا
شد خانۂ عزا بہ غمش دارِ سلطنت
محزون شد از وفات وے آن ظل کبریا

تاریخ فوت او بظہور آمدہ چنیں
از کان شاہ رفت زہے لعلِ بے بہا

ذکر حضرت سلطان المشائخ

حضرت سلطان المشائخ کے فضائل و کمالات اظہر من الشمس ہیں اور تمام کتب تاریخ میں مندرج کہ آپ طبقۂ اعلیٰ سادات صحیح النسب حسینی سے تھے اور سلسلہ علیا خاندان چشتیہ میں منتخب، حضرت ابتدا سے انتہا تک عالم تجرید میں رہے۔ اصل آپ کی بخارا شریف ہے اور سکونت آبا و اجداد کی غزنین، خواجہ احمد بن خواجہ دانیال پدر بزرگوار آپ کے غزنین سے بدایوں میں تشریف لائے۔ بادشاہ نے منصب قضاء بدایوں ان کو تفویض کیا اور والدہ ماجدہ آپ کی بی بی زلیخا صاحب زادی خواجہ عرب کی تھیں۔ سلطان المشائخ بیچ ۶۳۳ھ یا ۶۳۴ھ یا پینتیس کے ماہ صفر بعد طلوع آفتاب بروز چارشنبہ آخری بدایوں میں پیدا ہوئے اور پچیس برس کی عمر تک بدایوں میں علوم رسمیہ تحصیل کرتے رہے۔ چونکہ شوق آپ کو مباحثہ کا بہت تھا اور اکثر بحث میں غالب آتے تھے تو آپ کا لقب "نظام محفل شکن" ہوگیا۔ پھر آپ نے دہلی میں آن کے علم تحصیل کیا فیض صحبت شیخ نجیب الدین متوکل سے اٹھایا۔ بعد تھوڑے عرصہ کے ترک مرادات کر کے قصبہ اجودھن میں حضرت شیخ فرید شکر گنج کی خدمت سے فیضیاب ہوئے اور بیعت حاصل کی اور خرقہ خلافت پہنا۔ پھر چند روز میں دہلی کو مراجعت فرما کر غیاث پور دہلی میں مقیم ہوئے اور تھوڑی مدت میں زمزمۂ رہنمائی و رہبری گوش ہوش عالم میں پہنچایا اور ہر صوبہ و ناحیت میں اپنے خلفا کو واسطے تکمیل و تربیت مریدین کے بھیجا۔ ان کی بزرگی اور کمالات کے لکھنے سے قلم قاصر ہے اور بیان اوصاف آپ کا طالب ذوق

خوازن الاولیا میں مذکور ہے کہ ایک فضیلت آپ کی یہ ہے کہ حضرت خواجہ فضیل عباس پیر سلطان ابراہیم ادھم کو کہ خاندان چشتیہ میں سرچشمۂ فیض ولایت و کرامت ہیں ایک روز الہام ہوا اور غیب سے خطاب آیا کہ اے فضیل عیاض ایک شخص محمد نظام الدین اولیا ہمارے خاصان درگاہ سے

تیرے طبقہ میں پیدا ہوگا۔ اور وہ معاملۂ رہنمائی کو ایسا کرسی نشین کرے گا کہ ہزاروں خدا شناس اس کے فیض صحبت سے کامل عیار ہوں گے۔ خواجہ فضیل اس الہام سے بہت خوش ہوئے اور تادم واپسیں ان کے قدم سعادت توام کے منتظر رہے۔ آخر اپنے خلیفہ کو وصیت کی، جب ایسا کوئی ولی کامل ہمارے سلسلہ میں پیدا ہو تو میرا اس تک سلام پہنچا دینا اور التماس دعا کرنا۔ یہ بھی تادم اخیر منتظر رہے اور بروقت انتقال کے اپنے خلیفہ کو اسی طرح وصیت کر گئے۔ رفتہ رفتہ جب کہ نوبت حضرت شیخ فرید شکر گنج کے پہنچی تو آپ کے ماہِ وجود نے آسمان سعادت سے ظہور کیا اور شیخ فرید کی خدمت سے مشرف ہوئے۔ انھوں نے خواجہ فضیل سے تا حضرت خواجہ قطب الدین بموجب وصیتوں کے سب خلفا کے سلام پہنچائے اور ملتمس دعا ہوئے اور خرقۂ خلافت سراپا سعادت عنایت فرمایا۔ کبھی حضرت فکر شعر بھی فرماتے تھے۔

از تو نتواند بریدن کس بآسانی مرا
گر نمیداند کسے آخر تو میدانی مرا

کہتے ہیں کہ ۷۲۴ھ میں آپ کی طبیعت علیل ہوئی تو چار مہینے چند روز بیمار رہے اور تاریخ ۱۸ویں شہر ربیع الثانی ۷۲۵ھ میں یوم چہارشنبہ کو بعد طلوع آفتاب کے خرقہ وجود کو اتار کر حلۂ بہشت پہنا اور جہاں آپ تشریف رکھتے تھے وہیں مدفون کیا گیا۔ یہ تاریخ ان کے وفات کی ہے۔

تاریخ

نظام دو گیتی شہِ ماو طین
سراج دو عالم شہِ بالیقین
چو تاریخ فوتش بجستم زغیب
ندا داد ہاتف شہنشاہ دین

حضرت امیر خسرو

آپ کے روضہ سے سمتِ جنوب کو مزار حضرت امیر خسرو کا ہے۔ یہ مزار بھی بہت متبرک و مستحکم ہے اول اس کا گنبد نہ تھا ۱۰۱۴ھ ایک ہزار چودہ میں محمد عماد الدین حسن طاہر نے محجر اور ریرج سنگ مرمر کا بنا دیا اور اس کی دیواروں پر یہ عبارت نظم کندہ کرا دی۔

نظم

اے خسروِ بے نظیرِ عالم
با روضۂ تو مرا نیاز است
تعمیر نمود طاهر آں را
فیض ازلی همیشه باز است
تاریخ بنائش عقل گفتا
"با روضہ" بگو کہ "جائے آز" ست

قایل ایں کلام و بانیِ ایں مقام طاہر محمد عماد الدین حسن بن سلطان سبزواری فی سنہ ۱۰۱۴ھ غفر ذنوبہ وستر عیوبہٗ الکاتب عبد الغنی ابن ایوب۔

اور یہ بھی تصنیف حضرت امیر کی وہیں لکھی ہے۔

ابیات

اے تربتِ عاشقی بجامت
وز دوست زمان زمان پیامت
شد سلکِ فرید از تو منظوم
زانست کہ شد لقب نظامت

جاوید بقاست بندہ خسرو
چوں شد بہزار جان غلامت

مرا نام نیک است خواجہ عظیم
دو شین، دو دو لام و دو قاف و دو جیم
اگر نام یابی دریں حرفہا
بدانم کہ ہستی تو مرد فہیم

کاتبِ مذکور نبیرہ شیخ فرید شکر گنج، اور باہر گنبد کے شمال رو عہدی خواجہ نے عہد بابر بادشاہ میں ایک لوح سنگ مرمر پر یہ تاریخ وفات حضرت امیر کی کھدوا کر نصب کی ہے۔ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ"

نظم

زمیں را ازیں لوح شد سرفرازی
بدوران بابر شہنشاہِ غازی
میر خسرو، خسروِ ملکِ سخن
آں محیطِ فضل و دریائے کمال
نثر او دلکش تر از ماءِ معین
نظمِ او صافی تر از آبِ زلال
بلبلِ دستاں سرائے بیقریں
طوطیِ شیریں مقالِ بے مثال
از پئے تاریخِ سالِ فوتِ او
چوں نہادم سر بزانوی خیال
شد "عدیم المثل" یک تاریخ او
دیگرے شد "طوطیِ شکر مقال"

ایضاً

ز حرفِ وصلِ جاناں سادہ آمد لوحِ خاکِ من
طریقِ سادہ لوحی بس نشانِ عشقِ پاکِ من

مہدیِ خواجہ سید با جاہ و جلال
شد بانیٔ ایں اساسِ بے شبہ مثال
گفتم بسعیِ جمیلِ مہدی خواجہ
تاریخ بنائے ایں چو کردید سوال
(محررہ شہاب الدین المعمائی الہروی)

حالات حضرت امیر خسرو

ان کا احوال کتب تاریخ اور تذکروں میں بہت مذکور ہے اور تمام خواص وعام پر مشہور مگر تھوڑا سا اس کتاب میں لکھنا بھی ضروری ہے۔ اصلی نام آپ کا ابوالحسن یمین الدین ہے اور والد بزرگوار امیر سیف الدین محمود سردار قوم ترک ہزارہ ساکن نواح بلخ تھے۔ چنگیز خاں کے دور استبداد کے زمانے میں ہندوستان تشریف لائے اور سلک امرائے شاہی میں منسلک ہوئے اور قصبہ مومن آباد مضافات بدایوں میں کہ کنارۂ دریائے گنگ پر واقع ہے توطن اختیار کیا اور ۶۵۱ھ کے امیر خسرو تولد ہوئے۔

بروز ولادت ان کے والد ایک مجذوب کے پاس کہ ان کے ہمسائے میں رہتے تھے۔ لے گئے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس شخص کو لائے ہو کہ خاقانی سے دو قدم پیشتر جاوے گا۔ ان کے والد بہت خوش ہوئے اور ان کی تربیت میں مشغول ہوئے جب عمر امیر کی بیس برس کی ہوئی تو امیر سیف الدین امیر خسرو کو مع ان کے دونوں بھائیوں عزیز الدین اور حسام الدین کے دہلی میں بیچ خدمت سلطان المشائخ کے لائے اور شرف ارادت سے مشرف کیا۔ اس سے ایک سال کے بعد امیر سیف الدین پچھتر برس کی عمر میں جنگ کفار میں شہید ہوئے۔ امیر نے اس حال میں یہ شعر کہا۔

سیفؔ از سرم گذشت و دلِ من دو نیم شد
دریائے خون رواں شد و در یتیم ماند

بعد اس واقعہ کے ان کو امیر عماد الملک ان کے نانا نے کہ اعیان عصر سے تھے ان کو پرورش کیا اور ان کو روز بروز ترقی و امارت حاصل ہوئی گئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے سات بادشاہوں کی صحبت اپنی عمر میں کمال اعزاز و اکرام سے اٹھائی اور انتہائی اس عالم امارت میں بھی پیر سے ان کو نہایت عشق و محبت تھی اور ہمیشہ ریاضات و مجاہدات میں مشغول رہتے تھے اور چالیس برس برابر روزے رکھے اور سات سیپارے کی ہر شب تہجد کے وقت تلاوت کرتے تھے۔ اور چند مرتبہ ساتھ پیر کے پیادہ حج کیا اور پانچ مرتبہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم رویا میں دیکھا ایک بار صحبت حضرت خضر علیہ السلام کی بھی حاصل کی اور حضرت سے واسطے شیریں مقالی کے لعاب دہن کی درخواست کی حضرت خضر نے فرمایا کہ یہ دولت تم سے پیشتر شیخ سعدی لے گئے۔ امیر نہایت مایوس ہوئے اور حضرت سلطان المشائخ سے ذکر کیا۔ آپ نے اپنا لعاب دہن ان کے کام و زبان کو لگایا۔ اس کی برکت سے یہ بھی طوطی ہند ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ ایک کم سو جلد انھوں نے تصنیف کی ہیں اور ... اپنے مصنفات ہیں کہ پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ شعر کہے ہیں۔

سلطان المشائخ کو بھی حضرت امیر سے کمال عشق تھا۔ ان کو "ترک اللہ" فرمایا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ قیامت کے دن ہر شخص کو ہر چیز پر فخر ہوگا مجھ کو سوز سینہ ترک اللہ سے افتخار ہوگا۔ جب حضرت امیر کی ۷۴ برس کی عمر ہوئی اور انھوں نے واقعہ سلطان المشائخ کا سنا تو بنگالے سے دہلی میں آئے اور تمام مال و اسباب خیرات کر دیا۔۔ نہایت ناشکیبائی سے شب و روز گریہ و زاری میں مصروف رہتے تھے۔ اور لباس پہن کر اپنے پیر کے مزار پر انوار پر دن رات مجاورت کرتے تھے۔ اور ہر وقت دعائے وصال چاہا کرتے تھے۔ چنانچہ بعد چھ مہینے کے جمعہ کی رات کو ماہ ذیقعدہ ۷۲۵ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔

حضرت سلطان المشائخ کی وصیت تھی کہ حضرت امیر کی قبر برابر میری قبر کے بنانا کہ وہ وہ میرے محرم اسرار ہیں اور یہ بھی فرمایا تھا کہ دور کرنے والا اس کا نام و نشان اپنا نہ پاوے گا۔ چنانچہ بعد انتقال کے حضرت ایک خواجہ سرا نے واسطے رفع اشتباہ برابری کے اس امر میں ممانعت کی اور پیر کے پہلو میں نہ رکھنے دیا۔ آخر ان کو چند گز دور مدفون کیا۔ بعد چند

روز کے وہ خواجہ سرا پلنگ پر سوتا تھا کہ شیر اجل نے اس پر ایسا چنگل مارا کہ پھر کسی نے اُس کا نام و نشان نہ پایا واللہ عالم۔

بعد ان زیارات کے باہر آئے تو اور بہت مقبرے و مکانات امرائے قدیم اور عمارات و حویلیاں خادموں کی اس قلعہ کے اندر دیکھنے میں آئیں خصوصاً ایک عمارت یک لخت سنگ مرمر کی دیکھی کہ اُس کو "چونسٹھ کھنبہ" کہتے ہیں۔ یعنی اُس میں چار ستون لگائے ہیں۔ اس مکان کا بھی ثانی جہان میں نہ ہوگا اس میں میرزا عزیز کوکلتاش خاں بن میرزا شمس الدین اتکہ خان کی قبر ہے۔ ۱۰۳۴ھ ایک ہزار چونتیس ہجری مطابق ۱۹ سنہ جلوس جہانگیری میں ان کا واقعہ ہوا۔ اور بعد اس کے یہ مقبرہ بنایا گیا۔

احاطہ حصارِ درگاہ شریف سے باہر آئے تو اس سے تھوڑے فاصلے پر ہمایوں کا مقبرہ دیکھا سبحان اللہ اس کی وسعت و رفعت بیان نہیں ہو سکتی جو کوئی اس کو ایک دفعہ دیکھتا ہے نقشہ اس کا دل و جان میں رکھتا ہے۔ حسن عمارت موجب نزہت اور خوبی عمارات باعث راحت۔

سلاطین تیموریہ کے مقبروں میں اول یہی بنا ہے اور سب روضے اسی کی نقل میں تعمیر ہوئے ہیں۔ اگرچہ روضہ تاج گنج افراطِ سنگ مرمر اور پرچین کاری سے زاید الوصف ہے۔ مگر فضا و دلکشائی اور شوکت و دلربائی میں یہ بھی اُس سے کم نہیں۔ سنگ مرمر و سنگ سُرخ سے بنایا ہے گویا آب و آتش کو باہم کیا ہے۔

اب باغ و اشجار بھی غور و پرداخت کی جاوے تو یہ بھی رشک خلد بریں نظر آوے کسی شاعر نے اسی کی تعریف میں یہ شعر کہا ہے۔ اور یہ شعر واقعہ بیان کیا ہے۔

شعر

ہر کہ میخواہد کہ بیند شکل فردوس بریں
گو بیا ایں قصر و ایں باغ ہمایوں را بہ بیں

یہ مقبرہ بعد وفاتِ ہمایوں کے ۹۷۳ھ میں حمیدہ بانو بیگم الملقب بحرم مکانی بی بی ہمایوں بادشاہ مادر جلال الدین اکبر نے تیار کرایا اور سولہ برس کے عرصہ میں اسے تمام کو پہنچایا اور پندرہ لاکھ روپیہ اس پر صرف کیا۔ کہتے ہیں کہ محمد شاہ کے زمانے تک بھی اس میں کچھ رونق و سرسبزی باقی تھی اور محافظین و مجاورین رہتے تھے اور عرس و روشنی ہوا کرتی تھی اور جو خاندان بادشاہی

یں سے فوت ہوتا تھا اُسے یہیں مدفون کرتے تھے۔ چنانچہ قبریں حمیدہ بانو بیگم مذکور اور دارا شکوہ اور اعظم شاہ اور معز الدین جہاندار شاہ اور محمد فرخ سیر اور شمس الدین البرکات اور رفیع الدولہ اور عالمگیر ثانی وغیرہ کی اسی میں ہیں۔

شعر

اگر پردہ برگیری از روئے خاک
روی تا بہفتم زمین دُر مغاک
ہمہ فرقِ شاہانِ سرکش بود
رُخِ نو عروسانِ مہوش بود
سراپائے گیتی ہمہ غیرت است
پس و پیشِ او حیرت و حسرت است

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی

برابر اس مقبرہ کے عرب سرا ہے کہ حاجی بیگم زوجہ ہمایوں بادشاہ حرمین شریفین کے سادات و مشائخین میں سے دو سو بزرگوار اپنے ہمراہ لائی تھی۔ اور ان کے واسطے یہ سرا تعمیر کر کے ان کو آباد کیا تھا۔ اب تک چند اشخاص ان کی اولاد سے باقی ہیں۔ یہ سرا بہت بڑی ہے اب اس میں ہر قسم کی خلقت بستی ہے۔ یہ ۹۶۸ھ میں بنی تھی۔

بعد اس کے اتفاق زیارت درگاہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کا ہوا کہ شاہجہاں آباد سے چار کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ راقم نے ان کی آستاں بوسی سے سعادت دو جہانی حاصل کی۔ کہتے ہیں کہ گنبد آپ کے مزار کا ۷۷۹ھ سلطان فیروز شاہ نے کہ حضرت سے بہت اعتقاد رکھتا تھا۔ آپ کے زمانے حیات میں بنوایا پھر دروازہ باہر کا مع گنبد کے بعد بارہ برس کے اسی بادشاہ دیندار نے ۷۷۵ھ میں تیار کروایا۔

یہ بزرگ بڑے ولیِ کامل اور عارفِ مکمل تھے۔ دہلی میں بعد سلطان المشائخ کے سجادہ نشین آپ ہی ہوئے۔

وجہ آپ کے لقب کی اس طرح لکھتے ہیں کہ اصل نام آپ کا نصیر الدین محمود بن یحییٰ اودھی

تھا۔ حضرت عبداللہ یافعی نے طواف کعبہ میں حضرت جہانیاں جہاں گشت سے پوچھا کہ اب دلی میں کون ولی ہے۔ حضرت مخدوم نے جواب دیا کہ پہلے دلی میں بہت بزرگ تھے۔ مگر اس زمانے میں نصیر الدین محمود سے دہلی کا چراغ روشن ہے۔ تب سے آپ کا لقب چراغ دہلی مشہور ہو گیا۔

گلزار ابرار میں مسطور ہے کہ شیخ عبداللطیف جد بزرگوار حضرت کے خراسان سے لاہور میں پہنچے وہاں شیخ یحییٰ والد ماجد آپ کے پیدا ہوئے۔ شیخ یحییٰ نے لاہور سے اودھ میں آکر توطن کیا اس مقام میں شیخ نصیر الدین متولد ہوئے۔ بعد ۹ برس کے آپ یتیم ہو گئے۔ آپ کی والدہ شریفہ نے تحصیل علم میں ان کو مصروف رکھا۔ جب ۲۵ برس کی عمر ہوئی تو آپ نے ترک تجرد اختیار کیا اور پھر پینتالیس برس کی عمر میں بیعت اسلطان المشائخ سے مشرف ہوئے اور بہت فیض و کمالات ظاہری و باطنی حاصل کیا۔

سیر العارفین شیخ جمالی دہلوی میں مذکور ہے کہ جب عمر شیخ المشائخ حضرت محبوب الٰہی کی چورانوے برس کی ہوئی تو روز چہارشنبہ اٹھارہویں ربیع الثانی ۷۲۵ھ میں سب خلفاء کو جمع کیا اور ہر ایک کو خرقہ خلافت بخش کر ایک طرف کو روانہ کیا اور حضرت چراغ دہلی کو خرقہ مصلیٰ اور عصا و تسبیح کاسہ و نعلین چوبی اپنے پیر کا عنایت کر کے اپنا جانشین فرمایا اور رہنمائی اہل دہلی کی آپ کو تفویض فرمائی اور یہ وصیت کی کہ آزار اغیار اور سرزنش اشرار پر صابر و شاکر رہنا اور یہ فرما کر اسی روز سلطان المشائخ عالم قدس کو سدھارے۔

کہتے ہیں کہ بعد اس واقعے کے تغلق شاہ نے اپنی کج منشی سے شیخ نصیر الدین دہلی کو بہت آزردہ خاطر رکھا اور تکلیفیں پہنچائیں۔ بعضے ارادت کیشوں نے عرض کیا کہ جزائے کردار بد کے واسطے یہ درگاہ مستقیم حقیقی دعائے گوشمالی کرنا لازم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نصیر کو ساتھ اپنے علیم و بصیر کے معاملہ ہے اور اس کو خود ہر عمل کی پاداش کا اختیار ہے۔ اس صورت میں درویش کو سلطان کی گرانجانی۔ پسند کرنا مرتبہ رضا و تسلیم سے بعید ہے۔

القصہ بعد وفات پیر کے انھوں نے ۳۲ برس علم ہدایت سربلند رکھا اور خلق اللہ کو راہ خدا شناسی بتائی اور جب عمر آپ کی بیاسی برس کی ہوئی تو تاریخ ۱۸ اوریں ماہ رمضان شب جمعہ ۷۵۷ھ ہجری میں کسی قلندر کے ہاتھ سے زخم اٹھا کر انتقال فرمایا۔ بموجب

کہتے ہیں خرقہ سلطان المشائخ کا سینہ پر عصا و نعلین جو ہیں دونوں بغلوں میں اور کاسہ زیر سر اور تسبیح انگشت شہادت پر لپیٹ کے آپ کو مدفون کیا۔ یہ شعر آپ کے مزار پر لکھا ہے۔

چراغ دہلی از کار مسیحا آسمانی شد،

کہ تا خورشید را با خویشتن ہمسایہ گرداند

آپ کے مزار کے پاس ایک مسجد فرخ سیر کی تعمیر ہے اور آپ کے گنبد کے نزدیک دو برج اور ہیں ایک میں نبیرۂ حضرت فرید شکر گنج کی قبر ہے اور ایک میں مخدوم زین العابدین آپ کے بھانجے کی تربت ہے اور مخدوم کمال الدین صاحب بھی کہ سلسلہ مولانا فخر الدین صاحب کا وہاں تک پہنچتا ہے وہیں مدفون ہیں۔ ہر سال وہاں عرس اور میلہ ہوتا ہے اور پاس مزار شریف کے ایک بستی ہے اُس میں خادم وغیرہ ہر قوم کے لوگ رہتے ہیں محمد شاہ نے اس کی فصیل خوب بنوادی ہے۔

بعدہ، درگاہ سید محمود بحّار کی زیارت بابرکت سے سعادت اندوز ہوئے۔ یہ بزرگ بڑے صاحب درجات مستجاب الدعوات تھے۔ آج تک ان کے مزار سے ایک عظمت وجلالت اور تاثیر و آثارِ فیض و کرامت ظہور کرتے ہیں سوائے کمال وعرفان کے عالم ظاہری میں بھی فاضل اجل اور عالم متبحر تھے۔ اسی سبب سے آپ کو "محمود بحّار" کہتے ہیں۔ آپ کی خدمت میں ایک پیرزال حاضر ہوا کرتی تھی اور اس کا بیٹا سفر میں مسافرِ ملک عدم ہو گیا تھا۔ اور اس کو بالکل خبر نہ تھی۔ ہمیشہ اُس کی مراجعت کی دعا آپ سے چاہا کرتی تھی۔ آپ نے ایک روز مراقب ہو کر دریافت کیا تو فقط اُس کے استخوان باقی تھے۔ اُس بڑھیا کے حال پر ترحم کر کے آپ نے دعا کی حق تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور وہ شخص زندہ ہوا اور اپنی ماں سے آکے ملا۔ جب سے آپ کو "محی العظام" بھی کہتے ہیں۔ ۷۰۰ھ ہجری میں آپ نے وفات پائی۔ اگرچہ آپ کے مقبرہ میں کچھ تکلف ظاہری نہیں ہے۔ مگر اس میں ایک شیر بیشۂ عشق الٰہی سوتا ہے۔

واقع میں دہلی کہنہ بڑا شہر اور بلدہ نامدار تھا باوجودکہ ہم ان زیارتوں کے واسطے کئی کوس پھرے کہیں اس کا حصر وانتہا نہ معلوم ہوا اور سوائے مقابر ومساجد اور اعمارت واماکن کہنہ کے کہیں دشت ومیدان نظر نہ آیا اور بہت سے مقامات ومکانات کا ذکر ہم نے بسبب طول کتاب کے مرقوم نہیں کیا اور اکثر مزارات کو بسبب ناسازی طبیعت کے نہیں دیکھا۔ بعدان سب زیارات کے منزل گاہ پر آکے قیام کیا اور وہاں سے تاریخ نوزدہم جمادی الثانی کو کوچ کیا۔ اور اول لاہوری دروازہ کے باہر ڈیرہ ہوا۔ وہاں سے درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کہ شہر سے سات کوس کے فاصلے پر واقع ہے اور ارادہ مصمم ٹھہرا کہ مسافران ملک جنوب کی منزلِ اول بھی دہلی سے وہیں ہوتی ہے اور راقم کو آرزو عتبۂ عرش رتبہ کی زیارت اور خاک بوسی کی بھی ایک عمر سے تھی۔ لاہوری دروازہ سے سمت دکن کو روانہ ہوئے

مقبرہ صفدر جنگ

راستے میں سڑک بہت مصفّا اور مرتّب دیکھنے میں آئی۔ بعد تین کوس طے کرنے کے مقبرہ منصور علی خاں صفدر جنگ کا ملا۔ یہ روضہ بھی انتخاب عمدہ روزگار کہلاتا ہے۔ اور مقبرہ ہمایوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ عجب مقام دلکشا اور بقعۂ روح افزا ہے کہ روضۂ جنّت اس کے ہواخواہوں میں اور شیشہ دار آفتاب اُس کے آئینہ داروں میں۔۔ ہے تمام سنگ مرمر و سنگ سُرخ سے بنایا ہے۔ گویا لعل و گوہر کو ایک درجے میں رکھا ہے۔ چاروں طرف باغ و نہر سرسبز ولبالب ہے اور ہر برج اس کے بروج چارگانہ کا منتخب، اور کرسی صحن، چبوترہ مانند جلوہ گاہ مہتاب کے نہایت نورانی و مصفّا بسبب تیاری وخبرگیری کے ان کی اولاد یعنی والیانِ لکھنؤ کی طرف

سے اس کی ترمیم و ترتیب ہوتی رہتی ہے۔ آج تک کہ عرصہ سو برس کا ہوتا ہے کہیں اس میں کہنگی اور شکستگی نہیں آئی۔ کہتے ہیں کہ جب سترویں ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ میں صفدر جنگ نے پاپڑ گھاٹ میں کہ لکھنؤ سے تین منزل ورے واقع ہے۔ انتقال کیا۔ چند مدت تابوت ان کا اسی طرف امانت رہا۔ بعد چند مدت کے ان کی بی بی نے دہلی کو بھیجا اور یہ مقبرہ بصرف تیس لاکھ روپے کے تعمیر کروایا۔

درگاہ شاہ مرداں

نزدیک اس مقبرہ کے ایک درگاہ پنجۂ شاہ مرداں علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثنا مشہور ہے اور گرداس کے ایک احاطہ پختہ بنا ہوا ہے۔ اس میں اکثر خدما اور کچھ زمیندار وغیرہ رہتے ہیں اور قریب درگاہ شریف کے ایک مجلس خانہ پختہ اکبر شاہ نے بنوا دیا ہے۔ اسی کی یہ تاریخ ہے۔

تاریخ

بدرگاہے شاہنشہ لو سرائے
علیؑ شاہ مرداں، ولی خدائے
بحکم شہ اکبر نامور
جو عشرت علی خاں بہا است بائے
رسیدہ شدم سائل سال آں
ہمیں زد رقم "داد ناظر بنائے"

دروازہ نقار خانہ کا اس درگاہ میں صادق علی خاں نے بنوایا ہے اس پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

تاریخ

چونکہ صادق علی بنائے رفیع
ساخت، بر آستانہ حیدر
سال تاریخ آں بنا صادق
گفت، نقار خانہ حیدر

اس درگاہ میں صرف شیعہ مذہب کے لوگ مدفون ہوتے ہیں اور باہر درگاہ کے ایک احاطہ میرزا اشرف بیگ نے بنایا ہے اور ان کی قبر بھی وہیں ہے اس کو کربلا کہتے ہیں۔ تمام شہر کے تعزیے بھی یہیں دفن ہوتے ہیں اور عشرہ محرم کو وہاں بڑا ہجوم اور میلہ ہوتا ہے۔

اس درگاہ کے قریب مقبرہ نواب نجف خاں کا ہے۔ اس کی تربت پر یہ مادہ تاریخ کندہ ہے۔

ایں تربتِ نجف

اور ایک مصرعہ ان کی تاریخ وفات میں کسی اور نے لکھا ہے:

مصرع

ایں قدمگاہِ شہِ مردان نجف آباد کرد

نواح درگاہ حضرت خواجہ صاحب

وہاں سے گزر کے بعد طے مسافت چار کوس کے شہر سے کل سات کوس ہوتا ہے سواد درگاہ حضرت قطب الاقطاب میں پہنچے ایک ایک عمارت قدیم اور مساجد و مقابر فلک تعظیم ایسے دیکھنے میں آئے کہ ان کا بیان کرنا نوحہ گری ہے اور ان کی شرح مرثیہ خوانی۔ اس صحرا میں وہ شیر بیشہ سلطنت سوتے ہیں کہ جن کے ناخنِ کشود پر حل و عقدِ عالم منحصر تھا۔ اب وہ ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتے، دم بھی نہیں مار سکتے۔ ایسے محل بے کسی اور موقع بیچارگی پر سلطان محمد بن ملک شاہ ابن الپ ارسلان نے اپنے وقتِ قربِ نزع میں کہ جب وہ ۵۱۱ھ میں اس دار غرور سے سرائے سرور کو کوچ کرنے لگا تو کیا خوب قطعہ کہا ہے:

قطعہ

بزخمِ تیغِ جہانگیر و گرزِ قلعہ کُشا
جہان مسخرِ من شد چو من مسخر جائے
بسے بلاد گرفتم بیک فشردنِ دست
بسے قلاع کشودم بیک فشردنِ پائے

چو مرگ تاختن او درہیچ سود نداشت
بقا بقائے خدا ایست و ملک ملک خدائے

غرض اول اس نواح میں مسجد قوت الاسلام کو دیکھا کہ اب اس کے سوائے در و دیوار شکستہ اور آثار و بنیاد ریختہ کے کچھ باقی نہیں مگر اس کا طول ارتفاع و پہنائی اور بنانے والوں کی ہمت و دیانت اور ان بادشاہوں کی عظمت و شوکت اب تک اس سے ظاہر ہے باوجود کہ چار بادشاہوں نے اپنے اپنے عہد دولت میں اس کی تعمیر پر ہمت و سعی مصروف رکھی مگر تو بھی یہ تمام و کمال کو نہ پہنچی۔ حقیقت میں ایسی مسجد تمام روئے زمین پر نہیں ہے اور اس رفعت کا کوئی معبد کسی ملک و ملت میں نہیں ہے۔ اگر یہ مسجد کماحقہ، اختتام پا جاتی تو یقین ہے کہ ملائک سموات با حور و غلمان طبقات جنات اپنی تسبیح و صلوٰۃ کے واسطے اس کو آسمان پر اٹھالے جاتے

اس کے بعضے محراب و در کی منبت کاری اور نقش گری سے صنعت و ندرت حضرت باری ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس میں ایک مینار مسجد کہ جو قطب صاحب کی لاٹھ مشہور ہے۔ ہنوز سراپا قائم ہے۔ اس کی خوبی و صنعت بیان میں نہیں آتی اور اس کی رفعت و شوکت لکھی نہیں جاتی۔ اس کی دریافت حقیقت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کی بلندی اس کے اوپر چڑھنے سے معلوم ہوتی ہے جو اس کے درجۂ اعلیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ اور گرد اس لاٹھ کے تمام منبت اور آیات کلام اللہ کندہ ہیں اوپر سے تمام سنگ سرخ ہے اور اندر جملہ سنگ خارا زینے اس کے اوپر چڑھنے کے ابتدا سے انتہا تک، پانچوں درجوں کے تین سو چھیاسی ہیں۔ اور سبب اس لاٹھ کے قائم رہنے کا آج تک یہ ہے کہ بعد اس کی تیاری کے جو بادشاہ کہ باہمت ہوا اس نے اس عمارت عجیبہ کو یادگار زمانہ قدیم جان کر اس کی شکست و ریخت کی مرمت میں کوشش کو مصروف رکھا اس کی ترمیم سلطان فیروز شاہ نے کی بعد اس کے سلطان سکندر بن بہلول لودی نے اس کی درستگی کرائی۔ سرکار انگریزی نے اس کے دو درجۂ منہدمہ اعلیٰ مع اور مرمت کے بنائے تھے۔ سو وہ دونوں درجے بسبب آفات سماوی نہ ٹھہر سکے۔

حقیقت تعمیر اس مسجد و مینار کی سید احمد صاحب منصف دہلی نے "مجموعہ الصنادید" میں بہت تفصیل و تشریح سے لکھی ہے۔ اس سبب اس میں لکھنا فضول ہے۔ مگر جس امر کے دریافت

متجسس ہوتی ہے اس کو کچھ تھوڑا سا لکھا جاتا ہے۔ ول میں اس مقام رائے پتھورا کا بڑا بت خانہ تھا اور اس بت خانہ کا جواب بھی ہندوستان میں نہ تھا۔ جبکہ سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۸۷ھ میں ہندوستان کو فتح کیا اور پتھورا کو شکست دی تو اس بت خانہ پر مسجد کی بنیاد ڈالی جیسا وہ عظیم و نامور تھا۔ ویسی ہی مسجد بھی بنوانی شروع کی۔ تھوڑی سی بنی تھی کہ سلطان شہاب الدین نے ۶۰۲ھ میں شہادت پائی اس بادشاہ نے ۳۲ برس سلطنت کی۔ بعد اس کے سلطان قطب الدین ایبک غلام شہاب الدین تخت نشین ہوا۔ پھر اس نے اس مسجد کا اہتمام کیا اور ناتمام چھوڑا آخر وہ بھی ۶۰۷ھ میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد سلطان شمس الدین ایبک برسرِ رائے دہلی ہوا۔ یہ بادشاہ بڑا دیندار تھا اور اٹھائیس برس سلطنت کی تو اس نے بھی اس مسجد کے بنانے میں بہت کوشش کی چنانچہ یہ مینار اور بعضے درجے مسجد کے اس کے عہد میں تیار ہوئے۔ مگر بالکل تمام نہ ہوئی تھی کہ ۶۳۳ھ میں اس نے بھی وفات پائی۔ بعد اس کے تمام و کمال بہت مدت تک اس کی تعمیر ملتوی رہی پھر ۶۹۵ھ ہجری میں سلطان علاؤالدین خلجی بادشاہ دہلی ہوا۔ اس نے بیس برس سلطنت کی اور اس نے بھی اس مسجد کے بنانے میں نہایت سعی کی اور اس کے زمانے تک پانچ درجوں تک نوبت پہنچی اور اس بادشاہ نے اس کے مقابلہ میں دوسرے مینار کی بنیاد شروع کروائی۔ کہ وہ اس سے باہمہ وجوہ بزرگ بنتا۔ اس عرصہ میں اس نے بھی ۷۱۵ھ ہجری میں رحلت کی، مینار دوئم بھی ناتمام رہا اور مسجد بھی پوری نہ ہوئی

بت خانہ ہنوز باقی ہے۔ اگرچہ اہل اسلام نے بتوں کی صورتوں میں کچھ کچھ اپنا تصرف کر دیا ہے۔ مگر چونکہ وہ مقام بھی صنعت و ندرت میں قابل دیکھنے کے ہے اس واسطے کسی نے اس کو آج تک بالکل خراب و نابود نہیں کیا۔ پھر کسی بادشاہ میں ایسی ہمت و جرأت نہ ہوئی کہ اس مسجد کو اختتام تک پہنچاتا۔ الا اس مینار کی مرمت جن بادشاہوں سے ظہور میں آئی ہے۔ نقشہ کے ساتھ کے کتبوں سے معلوم ہوگی۔

[مسجد قوت اسلام]

اس مسجد کے درجہ دوئم کے آگے ایک لاٹ آہنی بہت صاف اور سیدھی ڈھلی ہوئی

نصب ہے۔ بلندی اس کی زمین سے بائیس فٹ چھ انچ اور موٹائی پانچ فٹ تین انچ اور اصل اس لوہے کی کیلی کی اس طرح مشہور کرتے ہیں کہ نجومیوں نے رائے پتھورا سے کہا کہ دنیا کا جتنا راج و سلطنت ہے سب راجہ باسک سے تعلق رکھتا ہے اور وہ ہمیشہ زمین کے نیچے سیر کرتے پھرتے ہیں۔ اور اب چند روز میں زمین دہلی کے نیچے آیا چاہتے ہیں۔ ہم کو از روئے اعمال و نجوم کے وہ وقت اور ساعت معلوم ہے۔ اگر اس ساعت میں ایک کیلی اس مقام پر گاڑ دی جائے تو عین ان کے سر پر پہنچے گی اور یہاں سے راجہ باسک کو ہلنے نہ دیگی۔ جب تک کہ یہ کیلی رہے گی تب تک راجہ باسک اس زمین سے نہ جاویں گے اور نہ تمہارا راج اس زمین سے ٹلے گا۔ اور ہمیشہ سلطنت تمہارے خاندان میں رہے گی۔

رائے پتھورا نے اس طمع سے یہ کیلی اپنی زمین میں بموجب نجومیوں کے قول کے اس ساعت معین پر گڑوائی۔ بعد چند روز کے رائے پتھورا کو ان کے صدق و کذب کے تحقیق کا خیال ہوا اور اس کیلی کے اکھڑنے میں اصرار کیا کہ دیکھوں راجہ باسک کے سر پر پہنچی ہے یا نہیں جب رائے پتھورا نہ مانا۔ پنڈتوں نے اس کیلی کو اکھیڑا اور اس کی نوک میں کسی حکمت سے خون لگا کر دکھا دیا کہ دیکھو یہ راجہ باسک کے سر کا خون لگا ہوا ہے۔ رائے پتھورا کیلی اکھڑنے سے بہت پشیمان ہوا۔ پنڈتوں نے کہا کہ مہاراج اب کیا ہوتا ہے۔ سانپ نکل گیا۔ لکیر پیٹا کرو۔ غرض وہ اب تک وہاں گڑی ہوئی ہے اور اس کو خلقت ایک عجیب چیز جان کر دیکھتی ہے۔

سوا ان مکانوں کے اور بھی مقبرے بعضے بادشاہوں کے اور مزار اکثر بزرگوں کے اس جوار میں دیکھے۔ چنانچہ مقبرہ امام محمد علی مشہدی کا جو امام ضامن مشہور ہیں اور وہ مقبرہ ۹۴۴ھ ہجری میں برابر دروازہ مسجد قوت الاسلام کے بنا ہے اور مقبرہ سلطان شمس الدین التمش کا اور سلطان علاؤالدین خلجی اور مقبرہ سلطان غیاث الدین بلبن کا کہ یہ بھی دہلی میں بڑا نامور بادشاہ گزرا ہے۔ اصل اسکی ترکستان سے تھی۔ بعضے اس کو اولادِ افراسیاب کہتے ہیں کہ غلام اور وزیر سلطان شمس الدین التمش کا تھا۔ اور اس نے اکیس برس سلطنت کی اور اسی ۸۰ برس کی عمر میں ۶۸۶ھ ہجری میں انتقال کیا۔ اور مقبرا اور مسجد مولانا جمالی کہ نام ان کا فضل اللہ

تھا، اور بڑے بزرگ اور صاحب تصرف تھے۔ کہتے ہیں کہ لباس میں فقط ایک لنگ پر قناعت کرتے تھے اور شعرائے دہلی میں اپنے معاصرین پر تفاخر رکھتے تھے۔ وفات جمالی کی ۹۴۲ھ ہجری اور تاریخ رحلت "خسرو ہند" مقبرہ ان کا کاشانی چینی کا گلکاری اور منبت میں اپنا ثانی ہندوستان میں نہیں رکھتا۔ اکثر نقاش لوگ اس پر سے نقل کرکے تعظیماً اپنے پاس رکھتے ہیں اور مسجد و باولی دولت خاں کی کہ عہد سکندر لودھی میں بیچ ۱۴۹۱ ہجری کے بنائی تھی اور کوٹھی معظم الدولہ امین الملک اختصاص یار خاں طامس تھیافلس مٹکاف صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی کی کہ انھوں نے اس مقام پر بسبب زیادہ بود و باش ہونے بادشاہ کے سوائے کوٹھی شہر کے ایک بہت عمدہ کوٹھی مقبرہ محمد قلی خاں کوکہ جلال الدین اکبر کا خرید کے بنائی ہے۔

بعد اس کے درگاہ شریف کی آبادی میں آئے۔ جانب شمال و مغرب میں ایک بڑی بستی ہے۔ وہاں خادم لوگوں کے مکان اور دکانیں بنیوں کی اور سمت مشرق کو درگاہ شریف اور عمارت بادشاہی بہت تکلف سے بنی ہوئی ہے۔ اور جنوب کی طرف مکانات شاہزادوں اور امیر و رئیسوں کے دو طرفہ تعمیر ہیں اور بیچ میں بازار ہے۔ اور عقب میں اس کے سمت غربی میں ایک بڑا وسیع تالاب ہے کہ اس کو "حوض شمسی" کہتے ہیں۔ سلطان شمس الدین التمش نے اپنے عہد میں بنایا تھا اور آگے اس سے جھرنا مشہور ہے اس میں بہت حوض و آبشار بنے ہوئے ہیں اور پانی جھرنے میں اسی تالاب سے آتا ہے۔ برسات میں عین ساون بھادوں کے مہینے میں یہاں ایک میلہ گلفروشون کا ہوتا ہے۔ اور عجیب لطف کیفیت ہوتی ہے۔ تمام کوہ وصحرا سبز ہوتا ہے اور ہر قطعہ زمین پانی سے تر و تازہ تمام شہر کے امیر و غریب جمع ہوتے ہیں۔ جھرنے سے تا مینار مذکور خلقت اترتی ہے اور تمام بازار و دکانیں مرتب ہوتی ہیں اور ہر اہل حرفہ اپنے اپنے گروہ کے ساتھ جھرنے سے پنکھالے کے درگاہ شریف میں لاتے ہیں اور ہر ایک کے ساتھ ساز و سامان اور باجا اور چوکی ہوتی ہے اور دو رویہ اپنے اپنے مکانوں میں اور بالاخانوں پر خلقت بیٹھتی ہے اور آدمیوں کی اور ہاتھی گھوڑوں کی اس قدر ہجوم و کثرت ہوتی ہے کہ بیان میں نہیں آسکتی کہ ایسا میلہ ہندوستان میں رنگین و اجلا کہیں نہیں ہوتا۔ اس وقت کی کیفیت تقریر میں نہیں آسکتی دیکھنے سے تعلق ہے۔ بعد اس میلہ کے تمام سال وہ بازار و مکانات خالی پڑے رہتے ہیں۔

اور ایک ویرانہ نظر آتا ہے۔

غرض ہم وہاں راجہ جے سکھ رائے کے مکان میں اُترے اور عملہ کے واسطے اور مکان تجویز کر دیا۔ ڈیروں کے استادگی کی کچھ ضرورت نہ پڑی اور دویم درگاہ حضرت خواجہ صاحب سے سرمایہ سعادت دارین دولت کونین حاصل کیا۔ سبحان اللہ عجب مکان پُر نور آستانہ فیض گنجور اور بارگاہ سراسر سرور ہے کہ ہر در و دیوار اس کی مطلع خورشید سعادت اور ہر گوشہ اس کا مشرق انوار ہدایت ہے۔ ہر سنگ اس کا سجدہ گاہ مسجان بیت المعمور۔ باوجود کہ مزار آپ کا ایک انبار گِل ہے اور تربت پر کچھ گنبد و آرائش نہیں ہے لیکن اس کی عظمت سے سطوت بارگاہ سلطانی اور شوکت خرگاہ آسمانی منفعل ہے۔ کہتے ہیں کہ پیشتر آپ کے مزار مبارک کے گرد کچھ در و دیوار و احاطہ نہ تھا۔ شیر شاہ نے ایک حریم وسیع معہ دروازہ کے اپنے عہد میں بنوائی اور یہ تاریخ اس کے دروازہ پر کھدوائی۔

"تاریخ

در زمان آفتاب چرخ دولت شیر شاہ
شاہ را بر باب کوکب موکب گردوں غلام
ایں عظیم القدر درگاہیکہ اندر باب او
صادق آمد قول ہذا الباب من دار السلام
بود لست و چار و نہصد سال از ہجرت کہ شد
ز اہتمام شیخ دیں پرور خلیل الحق تمام

اور دروازہ غربی پر یہ تاریخ مرقوم ہے:

"تاریخ

خلقی کہ دریں گنج سعادت مُرفت
آخر زگہر نثار شاکر خان سُفت
گفتم چہ نویسم رقم تاریخش
رضوان بدر اسرار در جنت گفت

تاریخ دروازہ جانب احاطہ ملا موج :

تاریخ

در زمانِ شہِ جہاں اسلام
شد بلندی در سپہر جناب
گرچہ صد ہست باب جنت را
لیس بابٌ بمثل ہذا الباب
کرد شخصے بنا کہ در بابش
یوسفِ ثانی از حق است خطاب
چون ز تاریخ نام کردم عرض
گفت، درگاہِ خواجۂ اقطاب

اور بعد اس کے فرخ سیر بادشاہ نے قریب مزار مبارک کے جالیاں اور دروازے سنگِ مرمر کے لگائے۔ یہ تاریخ دروازہ اندرون پر کندہ ہے :

تاریخ

از سعی کمترینِ غلامانِ شہر یار
با اعتقاد و معتقدِ کامل العیار
رفتند قدسیاں بدیار بہشت عدن
تاریخ یافتند خصار بہشت عدن

" باہتمام کمترین غلامان معتقد خان سنہ جلوس فرخ شاہی اہتمام یافت سنہ ۳ ہجری
رقیمہ عبد اللہ شیریں رقم "

اور یہ اشعار دروازہ بیرون پر کندہ ہیں :

قطعہ

از حکم بادشاہ جہاں خسروِ انام
کردہ مزار خواجہ دین قطبِ نہ فلک

تعمیر شد مجر زیبا و منتظم
فرخ سیر شہنشہہ نہ آسمان غلام
گردو بگرد روضۂ دو آدم و ملک
مانند قبلۂ اشرف وچون کعبہ محترم

اب چند مدت سے سراج الدین بہادر شاہ نے صندل کا کٹہرا گرد مزار شریف کے لگا دیا ہے پائینتی آپ کی قبر مبارک کے حمید الدین ناگوری کی تربت ہے۔ نام ان کا محمد عطاء اللہ تھا۔ اولیائے ہند میں بڑے مشائخ وقت سے تھے۔ اول ان کو شیخ شہاب الدین سہروردی اور میر شمس الدین سمرقندی سے فیض خلافت حاصل ہوا اور ایک سال دو مہینے مدینہ منورہ میں حاضر رہے۔ پھر حضرت خواجہ قطب الدین کی خدمت میں مشرف ہوئے۔ بعد وفات حضرت خواجہ کے ۶۷۴ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ یہ عبارت ان کے لوح مزار پر کندہ ہے۔

"ہذا مرقد المنوّر قطب الاولیا فی الآفاق وغوث الاتقیا بالاستحقاق الامام العالم العامل الولی الفاضل الکامل شیخ حمید الدین نور اللہ مرقد المنورہ عمرۃ الروضہ خادم الفقر اسلیمان بن شیخ بھیکہ فی ۶۷۴ھ ہجری، ربیع وسبعین وسبع مائۃ"

اور نزدیک آپ کے مزار کے اور بھی بہت بزرگوں کی قبریں ہیں اور آپ کی دو صاحبزادیاں بھی وہیں مدفون ہیں اور بسمت غربی میں درگاہ کی دیوار سے ایک مسجد تمام سنگ مرمر کی بنائے قطب الدین بہادر شاہ بن عالمگیر ملحق ہے اور مجر اس کی قبر کا بھی اسی مسجد میں ہے اور درگاہ کے باہر غرب رو بفاصلہ چند قدم مزار حضرت مولانا فخر الدین صاحب کا کہ جن کے اوصاف کمالات ورد زبان خلائق ہیں تمام سنگ مرمر مصفا سے بہت مقام متبرک پر بنا ہوا ہے۔ اور یہ تاریخ اس کی لوح پر کندہ ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ، اللّٰہم صل علی محمد وعلیٰ آلِ محمد۔

تاریخ

بگذاشت فخر دیں چوں مہمان سرائے فانی
بر آستانہ جا داد آں قطبِ جاودانی

سال وصال آں مہ از غیب چوں بجستم

تاریخ گفت ہاتف خورشید دوجہانی

(من کلام سید الشعرا فخر الدین مقبول الٰہی)

پاس اس مزار کے ایک مسجد سنگین بہت قدیم ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت خواجہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے مع اور اصحاب وخلفا کے اس مسجد کو کچھ بنایا تھا۔ پھر اسلام شاہ نے اپنے عہد میں اور فرخ سیر نے اپنے زمانے میں اس کے تین درجہ بنوا دیے اور یہ تاریخ اس پر کندہ ہے:

تاریخ

مورد لطف وعنایات شہ والاجناب

ساخت از روئے ارادت وز رسوخ اعتقاد

خسرو فرخ سیر، شاہنشہ مالک رقاب

مسجد زیبا بناؤ سجدہ گاہ شیخ وشاب

با سروش غیب ہاتف گفت در گوش خرد

سال تاریخ بنائش "بیت ربی مستجاب"

اس مسجد میں بسبب پانی نہ ہونے کی نہایت تکلیف تھی ۱۲۶۳ھ ہجری میں ندیم الدولہ حافظ داؤد خاں نے وہاں ایک باولی پختہ بہت وسیع وعمیق کئی ہزار روپے لگا کر بنوا دی۔ اس سے نمازیوں کو بہت آسائش ہوگئی اور کنارہ تالاب مذکور پر بہت عمارات ومکانات قدیم وکہنہ ہیں کہ ان کی شرح لاحاصل ہے۔ مگر ایک اولیا مسجد بہت مقام نورانی ومتبرک ہے۔ کہتے ہیں اس کو بھی حضرت خواجہ صاحب نے اور ان کے خلفا نے اپنے ہاتھ سے مٹی کی ٹوکریاں لا کر بنایا تھا۔ اور وہاں چلہ کشی کیا کرتے تھے۔ اب کسی نے اس کو چونے کا پختہ بنا دیا ہے۔

نزدیک اس تالاب کے مقبرہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کا ہے کہ ان کے حالات وکمالات بھی تعریف انسان سے زیادہ اور تحریر وتقریر میں نہیں آسکتے۔ چنانچہ بائیس برس کی عمر میں جمیع علوم دینیہ مع حفظ کلام اللہ کے حاصل کی اور اسی عالم شباب میں ترک مرادات کر کے بیت اللہ شریف کو تشریف لے گئے اور وہاں بہت سے اولیا کی صحبت سے فیض باطنی حاصل

کیا اور کئی سال وہاں رہ کے علم حدیث بہت توجہ اور تحقیق سے تحصیل کیا اور پھر ہندوستان میں آ کے رشد و ہدایت میں مصروف رہے اور ایک سو جلد کتابیں اپنے علم دین اور آداب شرعیہ میں تصنیف فرمائی ہیں۔

ہندوستان میں علم حدیث نے بیشتر انھیں سے ترویج پائی۔ تاریخ ولادت آپ کی "شیخ الاولیا" اور وفات کی فخرِ عالم اور دوسری تاریخ وفات یکسال کی یہ ہے۔

تاریخ

فاضل ہند شیخ عبدالحق
حامیِ شرع و دین بہ نیک نفس
عالم و متقی و عارف بود
بعلوم غریب واقف بود
شرح مشکوٰۃ از تصانیفش
تازی و فارسیست تالیفش
عمر او بود یکصد و دو سال
کان زماں شد ازیں سرائے ملال
سال الفش خرد عیاں نہفت
بخلائق بہشت مرد بگفت

حالات حضرت خواجہ قطب الاقطاب بختیار کاکیؒ

حضرت قطب الاقطاب کے والد بزرگوار کا اسم مبارک کمال الدین احمد موسیٰ اوشی اوش ایک قصبہ ہے۔ دیار ماوراالنہر میں اور بعضوں کے نزدیک من مضافات فرغانہ۔ شجرہ خواجگانِ چشت میں آپ مرید و خلیفہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہیں۔ رسالہ مناقب اولیا میں منقول ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہ فرماتی تھیں کہ شبِ تولد کو آدھی رات کے وقت دیکھا کہ تمام گھر ایک لمعۂ نور سے منور تھا۔ پندرہ سیپارے قرآن شریف کے شکم مادر میں تعلیم حق

سے آپ نے یاد کیے تھے۔

سیر العارفین میں مسطور ہے کہ جب حضرت خواجہ قطب الدین یک نیم سالہ ہوئے تو آپ کے والد نے انتقال کیا اور والدۂ پاکدامن نے اپنی آغوشِ عصمت میں پرورش کیا۔ جب آپ نے قدم چہد چار سال لگی ۔ سے باہر رکھا تو آپ کی والدہ مقدسہ نے ایک پیر صالح کو کہ آپ کے ہمسایہ رہتے تھے بُلا کر حضرت خواجہ کو ہمراہ کیا اور حلوۂ تازہ اپنے ہاتھ سے پکا کر ایک ایک طبق میں ان کے ساتھ دیا کہ میرے فرزند کو کسی معلّم باخدا کو تفویض کر دو کہ اس کو کلام اللہ تعلیم کرے۔

پیر صالح ان کو لے کے چلا کہ اثناء راہ میں ایک بزرگ ملاقی ہوئے۔ اُنھوں نے پوچھا کہ اس لڑکے کو کہاں لے جاتا ہے۔ اُس پیر نے بیان کیا کہ یہ لڑکا ایک خانوادہ اہلِ صلاح سے ہے اور پدر بزرگوار اس کا دنیا سے گزر گیا ہے۔ اس کی والدہ عفیفہ نے آج اس کو مکتب میں بھیجا ہے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اس لڑکے کو میرے ہمراہ کر میں اس کو ایسے معلّم صالح کو سپرد کروں کہ اُس کی برکتِ تعلیم سے اس کو کمالِ ظاہر و باطن کرامت ہووے۔ اُس پیر نے کہا۔ بہتر جو رضا آپ کی۔

وہ بزرگ حضرت خواجہ کو امام ابوحفص کی خدمت میں لے گئے کہ وہ ایک معلّم باخدا اور ولیِ کامل تھے اور نہایت عبادت و تقویٰ میں مکمل اور کہا کہ یہ لڑکا زمرۂ اولیائے کبار میں اور مشائخ نامدار میں سے ہونے والا ہے۔ اس کو قرآن مجید بہت تشفقی اور کمال توجہ سے تعلیم کرنا چاہیے۔ امام ابوحفص نے منظور کیا اور بدل قبول فرمایا۔ جب بزرگ چلے گئے تو امام ابوحفص نے حضرت خواجہ سے فرمایا کہ تو جانتا ہے کہ یہ کون شخص تھا جو میرے پاس تم کو سونپ گیا ہے آپ نے کہا، میں نہیں جانتا۔ ابوحفص نے کہا کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔

کہتے ہیں کہ چند مدت میں آپ کو یہ حالت بہم پہنچی کہ ایک ساعت ریاضت و مجاہدے سے فارغ نہیں ہوتے تھے۔ اور ایک دم عبادت و اشغال سے فرصت نہیں پاتے تھے۔ پھر حضرت خواجہ بزرگ وہاں وارد ہوئے اور خواجہ قطب الدین شرف بیعت اور خلعتِ خلافت سے مشرف ہوئے اور مرتبہ کمال کو عروج فرمایا۔

کہتے ہیں سنِ بست سالگی میں جملہ فضائل ظاہری اور کمالاتِ باطنی حضرت خواجہ نے حاصل کر لیے، پھر آپ دہلی تشریف لائے اور متاہل ہوئے۔ ہمیشہ عالمِ استغراق میں واصل باللہ رہتے اور بہت امراء و سلاطین آپ کی خدمت سے شرفیاب ہوتے تھے۔ اور تمام خورد و بزرگ آپ سے عقیدتِ صادق رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک بار حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اجمیر سے دہلی میں تشریف لائے۔ بعد چند مدت کے پھر اجمیر شریف تشریف لیجانے لگے حضرت خواجہ قطب الدین بھی آپ کے ہمراہ اجمیر کو چلے۔ شہر میں جو حضرت خواجہ قطب الدین کے جانے کی خبر ہوئی تو ایک غوغائے عظیم اٹھا اور ہزاروں آدمی آپ کے فراق سے گریاں و نالاں ہوئے۔ اور سلطان شمس الدین التمش باپیادہ آپ کی خدمت میں دوڑا۔ جب خواجۂ بزرگ نے آپ کی مفارقت میں تمام شہر کا ایسا حال مضطر دیکھا تو فرمایا کہ بابا قطب الدین تم یہیں قیام کرو۔ اس شہر کو ہم نے تمہاری پناہ میں سپرد کیا۔ آخر حضرت خواجہ نے مراجعت کی اور اپنے مقام پر تشریف لائے۔

کہتے ہیں کہ باوجود رجوع خلق اللہ کے دنیا و مافیہا کو اپنے نظر کیمیا اثر میں برابر دانۂ خشخاش کے نہ جانتے تھے اور کسی سے ایک حبہ بطریق ہدیہ نہ لیتے تھے اور برابر فقر و فاقہ سے خوش رہتے تھے۔ چنانچہ آپ کے ہمسایہ میں ایک مسلمان بقّال رہتا تھا شرف الدین نام۔ اُس کی بیوی آپ کے حرائے عصمت میں حاضر ہوتی تھی۔ جب آپ کے حرم محترم کچھ احتیاج و ضرورت ہوتی تو اُس سے کچھ ماکولات قرض لے کر پرورش اہل و عیال کیا کرتی تھیں اور پھر ادا کر دیتی تھیں اور حضرت سے اس باب میں کچھ اطلاع نہ کرتی تھیں۔

ایک دن اس زنِ کم حوصلہ نے کہا کہ اے بی بی اگر میں تمہارے ہمسایہ میں نہ ہوتی اور قرض نہ دیتی تو تم پر وقت بہت تنگ ہوتا۔ یہ بات حرم معظمہ حضرت خواجہ کو نہایت ناگوار ہوئی اور ذکر اس بات کا حضرت کے روبرو کیا۔ آپ نے ذرا تامل کیا اور فرمایا کہ جب احتیاج ہو اس طاقِ حجرہ میں بسم اللہ کہہ کر ہاتھ ڈالنا۔ اس میں سے کاک نکالا کریں گی اس سے قوت لایموت عیال و اطفال کا کرتا۔ چنانچہ اسی طرح عمل میں آتا تھا۔ اسی وجہ سے آپ کو بختیار کاکی کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

اسرار المتحیرین ملفوظاتِ مخدوم شیخ فرید الدین تصنیف شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہما میں مرقوم ہے کہ ایک وقت حضرت خواجہ قطب الدین عالمِ فکر واستغراق میں تھے۔ سوائے نمازِ پنجگانہ کے کسی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ تین روز اسی حال پر گزر گئے اور یہ درویش بھی آپ کی خدمت سے ایکدم جُدا نہ ہوا اور تین شبا روز دست بستہ استادہ رہا۔ آخر اشتہا مجھ پر بہت غالب ہوئی۔ مگر مقدور نہ تھا کہ آپ کی حضوری سے غائب ہوکر غذا تناول کروں میں اسی اندیشہ میں تھا کہ آپ نے ہاتھ گریبان میں ڈالا اور ایک کاک نکال کر مجھ کو مرحمت کیا اور اشارہ اس کے تناول کا فرمایا۔ فقیر اس کرامت کے مشاہدہ سے کمال منفعل ہوا۔ قریب تھا کہ مانند نمک کے گھُل جاوے کہ اتنے میں آپ نے ارشاد کیا کہ اے فرید اندیشہ نہ کر انشاء اللہ تعالیٰ اس عالم سے تو بھی بہرہ یاب ہوگا۔

فوائد السالکین ملفوظ خواجہ قطب الدین تصنیف شیخ فرید الدین میں منقول ہے۔ یعنی حضرت خواجہ قطب الدین فرماتے ہیں کہ ایک روز میں اور قاضی حمید الدین ناگوری مسافر دریا تھے اور عجائبات قدرت الٰہی کا تماشہ کرتے تھے۔ چنانچہ کنارۂ دریا پر بیٹھے تھے۔ کہ آثار گرسنگی نے تقاضا کیا اور اس محل پر بہم پہنچنا طعام کا محال معلوم ہوتا تھا۔ ناگاہ دیکھا کہ ایک گوسفند دو نان پاکیزہ اپنے منہ میں لے کر حاضر ہوئی اور ہمارے پاس رکھ کر چلی گئی۔ اس امرِ عجیب کو دیکھ کے جانا کہ یہ گوسفند نہ تھی بلکہ بحکم الٰہی کسی مردانِ غیب نے یہ دعوت کی ہے۔ اس روٹی کو تناول کیا اور شکر ادا کیا۔ اتنے میں کیا دیکھا کہ ایک گژدم برابر شتر کے پیدا ہوا اور بہت تعجیل سے مانند بادِ تند کے چلا جاتا تھا۔ قاضی اور میں متحیر ہوئے اور کہا کہ یہ اس کا بے محابا نہ جانا خالی از حکمت نہیں ہے اس کے پیچھے چل کر کشف اسرار کرنا چاہیے ہم اس کے دنبال ہوئے۔ قضائے کردگار بیچ میں دریا حائل ہوا اور بے کشتی عبور وہاں سے مشکل پڑا اور گژدم شنا کر کے وہاں سے گزرنے لگا ہم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ الٰہی اگر ہمارا فقر کامل وصادق ہے تو اس دریا سے عبور میسر ہو۔ اس مناجات سے دریا میں راستہ ہموار ہوگیا۔ ہم اس سے گزر گئے۔ اب گژدم آگے آگے جاتا ہی اور ہم اس کے متعاقب میں چلے جاتے ہیں۔ آخر ایک درخت دیکھا کہ اس کے نیچے ایک شخص بے خبر سویا ہوا ہے اور اس

طرف سے ایک مار سیاہ نزدیک پہنچا ہے اور قریب ہے کہ اس شخص کو ہلاک کرے کہ اتنے میں وہ گزدم سانپ کے برابر جا پہنچا اور اس کے سر پر بیٹھ کر ایک نیش مارا اور اس کو نیست و نابود کر دیا اور وہاں سے ناپید ا ہو گیا۔

ہم نے اس سانپ کو نزدیک جا کے دیکھا تو اس کا جثہ قیاسی ہزار من سے کم نہ ہو گا ہم نے آپس میں کہا کہ یہ شخص بیدار ہو تو اس کی زیارت سے مشرف ہوں کہ شاید یہ مرد بہت بزرگ ہے کہ حافظِ حقیقی نے اس کی بقائے حیات کے واسطے اس گزدم کو اس اژدرِ اجل پیکر پر مسلط کیا اور اس کی جان کو بچایا۔ قریب گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص مستِ شراب ہے اور قے کر کے بحالت خراب پڑا ہے۔ انھوں نے کمال تعجب کیا اور بہت متحیّر ہوئے۔ اسی وقت ہاتف غیبی نے آواز دی کہ اے عزیزان اگر ہمیں صالحان و پارسان را حافظ کنم پس فاسقان و گناہگاران را کہ حفاظت کند۔

نقل کرتے ہیں کہ حضرت خواجہ بعد نماز عید کے اس جگہ تشریف لاتے کہ جہاں اب روضۂ مبارک آپ کا ہے اور وہ زمین بہت مصفّا اور پاکیزہ تھی آپ نے اس قطعہ کو دیکھ کے فرمایا کہ ازیجا مرا بوے دلہا می آید اور فی الحال اس زمین کے مالک کو بلا کر اپنے زرِ خاص سے خرید کر اپنا مدفن مقرر فرمایا۔ بعدہٗ ایک روز خانقاہ شیخ علی سنجری میں کہ آپ کے ایک خلفا میں سے تھے۔ مجلس سماع آراستہ تھی۔ اس شعر پر آپ کو وجد ہوا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

لکھتے ہیں کہ تین روز برابر آپ کی یہی حالت رہی۔ مصرع اول پر فنا ہو جاتے تھے اور مصرعہ ثانی سے زندہ ہو جاتے تھے۔ چار شبا روز اسی حالت میں مستغرق رہے۔ جب وقت نماز ہوتا تھا تو آپ نماز پڑھ لیتے تھے اور پھر اسی بیت کا اشارہ فرماتے تھے اور قوال آپ کے روبرو اسی کو گاتے تھے۔

اس زمانے میں کوئی طبیب حاذق تھا شمس الدین نام حضرت خواجہ کو اس کے نزدیک لے گئے تا کہ کچھ معالجہ کرے۔ حکیم نے سُن کے کہا کہ دل آپ کا کباب ہو گیا ہے۔ آتشِ عشقِ الٰہی

سے جگر کھل گیا ہے۔ نمک شورِ محبت سے اب دوا آپ کی فقط شربت دیدار ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی عالم وجد میں روز دوشنبہ تاریخ چہار دہم ربیع الاوّل ۶۳۳ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ آپ کی دو صاحبزادے تھے۔ ایک شیخ احمد کہ بڑے صاحب جذبات و کمالات ہوئے اور ان کی قبر شریف حضرت کے مزار مبارک کے پاس ہے اور دوسرے شیخ محمدؒ کہ انھوں نے عمر طفلی میں بعمر ہفت سال کی رحلت فرمائی۔

کبھی حضرت خواجہ شعر بھی تصنیف فرماتے تھے۔ چنانچہ یہ نظم آپ ہی کی تصنیف ہے

نظم

اے بگرد شمع رویت عالمے پروانۂ
وز لب شیریں تو شوریست در ہر خانۂ
من بجندیں اشنائی میخورم خون جگر
آشنا را حال اینست وائے بر بیگانۂ
قطب مسکیں گر گناہ میکند عیبش مکن
عیب نبود گر گناہے میکنند دیوانۂ

اور یہ تاریخ آپ کی وفات کی ہے:

تاریخ

فیض بخش جہاں بصدق و یقیں
قطب آفاق خواجہؒ قطب الدین
لقبش بختیار کاکی، دان
چوں اوشی است اوشیش برخوان
از ربیع بودہ تخت چار دہم
بود کان قطب شد بچرخ نہم
عقل تاریخ نقل آں محمود
"آب جنت بقطب دیںؒ فرمود"

تین روز تک درگاہ شریف میں ہم نے مقام کیا اور بہت عمارات وخرابے دیکھے۔ شاہجہاں آباد سے یہاں تک اور یہاں سے تغلق آباد اور بارہ پُلے تک یہ سب دہلی آباد تھی۔

ابتدائے دہلی

ابتدائے دہلی کو اس طرح لکھتے ہیں کہ اول اس کو اندرپرست کہتے تھے اور وجہ اس کی یہ کہ انھوں نے اس سرزمین متبرک پر موتیوں کا دان کیا تھا۔ پرست ہندی میں بخشش کو لکھتے ہیں جب یہ مقام اندرپرست مشہور ہوگیا۔

ہستنا پور سے اندرپرست تک تیس چالیس کوس طول میں یہ آبادی تخت گاہ راجگان پانڈوان رہے۔ بعد ان کے خاندان کی زوال سلطنت کے سنہ تین سو سات بکرماجیت میں راجہ دھولی نزدیک درگاہ خواجہ صاحب کے ایک شہر علیحدہ آباد کیا اور نام اس کا دہلی رکھا اور بعضے کہتے ہیں کہ اسی واسطے اس شہر کو دہلی کہتے ہیں۔ اور کوئی بیان کرتا ہے کہ اس کو راجہ دلیپ نے اپنے نام پر بنایا ہے اور بعضے ضعیف سی تاویل یہ بھی کرتے ہیں کہ یہ اقلیم ہندوستان کی دہلی ہے۔ یعنی ہندوستان کی چوکھٹ ہے۔ اس واسطے اس کو دہلی کہتے ہیں۔ بہر حال یہ شہر قدیم ہے۔ بیشتر دہلی مشہور رکھا، اور اب دلی کہتے ہیں۔ اوّل دلی میں راجہ انگپال تونور نے سمت چار سو انتیس یا چار سو چالیس میں ایک قلعہ بنایا کہ جس کو پرانا قلعہ کہتے ہیں اور ہمایوں نے از سرِ نو اس کو تیار کر کے دین پناہ نام رکھا۔ پھر سمت ایک ہزار دو سو میں رائے پتھورا نے کہ جس کو پرتھوی راج کہتے ہیں ایک قلعہ تعمیر کیا کہ لاٹھ کے پاس اب بھی اس کی کچھ بنیاد باقی ہے۔

بعد اس کے جبکہ سواد دہلی قدم سعادت لزوم اہل اسلام سے شرف اندوز ہوا تو سلطان قطب الدین ایبک نے قلعہ رائے پتھورا میں قصر سفید بنا کیا اور اس میں اپنا زمانہ بسر کیا۔ بعدۂ سلطان ناصر الدین محمود نے کہ وہ ۶۴۴ھ میں بادشاہ ہوا۔ قصر ہزار ستون بنانا شروع کیا اور سلطان غیاث الدین بلبن نے اس کو تمام کیا اور سوائے اس کے بلبن نے ایک اور قلعہ بنایا کہ اس کا نام مرزغن رکھا۔

بعد اس کے سلطان معز الدین کیقباد نے ایک قلعہ بنا کیا اور اس کا نام کیلوگڈھی رکھا۔ بعد

اس کے ۶۸۹ھ ہجری میں سلطان جلال الدین خلجی نے ایک کوشک لعل تعمیر کیا۔ پھر ۶۹۵ھ ہجری میں سلطان علاؤالدین خلجی نے ایک قلعہ تعمیر کیا اور اس کا نام سیری رکھا۔ بعد ازاں سلطان غیاث الدین تغلق نے ایک قلعہ اور شہر علیحدہ آراستہ کیا کہ اب تک تغلق آباد کی کچھ عمارات موجود ہیں۔ سن ۷۲۵ھ ہجری میں تغلق عادل شاہ نے عادل آباد علیحدہ معمور کیا۔ جبکہ نوبت سلطنت کی سلطان فیروز شاہ تک پہنچی تو اُس نے جدا ایک شہر ۷۵۵ھ ہجری میں فیروز آباد بنوایا اور -- فیروز شاہ کوٹلہ وغیرہ بہت سی عمارات و مکانات تیار کیے۔ بعد اُس کے سید خضر خان نے کہ دست نشاندہ امیر تیمور تھا۔ اپنے زمانہ تخت نشینی دہلی میں کنارہ دہلی پر سنہ ہجری میں ایک قلعہ بنایا۔ پھر ۸۲۸ھ ہجری میں مبارک شاہ بن خضر خان نے قلعہ مبارک آباد تعمیر کیا۔ اسی طرح کے آبادی شاہجہاں آباد تک ترقی پکڑتی گئی اور آخر کو سب ویران و تباہ ہو گئی۔ اب نہ وہ قصر ہے نہ بارگاہ فقط ویرانہ ہے اور عبرت گاہ :

کتاب راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ جب کہ ترتیا جگ آخر ہوا تو اخلاف کورو پانڈو میں (کورک چھیتر)، جنگ عظیم کہ جس کو مہابھارت کہتے ہیں واقع ہوئی اور اٹھارہ روز برابر کشت و خون جانبین میں رہا اور لکھہا آدمی طرفین سے مقتول و مجروح ہوئے۔ آخر میں درلیودھن پسر کورد کو شکست ہوئی۔ وہ مارا گیا اور راجہ یدھشٹر نے فتح پائی اور تخت نشین ہوا اور اڑتیس برس بعضے لکھتے ہیں کہ سوا سو برس یہ راجہ سلطنت کرتا رہا۔

جب راجہ یدھشٹر معہ اپنے چار بھائی اور ایک بی بی کے یعنی بھیم وارجن و نکل و سہدیو اور دوریتی (دروپدی) کے ترکِ سلطنت کر کے کوہِ ہمالہ کے برف میں گھلنے کے واسطے گیا تو راجہ برجھہ بن ابھیمن (ابھی منیو) بن ارجن اپنے بھائی کے پوتے کو سلطنت پر بٹھا گیا اور وہ بہت عدل و داد کے ساتھ حکمرانی کرتا رہا۔ آخر کو کسی مرتاض کی بد دعا سے اُسے سانپ نے کاٹا اور اس سے جانبر نہ ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب راجہ پرچھت دررآرائے راجگی ہوا ہے تو کلجگ کا سنہ اول یا سال نہم تھا۔ بعد راجہ پرچھت کی جنمیجے ۶۵ھ کلجگ میں راجہ ہوا۔ اس نے اپنے باپ کے انتقام خون

جمنا پر ہون کر کے ہزاروں سانپوں کو جلا ڈالا۔ اس کے بعد سنہ ۱۴۹ھ میں راجہ اشمبد راجہ ہوا۔ اس کے عہد میں جمشید بادشاہِ ایران مقتول ہوا اور ضحاک اورنگ آرائے ایران ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۲۲۱ھ میں ادھن راجہ ہوا۔ پھر سنہ ۳۰۹ھ میں راجہ ججات پھر سنہ ۳۹ھ میں جسرتھ راجہ ہوا اور سنہ ۴۶۵ھ میں راجہ دشٹ دون اور سنہ ۵۴۹ھ میں راجہ اوگرسین اور سنہ ۶۲۰ھ میں راجہ سورسین اور سنہ ۶۹۵ھ میں راجہ ست ونت اور سنہ ۷۶۴ھ میں راجہ بجی اور سنہ ۸۴۸ھ میں راجہ ست پال اور سنہ ۹۱ھ میں راجہ نرہردیو اور سنہ ۹۶ھ میں راجہ سوکرت اور سنہ ۱۱۰۲ھ میں راجہ سوہن اور سنہ ۱۱۱۶ھ میں راجہ شرون چتر اور سنہ ۱۲۲۵ھ میں راجہ بھیکم اس کے عہد میں فریدون نے ایران میں خروج کیا اور سنہ ۱۲۷۲ھ میں راجہ دھنوان اور سنہ ۱۳۱۷ھ میں راجہ دریہہ اور سنہ ۱۳۶ھ میں راجہ اونے جائے اور سنہ ۱۴۰۸ھ میں راجہ دھنی اور اس کے عہد میں واقعہ ایرج طور وسلم کے ہاتھ سے ظہور میں آیا۔ پھر سنہ ۱۴۵۷ھ میں راجہ ابھی اور سنہ ۱۵۰۰ھ میں راجہ درشل اور سنہ ۱۵۵۳ھ میں راجہ سیناک اور سنہ ۱۵۷۹ھ میں راجہ کھیم، اس کو بشرو اُس کے وزیر نے مار ڈالا اور خود راجہ ہوگیا یہاں سے سلسلہ پانڈوان کا تمام ہوا۔

کتاب بھاگوت میں سلسلہ راجگان پانڈوان کا اس طرح سے لکھا ہے کہ اول جدشٹر پھر راجہ پرچھت، راجہ جنمیجہ، راجہ سہسرانیک، راجہ اسیم کرشن، راجہ نیمی، راجہ چتررتھ، راجہ کب رتھ، راجہ برشٹ مان، راجہ سکھین، راجہ سونیتھ، راجہ پرپلیپ، راجہ سونی، راجہ میدھابی، راجہ ترپن جی، راجہ تم جی، راجہ برہدرتھ، راجہ سوداس، راجہ ستانیک، راجہ درمنا، راجہ بھینر، راجہ ڈنڈمان، راجہ چھیمک، غرض سنہ ۱۷۳۷ھ میں راجہ بشرو وزیر کھیم کو مار کر اس کا جانشین ہوگیا۔

اُس کے عہد میں منوہر بادشاہ ایران ہوا۔ پھر سنہ ۱۷۷۴ھ میں راجہ شورسین راجہ ہوا اور سنہ ۱۸۱۶ھ میں راجہ بیرشاہ اور سنہ ۱۸۲۸ھ میں راجہ آننگ، اس کے عہد میں نوذر ایران کا بادشاہ ہوا اور سنہ ۱۹۱۵ء میں پریچھت دویم اور سنہ ۱۹۵۰ھ میں راجہ درہہ اُس کے عہد میں دلنواز راجہ کشمیر بصورت یار مسخ ہوگیا اور سنہ ۱۹۹۴ھ میں راجہ سودہ پال اور سنہ ۲۰۲۴ھ میں راجہ سوررت اور سنہ ۲۰۵۴ھ میں راجہ سن بجے اس کے زمانہ میں کیکاؤس ایران میں بادشاہ ہوا اور سنہ ۲۰۸۸ھ میں راجہ امرجودہ اور سنہ ۲۱۵۸ھ میں راجہ امین پال اور سنہ ۲۱۲۸ھ میں راجہ سرونیتی۔ اس کے زمانہ میں ایلنجان بادشاہ مغل افراسیاب کے ہاتھ کشتہ ہوا اور سنہ ۲۳۲۹ھ میں راجہ پدارتھ اور سنہ ۲۴۵۴ھ میں راجہ بدہل اس کو مرماہ نامی نے مار کر راج لے لیا۔

سلطنت بشروا کے خاندان میں ختم ہوئی اور سنہ ۲۳۳۰ میں راجہ جگات سنگھ راجہ ہوا پھر سنہ ۱۳۴۷ میں راجہ شتروگھن اور سنہ ۲۳۶۶ میں مہی پت اور سنہ ۲۳۹۳ میں راجہ مہابل اور سنہ ۲۴۳۳ میں راجہ سروپ ونت اور سنہ ۲۴۶۱ میں راجہ بیرسین اور سنہ ۱۴۸۵ میں راجہ سنگھدمن اور سنہ ۲۵۵۲ میں راجہ جیت مل اور سنہ ۲۵۳۰ میں راجہ کلنک چتر اور سنہ ۲۵۶۹ میں راجہ کال کھن اور سنہ ۲۶۱۱ میں راجہ شترمردون اور سنہ ۲۶۹۱ میں راجہ جیون جات اور سنہ ۲۶۴۵ میں راجہ بھیر بھیچک اور سنہ ۲۶۵۸ میں راجہ بیرسین سنہ ۲۶۹۳ میں راجہ اودہت کاہ، یہ راجہ عیش و عشرت میں بہت مشغول رہتا تھا۔ وزیر دندھیر نامی کے ہاتھ سے مقتول ہوا۔ پھر اولاد دندھیر میں راج رہا اور سنہ ۲۷۱۶ میں دندھیر وزیر راجہ ہوگیا اور سنہ ۲۷۵۷ میں شنید ہج اور سنہ ۲۷۹۲ میں راجہ مہی سنگھ اور سنہ ۲۸۲۳ میں راجہ مہاجود اور سنہ ۲۸۶۳ میں راجہ ہرناتھ اور سنہ ۲۸۹۱ میں راجہ جیون راج اور سنہ ۲۹۳۴ میں راجہ اودے سین اور سنہ ۳۰۱۴ میں راجہ راج پال راجہ ہوا۔ اُس کی غفلت اور بے خبری سے شکونت والی کوہ کمایوں نے اس کے ملک پر قبضہ کرلیا اس کے بعد بکرماجیت والی اُجین سنہ ۳۰۴۴ میں شکونت کو ہزیمت دے کے سلطنت دہلی پر متصرف ہوا۔ پھر سمندپال جوگی سنہ ۳۱۴۳ میں مطابق سمت ایک سو تین بکرماجیت میں راجہ ہوگیا اس کے بعد سمت ۱۲۷ سنہ ۳۱۷۱ میں چندرپال اور سمت ۱۶۷ سنہ ۳۲۱۱ میں بین پال سنہ ۳۲۳۴ میں دلش پال اور سنہ ۳۲۷۹ سمت ۲۲۵ میں امرت پال اور سنہ ۳۳۱۳، سمت ۲۶۳ میں سوبجہ پال اور سنہ ۳۳۳۴، سمت ۲۹۰ میں رکھی پال اور سنہ ۳۳۷۲ سمت ۳۲۸ میں گوبند پال اور سنہ ۳۴۰ میں بینی پال اور سنہ ۳۴۵۵ میں مہی پال اور سنہ ۳۴۷۹ سمت ۴۳۵ میں ہرپال اور سنہ ۳۵۲۷، سمت ۴۸۳ میں بھیم پال اور سنہ ۳۵۵۸ سمت ۵۱۴ میں مدن لال اور سنہ ۳۵۹۶ میں کرم پال اور سنہ ۳۶۴۱ میں بکرم پال راجہ ہوا۔ اس نے تلوک چند والی بہرائچ سے ہزیمت پائی اور سنہ ۳۶۷۵، سمت ۶۳۱ میں تلوک چند راجہ دہلی ہوگیا اور سنہ ۳۶۷۵ سمت ۶۳۳ میں بکرم چند اور سمت ۶۵۵ میں کام چند اور سمت ۶۵۹ میں رام چند اور سمت ۶۷۳ میں رودر چند سمت ۶۹۱ میں کلیان چند اور سمت ۶۷۶ میں بھیم چندر اور سمت ۷۲۴ میں گوبند چند اور سمت ۷۴۶ میں رانی بھیم دیوی، چونکہ بھیم دیوی لاولد تھی ہربریم نام ایک عابد کو سمت ۷۴۸ میں اس کی جائے تخت نشین کردیا۔ اُس کے بعد سمت ۷۵۷ میں گوبند پریم اور سمت ۷۸۰ میں

گوپال پریم اور سمت مہاویر راجہ ہوا۔ اس کو سمت ۱۰۹ میں دیبی سین نے گرفتار کر کے راجہ ہوگیا۔
بارہ پشت تک اس کے خاندان میں سلطنت دہلی رہی۔ آخری اس خاندان کا راجہ سمت ۱۰۳۱ میں
دامودر سین بالکھنی سین ہوا اس کو ۱۰۶۰ء میں دیپ سنگھ والی سوالک نے قید کرلیا اور خود راجہ
ہوگیا۔ اس کی آٹھ پشت میں سلطنت رہی۔ آخر میں راجہ اس خاندان کا جیون سنگھ انتظام
امور ریاست میں بہت تغافل و تکاہل کرتا تھا۔ پرتھوی راج چوہان نے دہلی پر فوج کشی کر کے
جیون سنگھ پر فتح پائی اور راجہ دہلی ہوگیا۔ پھر سمت ۱۲۴۹ میں سلطان شہاب الدین غوری نے
پرتھی راج کو شکست دے کر دہلی پر تسلط حاصل کیا۔ پرتھی راج پر حکومت اہل ہند نے خاتمہ پایا
اور بعضے روایت کرتے ہیں کہ پرتھی راج کہ جس نے جیون سنگھ کو شکست دی یہ اوّل تھا اور جو
پرتھی راج معروف بہ پتھورا کہ جس نے شہاب الدین غوری سے ہزیمت پائی۔ یہ آخر کو ہوا اور
تفصیل اس کی اس طرح لکھتے ہیں کہ سمت ۸۴۱ میں اننگ پال قوم آہور اندرپرست کے راج
پر مسلط ہوا۔ اور اس نے اندرپرست کے پاس ایک شہر آباد کیا اور اس کے خاندان میں بیس
راجہ چارسو بینتیس برس ایک مہینے ستائیس روز تک سلطنت کرتے رہے۔ آخر میں راجہ اس
قوم کا پرتھی راج نامی پتھورا کے تھا۔ اس میں اور راجہ مالدیو چوہان میں جنگ واقع ہوئی۔ راجہ
مالدیو پرتھی راج پر فتحیاب ہوا۔ سمت ۸۴۸ میں مالدیو دہلی کا راجہ ہوا۔ اس کے خاندان میں مانک
دیو اور راول دیو اور سہردیو اور بلدیو پشت در پشت راج کرتے رہے۔ راجہ بلدیو لاولد تھا۔ مگر
نواسہ اس اس کا پتھورا نام راجہ اجمیر کے صلب سے تھا اور اس کو اس نے اپنا بیٹا کر لیا تھا۔ بعد راجہ
بلدیو کے پتھورا راجہ ہوا اور بعضے بیان کرتے ہیں کہ راجہ اننگ پال کی دو لڑکیاں تھیں۔ ایک کو
راجہ   والی اجمیر سے بیاہ دیا اور دوسری کی شادی راجہ قنوج سے کردی۔ سومواد کا بیٹا پتھورا
اس کو اننگ پال نے اپنا متبنیٰ کر کے ولی عہد کیا بعد اس کے مرنے کے پرتھی راج راجہ دہلی ہوا۔
واللہ اعلم۔

بعد مقتول ہونے پتھورا کے سلطان شہاب الدین غوری کا دخل دہلی پر بالکل ہوگیا مگر بعد فتح کے یہ اپنی دارالسلطنت کو مراجعت کرگیا اور ۶۰۲ھ ہجری میں منزل دمنک میں شہید ہوا سلطنت پندرہ سال۔ یہ اس کی تاریخ شہادت ہے۔

تاریخ

شہادت ملک بحروبر شہاب الدین
کز ابتدائے جہان مثل او نیامد یک
سیوم زغرہ شعبان وسال شش صد و دو
فتاد در رہ غزنین منزل دمیک

کہتے ہیں کہ سلطان شہاب الدین کے جانے کے بعد گولہ راؤ پتھورا کا بیٹا شہر دہلی پر پھر قابض ہوگیا تھا۔ سلطان قطب الدین ایبک نے سرنو فتح کیا اور بالاستقلال بادشاہ دہلی ہوا۔ سلطنت اس کی چار سال بعد اس کے آرام شاہ پسر خواندہ قطب الدین یکسال بعدہ، سلطان شمس الدین التمش بست وہشت سال بعدہ رکن الدین فیروز شاہ بن شمس الدین التمش چند روز، بعدہ سلطان رضیہ بنت شمس الدین ۳ سال بعدہ، معزالدین بہرام شاہ بن شمس الدین دو سال و یک ماہ بعدہ، سلطان علاؤالدین مسعود شاہ بن رکن الدین فیروز شاہ چار سال بعدہ، ناصرالدین محمود پسر سلطان شمس الدین یا ابن سلطان شمس الدین نوزدہ سال، بعدہ سلطان غیاث الدین بلبن بست سال سہ ماہ، بعدہ، معزالدین کیقباد بن ناصرالدین بغرا خاں بن غیاث الدین بلبن سہ سال سہ ماہ یہاں تک کہ غوریوں کی سلطنت رہی۔ پھر ۶۸۷ھ ہجری میں سلطان جلال الدین خلجی بادشاہ ہوا۔

سلطنت سات سال ۲ ماہ، بعد علاؤالدین خلجی ۲۰ سال ۳ ماہ، بعد شہاب الدین عمر بن سلطان

علاؤالدین ۳ ماہ، قطب الدین مبارک شاہ ۴ اسال ۴ ماہ بعد خسرو خان کہ معشوق قطب الدین مبارک شاہ کا تھا۔ سلطان کو قتل کرکے بادشاہ ہوا ۶ ماہ، پھر غیاث الدین تغلق شاہ کہ امراء سلطان قطب الدین مبارک شاہ سے تھا خسرو خان کو قتل کرکے خود بادشاہ ہوا۔ چار سال دو ماہ، بعدہ سلطان محمد شاہ عرف فخرالدین جونہ بن تغلق شاہ ۲۶ سال، بعدہ فیروز شاہ بن سالار رجب برادرزادہ تغلق شاہ ۳۶ سال ۷ ماہ، بعدہ غیاث الدین تغلق شاہ بن فتح خان بن فیروز شاہ یکسال چھ ماہ، بعدہ ابوبکر شاہ بن ظفر خان بن سلطان فیروز شاہ ۶ سال ۷ ماہ بعدہ سلطان علاؤالدین بن سکندر عرف ہمایوں شاہ بن محمد شاہ یک ماہ ۱۶ یوم، بعدہ ناصرالدین محمود شاہ بن محمد شاہ ۲۰ سال ۲ ماہ، اس کے زمانہ میں امیر تیمور گورگان دہلی میں آئے اور فتح و قتل کرکے پندرہ دن میں مراجعت کی۔ محمود شاہ شکست کھاکے مالوہ کو چلا گیا تھا امرا نے اسے پھر بلاکر بادشاہ کیا مگر سلطنت نے کما حقہ تسلط نہ پایا۔ بعد ان کے دولت خان لودی چند روز بادشاہ رہا، بعدہ سید خضر خان بن ملک سلیمان کہ امیر تیمور اس کو صوبہ دار ہندوستان کر گئے تھے۔ ۸۱۷ھ ہجری میں بادشاہ دہلی ہوگیا۔ ۷ سال ۳ ماہ، بعدہ مبارک شاہ بن خضر خان ۱۳ سال ۱۱ روز، بعدہ محمد شاہ بن خضر خان ۱۱ سال یک ماہ، بعدہ سلطان علاؤالدین بن سلطان محمد شاہ ۹۳ سال ۷ ماہ ۱۶ روز پھر ۸۵۵ھ ہجری میں سلطنت دہلی ان کے دست اختیار سے نکل کر سلطان بہلول لودھی کے ہاتھ آئی۔ ۳۸ سال ۸ ماہ، بعدہ سلطان سکندر بن سلطان بہلول لودھی ۲۸ سال ۵ ماہ، بعدہ سلطان ابراہیم بن سلطان سکندر لودھی۔ اس کے عہد میں ظہیرالدین بابر ہندوستان میں آئے اور پانی پت کے میدان میں سلطان ابراہیم مقتول ہوا ۲۲ سال ۲ ماہ، اور بابر تخت نشین دہلی ہوگیا۔ ۳۷ سال مع کابل وغیرہ در ہند ۵ سال، بعد ظہیرالدین بابر کے نصیرالدین ہمایوں نے افسر شاہی سر پر رکھا۔ سلطنت ۱۲ سال بعد چند مدت کے شیر خان بن فرید خان سُور (نام قوم) افغان ہمایوں سے سرکشی کرکے ملک بنگالہ پر اپنا قبضہ کرلیا اور پھر فوج بادشاہی سے مقابلہ کو مستعد ہوا۔ آخر کار لشکر شاہی نے شکست کھائی ہمایوں تو ایران کی طرف رونق افروز ہوئے اور شیر شاہ بفراغبالی حکمرانی دہلی

کرتا رہا سلطنت ۵ سال، بعد اس کے سلیم بن شیر شاہ بادشاہ ہوا۔ سلطنت ۸ سال بعد اُس کے فیروز شاہ بن سلیم شاہ صغیر سن کو تخت سلطنت پر بٹھایا۔ اس طفل کو مبارز خان عدلی بن نظام خان سُور برادر زادہ شیر شاہ ماموے طفل مذکور نے بعد تھوڑے دنوں کے محل میں آ کے قتل کیا اور محمد شاہ عدلی اپنا لقب مقرر کر کے ۹۵۵ھ ہجری میں بادشاہ بن بیٹھا۔ قریب دو سال کے بادشاہی کی۔ اس کے عہد میں بہت ظلم و بے انتظامی ہونے لگی اور اس کا لقب عدلی بہ لفظ اندہلی مبدل ہو گیا۔ بعد چند روز کے ابراہیم شاہ نے عدلی کو شکست فاش دی ابراہیم شاہ کو سکندر شاہ نے معزول کیا اور دہلی پر متصرف ہو گیا۔ سولہ برس خاندان شیر شاہ میں سلطنت رہی۔ تو ۹۶۱ھ ہجری میں ہمایوں بادشاہ پھر دہلی میں تشریف لائے اور سکندر شاہ کو شکست بالکل سلطنت پر قابض و متصرف ہو گئے اور اس وقت سے آج تک ان کی اولاد سلامت باکرامت موجود ہے۔ چنانچہ نسب نامہ ان کا امیر تیمور صاحبقران پہلے مرقوم ہو چکا ہے۔ اگر ان سلاطین عالیشان کا حال بطور تاریخ لکھا جاتا تو یہ کتاب سفرنامہ سے بادشاہ نامہ ہو جاتی اور ذکر دہلی کا تمام کیا۔ تاریخ بیست و سوم جمادی الاول کو خواجہ صاحب سے کوچ کیا اور دہلی تشریف کو مرخص کیا

سرجان مارشل
ترجمہ: ظفر الحسن

قلعۂ معلّٰی کی سیر

آگرہ میں گیارہ برس سلطنت کرنے کے بعد شاہ جہاں نے دہلی کو دارالسلطنۃ بنانے کا ارادہ کیا۔ کہتے ہیں کہ اصل وجوہات پائے تخت منتقل کرنے کے یہ تھیں کہ وہاں کی گلیاں تنگ اور زمین ناہموار تھی۔ اور قلعہ میں بھی جگہ کی قلت تھی۔ باشندگان شہر کو افواج اور بادشاہ و امراء کے ہمراہیوں اور ہاتھیوں کی بھیڑ بھاڑ سے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ متعدد بار دہلی کے معائنہ کے بعد ایک مقام جو تشیوں اور منجمان کی رائے سے سلیم گڑھ کی جنوب میں منتخب کیا گیا جس کو سلیم شاہ پسر شیر شاہ نے ۱۵۴۶ء میں ہمایوں کا حملہ روکنے کے لیے تعمیر کیا تھا۔

قلعہ شاہ جہاں آباد کی بنیاد بارہ ذی الحجہ ۱۰۴۸ھ مطابق ۱۶۳۸ء میں رکھی گئی۔ اس تاریخ کی خوابگاہ کے کتبہ سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔ سر سید احمد خاں مصنّف آثار الصنادید لکھتے ہیں کہ مجھے قلعہ کہنہ میں ایک زائچہ اس کا دستیاب ہوا۔ جس میں تاریخ بنا یہ لکھی تھی جمعہ کی رات کو پانچ ساعت اور بارہ دقیقے گذرنے کے بعد نویں محرم ۱۰۴۹ھ کو اس کی بنیاد رکھی گئی۔ قلعہ مذکور شاہ جہاں کے بیسویں سنہ جلوس میں بن کر تیار ہوا۔ جب کہ جہاں پناہ کابل میں رونق افروز تھے۔

شاہجہاں کا قلعہ میں داخلہ

مکرمت خاں مہتمم عمارت نے بادشاہ کی خدمت میں قلعہ کے معائنہ کے واسطے قدم رنجہ فرمائی کی درخواست کی چوبیسویں ربیع الاوّل ۱۰۵۸ھ مطابق ۱۶۴۸ء کو شاہ جہاں قلعہ میں اُس

دروازہ سے (جو دریا کی جانب ہے) داخل ہوئے اور دیوان عام میں پہلا دربار کیا قلعہ میں شاہی داخلہ تزک و احتشام سے ہوا اس طور پر کہ شاہزادہ دارالشکوہ نے اپنے والدِ ماجد کے سر پر قلعہ معلّٰی کے دروازے تک سونے اور چاندی کی بارش کی۔ محمدؐ صالح شاہی داخلہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

"کہ شاہجہاں نہایت شان و شوکت کے ساتھ خضری دروازہ سے دارالخلافہ (شاہجہاں آباد) میں داخل ہوئے۔ تمام راہ میں قاعدہ کے مطابق شاہزادہ محمد دارالشکوہ نے ان کے سر پر سے سونا و چاندی نچھاور کیا۔ اور لوٹنے والے فقیر فقراء مالا مال ہو گئے"۔

شاہی عمارات پہلے ہی سے آراستہ ہو چکی تھیں۔ ان کے صحنوں میں نفیس قالین بچھے تھے اور شاندار مخملی پردے لٹک رہے تھے۔ مقاماتِ نشست پر سرخ رنگ کے دوشالے پڑے تھے۔ گویا کہ تمام عمارات رشک نگار خانہ چین بنی ہوئی تھیں۔ دیوان عام کی چھت اور دیواریں مخمل اور چین و ختن کے ریشمین تھانوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور اس کے سامنے ایک شاندار "دل بادل" شامیانہ نصب تھا جس کا طول ستر گز اور عرض ساٹھ گز تھا اور جو خاص اس موقعہ کے واسطے احمد آباد کے شاہی کارخانہ میں ایک لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ اس شامیانہ کی چوبیں اور کٹہرا چاندی کا تھا اور اس کو تین ہزار چابکدست فراشوں نے کھڑا کیا تھا۔ دیوان عام کے چاروں طرف سونے کا کٹہرا تھا۔ اور تخت شاہی پر ایک اور شامیانہ لگا ہوا تھا جس میں موتیوں کی جھالر تھی۔ اور جواہرات سے مرصع سونے کی چوبیں تھیں۔ محمد صالح نے اس دربار کے موقعہ پر قلعہ اور اس کی عمارات کی آراستگی کا نہایت شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جس کا اعادہ یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"ماحصل اس عبارت کا یہ ہے کہ کارپردازان سلطنت نے محل شاہی اور غسل خانہ (دیوان خاص) کو جشن کے لیے آرائش دی۔ اور ہر کمرہ میں رنگ برنگ کے قالین بچھا کر جو ان کے عرض و طول کے مطابق نہایت لطافت و پاکیزگی کے ساتھ کشمیر میں تیار ہوئے تھے۔ رشک نگار خانہ چین بنا دیا۔ اور سونے چاندی کی جلا سے اس طرح رونق بخشی کہ محل شاہی غیرت مہر منور ہو گیا۔ اس کے بعد دیوان عام کی چھت و دیواروں کو ہر ملک کے نادر زرّیں

کپڑوں سے زینت دی اور اس کے حجروں اور ایوانوں کے چہار طرف زردوزی و مخمل کے پردے لٹکائے اور اس کے سامنے ایک "دل بادل" شامیانہ جس کو آسمان و زمین بلکہ نمونہ عرش بریں کہہ سکتے ہیں اور جو طول میں ستر اور عرض میں پینتالیس گز تھا اور ایک مدت میں ایک لاکھ روپے کی لاگت سے احمد آباد کے کارخانہ میں تیار ہوا تھا چار چاندی کے ستونوں پر بائیس گز اونچا کھڑا کیا گیا یہ شامیانہ بارہ سو گز زمین کو احاطہ کیے ہوئے تھا اور اس کے نیچے دو ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے ۔ اس کو تین ہزار چابکدست فراشوں نے کھڑا کیا تھا۔ اس شامیانہ کے اردگرد مخمل و زربفت کے چھوٹے چھوٹے شامیانے سونے و چاندی کے ستونوں پر کھڑے کر کے اُن کے چاروں طرف چاندی کا جنگلہ نصب کر دیا گیا اور بڑے شامیانے کے نیچے خیمہ شاہی چاندی کی چوبوں پر قایم کر کے مخمل و زربفت اور دیبائے گجراتی و ایرانی سے آراستہ کیا اور جگہ بجگہ جڑاؤ چھتر جس میں موتیوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں بلند کیے گئے اور انہیں مقامات پر مرصع و زریں تخت بچھائے گئے اور ایوان رفیع الشان کے وسط میں ایک مربع تخت گاہ قایم کر کے اُس کے چاروں طرف سونے کا جنگلہ لگا دیا۔"

شاہ جہاں نے اس موقعہ پر خاص طور پر دریا دلی سے انعام و اکرام تقسیم کیے بیگم صاحبہ (یعنی جہاں آرا بیگم) کو ایک لاکھ روپیہ مرحمت ہوا شہزادہ دارالشکوہ کو ایک خلعت فاخرہ مع مرصع ہتیاروں کے عنایت ہوا۔ اور ان کا منصب دس ہزاری سے بیس ہزاری کیا گیا۔ اور نیز دو لاکھ روپے اور ایک ہاتھی مع جھول کے عطا کیا گیا۔ شہزادہ سلیمان شکوہ و سپہر شکوہ پسران دارالشکوہ کو پانچسو اور تین سو روپے وظیفہ علی الترتیب علاوہ تنخواہ کے عنایت ہوئے وزیر اعظم سعد اللہ خاں کو ایک خلعت فاخرہ اور مرصع کٹار اور سات ہزاری منصب مرحمت ہوا۔ راجہ بٹھل داس کو خلعت ۔ پنجہزاری اور چار ہزاری ذات کا منصب عطا ہوا۔ اور مکرمت خاں جس کی زیر نگرانی قلعہ اور اس کی عمارات تعمیر ہوئی تھیں پنجہزاری منصب سے سرفراز کیا گیا

قلعہ کی پیمائش

یہ قلعہ ہشت پہل ہے جس کے دو ضلعے جانب شرق و غرب طویل ہیں اور باقی چھ ضلع جانب شمال و جنوب چھوٹے ہیں اس کا محیط قریب ڈیڑھ میل کے ہے۔ اور یہ طول میں تین ہزار فٹ اور عرض میں اٹھارہ سو فٹ ہے۔ دریا کی

جانب کی دیواریں ساٹھ فٹ بلند ہیں اور خشکی کی جانب اُن کی بلندی خندق سے پچھتر ۷۵ فٹ ہے۔ خندق کی گہرائی تیس فٹ اور چوڑائی پچھتر فٹ ہے۔ برنیئر کا بیان ہے کہ اس میں مچھلیاں کثرت سے تھیں اور اُسی مصنف کی یہ رائے ہے کہ قلعہ کی دیواریں ایک معمولی توپ خانہ کا مقابلہ تھوڑی دیر بھی نہیں کرسکتیں۔ خندق سے ملے ہوئے سرسبز و شاداب چمن تھے۔ جو ان دیواروں کے محاذ میں ایک نہایت خوش نما منظر پیش کرتے تھے۔ یہ غدر کے زمانہ تک باقی تھے لیکن اُجڑ چکے تھے۔ مشرق کی جانب قلعہ اور دریا کے درمیانی زمین پر برنیئر کے بیان کے مطابق ہاتھیوں کی لڑائی اور شاہی فوج کی ---- پریڈ ہوا کرتی تھی اور وہاں ایک دفعہ خود اس پر ایک مست ہاتھی نے حملہ کیا تھا۔ منوچی بھی اس بیان کی تصدیق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ شاہی جھروکے کے نیچے دن رات ایک مست ہاتھی نمایش کے لیے کھڑا رہتا تھا۔

قلعہ کے بنانے والے

علاوہ مکرمت خاں کے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور اشخاص جو قلعہ کی تعمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ غیرت[1] خاں دہلی کا صوبہ دار عزت خاں سندھ کا صوبہ دار الہ وردی خاں اور اُستاد حامد[2] و احمد تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خود بادشاہ نے گاہ بگاہ قلعہ کے نقشہ میں تغیّر و تبدّل کیا۔ سید احمد خاں اس بناء پر کہ آرفیس کی تصویر دیوان عام کی پچی کاری میں بنی ہوئی ہے۔ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوئی اٹلی کا معمار بھی اس قلعہ کی تعمیر میں شریک تھا لیکن اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اٹلی کے معماروں کا کام صرف سجاوٹ تک محدود تھا۔ کیونکہ اس کی عمارت کی ساخت و طرز و وضع قطعی ایشیائی ہے۔

قلعہ کی لاگت

مشہور ہے کہ اس قلعہ کی تعمیر میں ایک کروڑ روپیہ صرف ہوا تھا۔ جس میں سے نصف بیرونی دیواروں پر اور نصف اندرونی عمارات

---

[1] غیرت خاں بعد کو ٹھٹہ کا گورنر مقرر ہوا تھا جہاں وہ ۱۰۵۸ھ میں انتقال کرگیا۔

[2] استاد حامد کے نام سے ایک کوچہ اب تک جامع مسجد کے قریب مشہور ہے۔

پر لیکن بخت آور خاں جو اورنگ زیب کے زمانہ کا ایک مورخ ہے (عمارات کی) لاگت کی حسب ذیل تفصیل دیتا ہے۔

قلعہ اور اندرونی عمارات	۶۰ لاکھ روپے
محلات شاہی	۲۸ لاکھ روپے
شاہ محل یعنی دیوان خاص مع اس کی چاندی کی چھت و آرایش وغیرہ	۱۴ لاکھ روپے
امتیاز محل یعنی رنگ محل مع عمارات ملحقہ	۵½ لاکھ روپے
دولت خانہ خاص و عام یعنی دیوان عام	۲ لاکھ روپے
حیات بخش باغ مع حمام	۶ لاکھ روپے
محلات بیگم صاحبہ (جہاں آرا بیگم) و دیگر بیگمات	۷ لاکھ روپے
بازار و سرکاری کارخانہ جات	۴ لاکھ روپے
دیوار قلعہ و خندق	۲۱ لاکھ روپے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں و کاریگروں کی مزدوری میں ایک کروڑ روپیہ صرف ہوا تھا۔ سنگ سرخ و سنگ مرمر ان مقامات کے صوبہ داروں اور راجاؤں نے مہیا کیا تھا۔ جہاں وہ پایا جاتا ہے اور سنگ سرخ کی ایک بڑی مقدار فتح پور سیکری سے بذریعہ کشتیوں کے لائی گئی تھی۔

قلعہ کے مختلف نام

یہ قلعہ مختلف ناموں سے موسوم ہے۔ شاہ جہاں و اورنگ زیب کے زمانہ میں اس کا نام "قلعہ مبارک" یا قلعہ شاہ جہاں آباد تھا۔ اور اس آخر الذکر نام سے ہی وہ اُس زمانہ کی تاریخوں میں مذکور رہے۔ بہادر شاہ ثانی کے زمانہ میں قلعہ معلّے کہلاتا تھا۔ اور زمانہ حال کے اردو شعراء کی تصانیف میں بھی اِس نام سے یاد کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے درباری زبان کو اُردو معلے کہتے تھے۔

عمارات کے نقصانات بوجہ زلزلہ و محاصرات

کہتے ہیں کہ ۱۱۴۲ھ مطابق ۱۷۱۹ء میں عمارات شاہ جہاں آباد اور قلعہ کو زلزلہ سے جو ایک مہینہ اور دو روز تک آتا رہا۔ بہت صدمہ پہنچا۔ مرہٹوں اور احمد شاہ دُرّانی کے درمیان

جو لڑائیاں ہوئیں ان میں بھی قلعہ کی عمارات نقصان سے نہ بچ سکیں۔ آزاد بلگرامی تحریر کرتے ہیں کہ ابراہیم خاں گاردی کے ساتھ جس کو جادو مرہٹہ اپنے ہمراہ دکن سے لایا تھا ایک یورپین توپ خانہ تھا۔ اس نے مشرق کی جانب جمنا کے ریتی سے قلعہ پر تین توپوں سے گولہ باری کی۔ اسد برج شمن برج اور دیگر شاہی عمارات پر گولے مثل مینہ کے برس رہے تھے اس گولہ باری سے دیوان خاص و رنگ محل و موتی محل و شاہ برج کو بہت نقصان پہنچا لیکن قلعہ کی دیواریں بسبب سنگینی کے محفوظ رہیں۔

انہدام عمارت بعدِ غدر

نہایت افسوس ہے کہ غدر کے بعد چھوٹی چھوٹی عمارات اور صحنوں کے اِرد گرد کے مکانات منہدم کر دیے گئے اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ عمارات بغیر صحن اور اُن کے اِرد گرد کے مکانات کے جن سے عمارات کا سلسلہ قایم تھا بہت کچھ بے معنے اور بد زیب معلوم ہوتی ہیں۔ رنگ محل، ممتاز محل اور خورد جہاں کے مغربی جانب کے زنانہ صحن اور باغات سب ناپید ہو گئے اور اُن کے ساتھ چاندنی محل بھی جو خورد جہاں کے جانب غرب کچھ فاصلہ پر واقع تھا۔ دیوان عام کے صحن کے شمالی جانب شاہی گودام باورچیخانے اور توشہ خانے تھے۔ لیکن یہ عمارات مع نصف باغ حیات بخش کے منہدم کر دی گئیں اور ان کی جگہ اب فوجی بارکیں ایستادہ ہیں اور پریڈ گراؤنڈ ہے حیات بخش باغ کے شمالی جانب شہزادوں کے محلات حرم سرائے اور باغات تھے جو اب منہدم ہو گئے ہیں۔ قلعہ کے شمال مغربی کونہ پر شاہی اصطبل اور گودام تھے اور مابین مغربی دیواروں بازار جس کا سلسلہ دہلی دروازہ سے مہتاب باغ کی شمالی حد تک جاتا تھا۔ شاہی خدام و ملازمین کے متعدد مکانات تھے جو اب مسمار ہو گئے ہیں۔

لاہوری دروازہ

لاہوری دروازہ سب دروازوں سے زیادہ مشہور ہے یہ مغربی دیوار کے وسط میں واقع ہے اور یہیں سے دہلی کی خاص سڑک چاندنی چوک شروع ہوتی ہے۔ یہ عظیم الشان سہ منزلہ عمارت ہے اور اس کے داخلہ کی محراب اکتالیس فٹ اونچی اور چوبیس فٹ چوڑی ہے۔ جس کے دائیں بائیں ہشت پہل برج ہیں۔ جس پر ہشت پہل چھتریاں ہیں۔ ان ہشت پہل

چھتریوں کے درمیان سنگ مرمر کی سات برجیاں ہیں جن کے ہر دو جانب گاؤدم مینار ہیں۔ دروازہ کی محراب پر ایک دالان ہے جس کے در اس وجہ سے کہ یہاں فوجی افسر رہتے ہیں بند کردیے گئے ہیں۔ دیوار کے کنگورے خاص طور پر قابلِ دید ہیں۔

اورنگ زیب کی بنائی ہوئی گھوگھس اورنگ زیب نے اس دروازہ کی مزید حفاظت کے لیے اس کے سامنے ایک گھوگھس تعمیر کی تھی جس کی دیواریں چالیس فٹ اونچی ہیں اور مغربی دیوار کی کونوں پر دو چھتریاں ہیں۔ گھوگھس کا دروازہ شمال رویہ چالیس فٹ اونچا چوبیس فٹ چوڑا ہے اس کے اوپر کنگورے ہیں اور دائیں بائیں پتلے پتلے سبک مینارے ہیں۔ کہتے ہیں کہ شاہ جہاں نے جب وہ آگرہ میں مقید تھا اس گھوگھس کے متعلق اورنگ زیب کو یہ تحریر کیا تھا کہ اے فرزند ارجمند تم نے قلعہ کو دلہن بنایا اور اس کا گھونگھٹ نکالا۔

پل تعمیر کردہ اکبر شاہ ثانی گھوگھس کے سامنے لکڑی کے ٹوٹواں پل کی بجائے اکبر شاہ ثانی نے ۱۸۱۱ء میں پختہ پل تعمیر کیا۔ جس پر ذیل کا کتبہ سنگ مرمر پر کندہ کیا ہوا نصب ہے۔

ہُوالغنی

۵ سنہ جلوس والا ۱۲۲۶ ہجری ۱۸۱۱ عیسوی در عہد شاہ جمجاہ انجم سپاہ
محمد اکبر بادشاہ غازی صاحب قران ثانی باہتمام ولاور الدولہ رابرٹ ماقفرسن
بہادر دلیر جنگ پل فیض منزل تعمیر یافت[1]

مصنف سیون سٹیز آف دہلی کا بیان ہے کہ لاہوری دروازہ کے سامنے ایک بڑا چوک تھا اور یہاں ہندو امرا جن کے سپرد قلعہ معلی کی حفاظت ہوتی تھی قیام کرتے تھے۔ کیونکہ قلعہ کے

---

[1] کتبہ بالا کا اردو ترجمہ: ۵ سنہ جلوس والا اکبر شاہ ثانی، مطابق ۱۲۲۶ ہجری موافق ۱۸۱۱ء شاہ جمجاہ محمد اکبر بادشاہ غازی صاحب قران ثانی کے عہد میں ولاور الدولہ رابرٹ میکفرسن بہادر دلیر جنگ کے اہتمام سے پل فیض منزل تعمیر ہوا۔

چاردیواری کے اندر انھیں اطمینان نہ ہوتا تھا اس کے چوک کے سامنے ایک بڑا تالاب تھا۔ جس کا تعلق چاندنی چوک کی نہر سے تھا اور وہ لارڈ ایلنبرا کے نام پر ۱۸۴۶ء میں تعمیر ہوا تھا۔

دہلی دروازہ اور سنگین ہاتھی

دہلی دروازہ قلعہ کی جنوبی دیوار میں واقع ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کا رُخ پرانی دہلی کی طرف ہے یہ ہُوبہُو مثل لاہوری دروازہ کے ہے۔ لیکن اس کے داخلہ کی محراب کے ہر دو جانب ایک ایک سنگین ہاتھی ایستادہ ہے ان ہاتھیوں اور ان کے سواروں کے متعلق بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ لیکن اس کی کوئی اصلیت نہیں کہ وہ گوالیار یا آگرہ کے قلعہ سے لائے گئے تھے ایک روایت یہ ہے کہ ان ہاتھیوں کے سوار جیمل و پتہ مشہور راجپوت سردار تھے۔ مگر اغلب گمان یہ ہے کہ وہ محض مہاوتوں کی تصویریں ہوں گی۔ اور ہاتھی بھی محض لڑائی کے ہاتھی ہوں گے۔

اورنگ زیب کی پابندی شرع نے اس امر کی اجازت نہ دی کہ وہ ان ہاتھیوں کی مورتوں کو رہنے دیتا۔ اس نے ان کو توڑنے کا حکم دیا۔ ۱۸۶۳ء تک ان کا کوئی پتہ نہ تھا۔ لیکن قلعہ میں چند عمارتیں مسمار کرتے ہوئے ان ہاتھیوں کے کم و بیش سوا سو ٹکڑے برآمد ہوئے۔ تین سال کے عرصے میں ایک ہاتھی ان ٹکڑوں سے بنایا گیا۔ جس کو ملکہ باغ میں ریلوے اسٹیشن کے مقابل نصب کیا گیا بعدہٗ یہ ہاتھی وہاں سے اٹھا کر چاندنی چوک کے بازار میں ایک مقام پر کھڑا کیا گیا اور اس کے دس برس بعد ٹاؤن ہال کے سامنے قایم کیا گیا۔ ۱۹۰۳ء میں لارڈ کرزن کے حکم سے موجودہ ہاتھی تیار ہوئے۔ لیکن پرانے ہاتھی کے ٹکڑے جو اب عجائب خانہ میں رکھے ہوئے ہیں دوبارہ استعمال نہ ہو سکے۔ ان موجودہ ہاتھیوں کے بنانے کا کام مسٹر آر۔ کے۔ میکنزی کو (جو ہندوستانی صنعت کے ماہر تھے) سپرد ہوا تھا اور صاحب موصوف کے نمونہ پر سنگ تراشوں نے ان کو بنایا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ان ہاتھیوں کے اصل مقام کے متعلق شبہات کیوں پیدا ہوئے۔ برنیر نے صاف طور پر بیان کیا ہے کہ وہ دہلی دروازہ میں تھے اور اس کے بیان کی تائید ڈی تھیوناٹ کرتا ہے جس نے برنیر سے کچھ ہی سال بعد ان کو دیکھا تھا۔ یہ غلط فہمی غالباً آثار الصنادید کی وجہ سے پیدا ہوئی جس کے آخری ایڈیشن میں یہ تحریر ہے کہ وہ نوبت خانہ پر نصب تھے۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں ان کا دہلی دروازہ کے سامنے ہونا تحریر ہے۔ کار اسٹفن بھی یہی لکھتا ہے کہ

وہ نوبت خانہ کے سامنے تھے۔ لیکن کیپٹن ان کو دلی دروازہ کے سامنے بتاتا ہے۔ کارل اسٹیفن کی رائے ہے کہ برنیر کے بیانات قلعہ کے دروازوں کے متعلق اس قدر ناقص ہیں کہ ان کا انطباق کسی دروازہ پر بھی نہیں ہو سکتا۔ بہر حال برنیر ان ہاتھیوں کا ذکر کرنے کے بعد صاف طور پر لکھتا ہے کہ اس دروازہ سے گذر کر جہاں یہ ہاتھی کھڑے تھے۔ ایک وسیع بازار پڑتا ہے جس کے وسط میں ایک نہر ہے۔ اس بازار و نہر کا حوالہ ایم۔ ڈی۔ تھیوناٹ نے بھی دیا ہے۔

قلعہ میں صرف ایک بازار تھا اور اس کا سلسلہ جیسا کہ پرانے نقشوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ نوبت خانہ کے سامنے کے چوک میں کو ہو کر شمالاً جنوباً جاتا تھا۔ لاہوری دروازہ کے متعلق برنیر کا بیان چھتہ چوک کے ذکر سے اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہاں سے بازار مسقف میں کو راستہ ہے جس کی دونوں جانب دکانیں ہیں، موجودہ ہاتھیوں کو نصب کرتے وقت جب کھدائی ہوئی تو پرانے ہاتھیوں کے وہاں نشانات ملے اور اب اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ قدیم زمانہ کے ہاتھی یہیں کھڑے تھے۔

دہلی دروازہ کے سامنے بھی مثل لاہوری دروازہ کے ایک گھوگھس ہے اور یہاں پر بھی ایک پختہ پل ہے جو اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں زیر اہتمام رابرٹ میکفرسن تعمیر ہوا تھا۔ جس پر ایک کتبہ بھی مثل لاہوری دروازہ کے پل کے کتبہ کے ثبت ہے۔

قلعہ کے دیگر دروازے

علاوہ ان دروازوں کے قلعہ کے تین دروازے اور دو کھڑکیاں اور رہیں۔ ان میں سے ایک سے سلیم گڑھ کو راستہ جاتا ہے اور کارونیشن دربار ۱۹۱۱ء میں بادشاہ سلامت اسی دروازہ سے قلعہ میں داخل ہوئے تھے۔ اولاً اس کے قریب ایک پرانا پل تھا جس کو جہانگیر بادشاہ نے سنہ ۱۰۳۱ھ مطابق ۱۶۲۱ء میں تعمیر کیا تھا۔ لیکن وہ پل موجودہ ریل کا پل بناتے وقت منہدم کر دیا گیا۔ قدیم پل پتھر کا بنا ہوا پنجدرہ تھا اور اس پر دو کتبہ بھی نصب تھے جن میں کا ایک کتبہ عجائب خانہ دہلی میں رکھا ہوا ہے۔

سامنے کا دروازہ بھی پل کی طرح نو تعمیر شدہ ہے۔ پل مذکور اور شاہ برج کے درمیان ایک کھڑکی ہے دوسرا دروازہ مثمن برج کے نیچے ہے جو خضری دروازہ کے نام سے مشہور ہے اور اسی دروازہ کو کپتان ڈگلس نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو کھلوانا چاہا تھا تاکہ وہ اس دروازہ سے نکل کر باغیوں سے

جو دریائے جمن کی ریتی میں جمع تھے گفتگو کرے۔ یہ دروازہ اب بند کر دیا گیا ہے۔

رنگ محل کے جنوب میں چند گز کے فاصلہ پر قلعہ کی دیوار کی جڑ میں ایک کھڑکی اور ہے لیکن وہ بند ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغل بادشاہوں کے دور ہی میں اس کو بند کر دیا گیا تھا۔ اس کھڑکی کی پشت پر کھدائی ہوئی تھی۔ مگر بجز ایک موری کے اور کچھ برآمد نہیں ہوا۔ یہ روایت ہے کہ اس کھڑکی کا نام شاہی دروازہ تھا اور اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ اس سے شاہی جنازے دفن کرنے کے لیے قلعہ کے باہر لیجائے جاتے تھے یہ حقیقتاً بہت دلچسپ ہے۔ لیکن محتاج تصدیق ہے۔

تیسرا دروازہ اسد برج کے قریب ہے اور اس کو بھی خضری "دروازہ کہتے ہیں یہ نہایت دلکش اور خاص وضع کا ہے لیکن چونکہ وہ موجودہ باقیماندہ شاہی عمارات سے علیحدہ واقع ہے۔ بہت کم آدمیوں کو اس کے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس دروازہ کے اندرونی در تک بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر پہنچتے ہیں۔ اس کے سامنے بھی ایک گھوگھس بنی ہوئی ہے جس کا بیرونی دروازہ دریا کی جانب ہے اور اب بند کر دیا گیا ہے۔

چھتہ چوک

چھتہ چوک ایک مسقف بازار ہے، جو لاہوری دروازہ سے نوبت خانہ کے قریب تک چلا گیا ہے۔ فرگسن لکھتا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا محل ہو جس کا ایسا شاندار دروازہ ہو جیسا کہ چھتہ چوک ہے۔ یہ دو سو چھیاسٹھ فٹ لمبا اور ستائیس فٹ چوڑا ہے وسط میں ایک ہشت پہل صحن ہے جہاں چھت کھلی ہوئی ہے۔ راستے کے دونوں جانب بتیس دو منزلہ دوکانیں ہیں۔ محمد صالح اس کا نام بازار مسقف لکھتا ہے اور وسطی صحن کا نام جو اوپر سے کھلا ہوا ہے "چھتہ منزل"۔ اسی مورخ کا یہ بھی بیان ہے کہ اس قسم کا بازار اہل ہند کی نظر سے کبھی نہیں گذرا تھا اور وہ خود شاہجہاں ہی کی ایجاد ہے، جنھوں نے ان عمارات کی تعمیر میں بہت دلچسپی کا اظہار کیا۔ بشپ ہیبر اکبر شاہ ثانی سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے چھتہ چوک کے متعلق یوں لکھتا ہے کہ "ہمارے استقبال میں فوج کی سلامی دی گئی جو گھوگھس میں صف بستہ کھڑی تھی ہم ہاتھیوں پر سوار آگے بڑھے اور ایسے شاندار دروازہ میں کو گذرے جیسا میں نے اپنی عمر میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس دروازہ میں علاوہ ایک عظیم الشان گاتھک محراب کے ایک لمبی

مسقف گذرگاہ ہے جیسی کہ گاتھک وضع کے گرجوں میں ہوتی ہے۔ اس کے وسط میں ایک ہشت پہل صحن ہے۔ جس کے اردگرد سنگِ خارا کی محرابیں ہیں اور ان پر نہایت نفاست کے ساتھ قرآن شریف کی آیتیں اور پھول پتیاں کندہ ہیں۔ گذرگاہ مذکور کے آخری سرے پر ایک شکستہ اور نہایت خستہ اصطبل ہے۔" اس مسقف بازار کے مشرقی کنارہ پر ایک چوکور کھلا ہوا صحن تھا۔ دو سو فٹ مربع جس کے چاروں طرف در بنے ہوئے تھے۔ جہاں پہرا دینے والے اُمرا قیام کرتے تھے۔ اس کے جنوب مشرقی پہلو پر چند عمارات تھیں۔ جہاں شاہی ناظر کا دفتر تھا۔ وسط میں ایک حوض تھا۔ جس میں اس نہر سے پانی آتا تھا۔ جو شمالاً و جنوباً شاہی باغات اور دہلی دروازہ کے جانب بہتی تھی۔ اس نہر کے ہر دو جانب بازار تھا۔ برنیر لکھتا ہے کہ اس بازار کے سامنے ایک پٹری چار فٹ چوڑی اور ساڑھے چار فٹ زمین سے بلند تھی۔ اسی بازار میں کم درجہ کے شاہی ملازمین سودا سلف خریدتے تھے اور ادنیٰ مرتبہ کے امرا کا یہاں پہرا ہوتا تھا۔

صحن کے مشرقی جانب نوبت خانہ یا نقار خانہ تھا۔ جس کے چاروں طرف ایک سنگین کٹہرا لگا ہوا تھا۔ یہ صحن مع چوگردی عمارات و وسطی حوض اور سنگین کٹہرے کے مسمار ہو گیا۔ لیکن خیال ہے کہ اُن کے مقامات پر بھی نشان دہی کے واسطے مہندی کی باڑ اور گھاس لگا دی گئی ہے جیسا کہ قلعہ کی دیگر مسمار شدہ شاہی عمارات کے متعلق کیا گیا ہے۔

نوبت خانہ یا نقّار خانہ

یہ عمارت فی الحقیقت دروازہ ہے۔ اس کا طول ننانوے فٹ عرض اڑسٹھ فٹ اور بلندی کرسی سے منڈیر تک چھپّن فٹ ہے۔ داخلہ کے محراب کی بلندی انتالیس فٹ اور چوڑائی سولہ فٹ ہے۔ یہ خیال رہے کہ موجودہ کرسی نو تعمیر ہے۔ حقیقتاً اس عمارت کا فرش دیوان عام کے صحن کے ہم سطح تھا تجویز ہے کہ یہ کرسی بھی منہدم کر دی جائے تاکہ نوبت خانہ کے دروازہ میں کو راستہ اصل سطح پر رہے۔ نوبت خانہ کے شمال و جنوب میں عمارات تھیں لیکن وہ غدر کے بعد مسمار کر دی گئیں اور اب اُن کے نشان کے لیے مہندی کی باڑ لگا دی گئی ہے۔ نوبت خانہ پر جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے دن میں پانچ دفعہ نوبت بجتی تھی، لیکن اتوار کے روز چونکہ یہ دن سورج سے نامزد ہے نوبت دن بھر بجتی رہتی تھی اور اسی طرح ہفتہ کے اُس روز جو بادشاہ کے پیدائش کا دن ہوتا تھا،

برنیر نے لکھا ہے کہ اول اول اس کی آواز ناقابل برداشت معلوم ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ عادت ہو جانے سے اس میں عظمت اور شان و شوکت معلوم ہونے لگی شاہی محلات کے ملحق نوبت خانہ ہوتا تھا اور یہ رسم اب تک دیسی ریاستوں میں پائی جاتی ہے، غدر کے بعد سے ۱۹۰۷ء تک یہ عمارت قلعہ کے چند فوجی افسروں کا مسکن رہی جن کی آسائش کے واسطے اس میں کچھ ترمیم کر دی گئی تھی۔ لیکن بعدہٗ ان ترمیمات کو دور کر کے جہاں تک ممکن ہوا اس کو اصلی حالت پر لایا گیا۔ اوپر کی منزل میں فی الحال جنگی عجائب خانہ ہے جو ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ یہاں قایم کیا گیا ہے، نیچے کی منزل میں جہاں اب محافظِ عمارات شاہی اور جنگی عجائب خانہ کے دفاتر ہیں ۱۹۱۱ء تک اشیائے قدیمہ کا عجائب خانہ تھا جو اب ممتاز محل میں ہے۔

دیوان عام

نوبت خانہ سے گذر کر دیوان عام میں پہنچتے ہیں۔ یہاں نوبت خانہ کے دروازہ میں کوئی شخص سوائے شہزادوں کے سواری پر نہیں جا سکتا تھا یعنی سفیر و وزیر و امیر خواہ کتنے ہی بلند درجہ کے ہوتے تھے۔ یہاں سواری سے اتر پڑتے تھے اور دیوان عام تک پیدل جاتے تھے شاہانِ مغلیہ کے آخری دور تک جب کہ وہ محض پنشن خوار رہ گئے تھے اس کا بہت سختی کے ساتھ لحاظ رکھا جاتا تھا۔ فرانسس ہاکنس صاحب دہلی کے ریذیڈنٹ اسی الزام پر اپنی ملازمت سے برطرف کیے گئے تھے کہ وہ نوبت خانہ کے دروازہ میں سے گھوڑے پر سوار چلے گئے تھے

دیوان عام کا صحن

دیوان عام کے صحن کا طول پانچسو پچاس فٹ اور عرض تین سو فٹ تھا اور اس کے ارد گرد در تھے جو برنیر کے بیان کے موافق یک منزلہ تھے۔ ان دروں کے درمیان میں دیواریں تھیں لیکن اس طرح پر کہ ایک در میں سے دوسرے در میں کو دروازہ سے راستہ تھا۔ یہ در دوہرے تھے اور ان کی کرسی ساڑھے تین فٹ بلند تھی۔ یہاں پر پہرہ دینے والے امرا کا قیام رہتا تھا، دربار وغیرہ کے خاص خاص موقعوں پر ان دروں کو سجایا جاتا تھا اور امرا کا ان کی سجاوٹ اور زینت میں باہم مقابلہ ہوتا تھا غدر کے بعد یہ در منہدم کر دیے گئے لیکن ان کی جگہ اب نشان دہی کے لیے صنوبر وغیرہ کے درختوں کی قطار لگا دی گئی ہے۔ صحن کے شمالی جانب ایک دروازہ تھا اور اس کے مشرق میں دیوان عام کی

عمارت تھی جس کی شمالی جانب ایک دروازہ تھا اور اس سے دیوان خاص کو راستہ جاتا تھا۔ شاہان مغلیہ کے آخری بادشاہوں کے زمانہ میں دیوان عام کے عقب میں ولی عہد کا محل بنا کر اس کے منظر کو خراب کر دیا تھا یہ محل یوروپین وضع کا تھا جس طرز کا ہندوستان میں اس زمانہ میں بہت رواج ہو گیا تھا، دیوان عام کی شفاف سفید استر کاری اور سنہری منبت کاری اب جاتی رہی ہے۔ کرسی اس کی تقریباً چار فٹ بلند ہے۔ طول اسّی فٹ اور عرض چالیس فٹ ہے کرسی سے منڈیر تک بلندی تیس فٹ ہے اور چھت کے مغربی کونوں پر ایک ایک چھتری ہے اس کے شمال جنوب اور مغرب کی جانب مرغولہ دار در ہیں جن پر ایک چوڑا چھجہ سایہ کیے ہوئے ہے۔ اس چھجے پر قدیمی نقاشی کے نشانات اب تک باقی ہیں۔ اس عمارت میں تین ایوان ہیں۔ اور ہر ایوان میں نو نو مرغولہ دار در پتھر کے ستونوں پر ایستادہ ہیں۔

نشیمن ظلِّ الٰہی

پشت کی دیوار کے وسط میں ایک سنگ مرمر کی شہ نشین ہے جو نشیمن ظلِّ الٰہی کے نام سے موسوم ہے اور جس میں بیش قیمت پتھروں سے پچی کاری ہو رہی ہے۔ اس شہ نشین کے نیچے ایک سنگ مرمر کا تخت سات فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا رکھا ہوا ہے کہتے ہیں کہ یہاں سے وزیر کھڑا ہو کر بادشاہ کی خدمت میں عرضیاں پیش کرتا تھا جو نشیمن ظلِّ الٰہی پر جلوہ افروز ہوتے تھے تخت کے سامنے ایک کٹہرا تھا۔ چالیس فٹ لمبا اور تیس فٹ چوڑا جس میں سلطنت کے معزز ترین امراء کی جگہ تھی۔

بقایا کم درجہ کے امراء کے واسطے مخصوص تھا اور اس کے باہر چبوترہ پر جس کا نام گلال باڑی تھا ادنیٰ درجہ کے امراء اور اراکین ہوتے تھے۔ عام تماشائی اس چبوترے کے نیچے کھڑے تھے۔ بشپ ہیبر جس نے دیوان عام کو ۱۸۲۴-۲۵ء میں دیکھا تھا بیان کرتا ہے کہ وہ کوڑے کرکٹ مثلاً ٹوٹی پالکیاں اور خالی صندوقوں سے اٹا ہوا تھا اور نشیمن ظلِّ الٰہی کبوتروں کی بیٹ سے اس قدر لسا ہوا تھا کہ اس کی پچی کاری مشکل سے نظر آتی تھی۔

نشیمن ظلِّ الٰہی کی پچیکاری

نشیمن ظلِّ الٰہی کی دیواروں پر پچیکاری کا کام خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے۔ مشہور ہے کہ اس کو ایک مفرور یوروپین جوہری مسمّی آسٹن ڈی بورڈو نے کیا تھا۔ اس پچیکاری میں پھولوں پھلوں اور پرندوں کی تصاویر کے

بالکل اصل کے مطابق ہیں۔ اور ان کے علاوہ ایک تصویر آرفیس کی اس ہیئت سے بنی ہوئی ہے کہ وہ بربط بجا رہا ہے اور ایک شیر اور خرگوش اور چیتا مدہوش اس کے پانوؤں کے پاس پڑے راگ سن رہے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں جب اس قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو آرفیس کی تصویر والی تختی یہاں سے اکھاڑ کر ساؤتھ کینسنگٹن کے عجائب خانہ میں رکھدی گئی تھی۔

گیارہ اور تختیاں بھی یہاں سے نکالی گئی تھیں لیکن کچھ عرصہ کے بعد لارڈ کرزن کے ایماء سے وہ وہاں سے واپس منگا کر اپنی جگہ پر ثبت کر دی گئیں۔ خوش قسمتی سے اس پچی کاری کے نقشے موجود تھے جن کی مدد سے اس عجائب روزگار صنعت کے کام کی پھر از سرِ نو درستی ہو سکی جس کے واسطے اٹلی سے ایک فن پچیکاری کے ماہر کو بلایا گیا تھا یہ ۱۹۰۹ء میں تکمیل کو پہنچا۔ ذیل کی عبارت اس پچیکاری کے متعلق سر جان مارشل صاحب بہادر ڈائرکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ کی سالانہ رپورٹ ۳-۱۹۰۲ء سے ترجمہ کی جاتی ہے اور یقین ہے کہ ناظرین کے لیے خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔

نشیمن ظلِّ الٰہی کی زیبائش میں خاص طور پر سنگ موسیٰ کی تختیاں مشہور ہیں جن پر مختلف قسم کے پتھروں کی پچی کاری سے پرندوں کی تصاویر اور پھول پتیاں بنی ہوئی ہیں۔ اس قسم کی آرائش ہندوستان میں اور کہیں نہیں ہے اور اس میں سب سے زیادہ مشہور آرفیس کی تصویر ہے جو ایک درخت کے نیچے بربط بجا کر جانوروں کو مسحور کر رہا ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں ان میں کی بہت سی تختیاں جو اکثر چھوٹی چھوٹی تھیں نکل کر ضائع ہو گئیں۔ منجملہ ان تختیوں کے جو یہاں سے نکال لی گئی تھیں

بارہ تختیاں جن میں آرفیس کی تصویر کی تختی اور دیگر چار بڑی اور سات چھوٹی تختیاں تھیں سر جان جونس کے قبضہ میں آئیں تھیں اور انھوں نے ان کو سرکار برطانیہ کے ہاتھ پانچسو پونڈ میں فروخت کر دیا تھا۔ سرکار برطانیہ کے ایماء سے وہ ساؤتھ کینسنگٹن کے عجائب خانہ میں رکھ دی گئی تھیں۔ ۱۸۸۲ء میں میجر ایچ کول کی زیر نگرانی جو اس زمانہ میں ہندوستان کی عمارات قدیمہ کے محافظ تھے پشت کی دیوار کے نصف زیریں حصہ کی پچی کاری کی مرمت عمل میں آئی۔ یہ مرمت اگرچہ بڑی ہوشیاری سے کی گئی لیکن افسوس ہے کہ کچھ پتھر اس موقعہ پر ایسے لگائے گئے جو اصل پتھروں کے مقابلہ میں بدزیب تھے

یہ فرق خاص طور پر ان تختیوں کے پتھر کی رنگت سے محسوس ہوتا ہے۔

یہ نئی تختیاں ہندوستانی سنگ موسیٰ کی ہیں جن کی رنگت بھوری سیاہی مائل ہے اور ان کے مقابل میں اصل تختیاں نہایت گہری سیاہ ہیں جس رنگت کا سنگ موسیٰ اٹلی میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کاریگری کے اعتبار سے بھی یہ نیا کام بلحاظ نفاست پرانے کام سے گرا ہوا ہے۔ دیوار کے اوپر کے حصہ کی مرمت میجر کول نے نہیں کی تھی شاید ان کو اُمید تھی کہ کسی نہ کسی وقت وہاں کی نکلی ہوئی تختیاں انگلستان سے واپس آجائیں گی اور یہ امر ناقابل معافی ہوتا کہ یہاں پر تو نئی تختیاں بنوا کر لگا دی جاتیں اور اصل تختیاں دوسری جگہ موجود ہوتیں گورنمنٹ ہند نے گذشتہ سال یعنی ۱۹۰۲ء ایک دقیع عرضداشت ارسال کی۔ اور وکٹوریہ والبرٹ میوزیم کے ٹرسٹیز براہ عنایت ان کے واپس کر دینے کے لیے راضی ہو گئے۔

امید کی جاتی تھی کہ یہ منقش تختیاں دربار ۱۹۰۳ء تک ہندوستان میں واپس آجاویں گی اور یہ موقع سرکار عالیہ کے اس فیاضانہ پالیسی کے اظہار کے لیے مناسب ہوگا جو اس نے پرانی عمارات و آثار کے تحفظ کے لیے اختیار کی ہے اور جو پرانے رویہ یعنی ان کے برباد کرنے کے پالیسی کے بالکل مخالف ہے بدقسمتی سے تختیاں مذکور دسمبر ۱۹۰۲ء کی آخری تاریخ تک ہندوستان میں نہ پہنچ سکیں اس لیے ان کا نصب کرنا دربار کے بعد کو ملتوی کر دیا گیا چنانچہ اب وہ پشت کی دیوار میں اپنی اصلی جگہ پر ثبت کر دی گئی ہیں۔ دیوار کے اوپر کے حصہ کی دیگر تختیوں پر جلا کی گئی ہے ان میں جو لاک بھری ہوئی تھی وہ صاف کر دی گئی ہے اب بھی بعض بعض جگہ خالی ہے جہاں سے تختیوں کا یا تو کچھ حصہ ٹوٹ کر ضایع ہو گیا ہے یا وہ بالکل نکل گئی ہیں یہ خالی جگہ بھی رفتہ رفتہ پرانے نمونہ کے موافق نئی تختیوں سے بھر دی جاویگی لیکن اس خاص قسم کے پتھر کو پہچاننے اور یورپ سے خریدنے کے لیے کچھ زمانہ درکار ہے اور غالباً یہ ضرورت پڑے کہ فلارنس میں تیار کرایا جاوے یا اٹلی کے دستکار اس

کام کو انجام دینے کے لیے ہندوستان میں بلائے جائیں۔

ان تختیوں کے ساخت کے زمانہ اور طرز کے متعلق بھی کچھ بیان کرنا ضروری ہے۔ روایتاً مشہور ہے کہ نشیمن ظلِ الٰہی کی آرائش و زیبائش آسٹن ڈی بورڈو یک فرانسیسی صناع نے جس کو شاہ جہاں نے قلعہ دہلی اور تاج محل کی تعمیر کے واسطے نوکر رکھا تھا کی ہے۔ دیسی گائڈ آرفیس کی تصویر کو آسٹن ڈی بورڈ کی تصویر بتلاتے ہیں لیکن یہ روایت قطعاً فرضی ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تختیوں کا طرز اطالوی ہے

یہ بات ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ تختیوں کا سنگ موسیٰ و نیز وہ پتھر جن سے پچیکاری کی گئی ہے۔ اطالوی ہی ہے اور اس لیے یہ فرض کر لینا غیر واجب نہ ہوگا کہ صرف ان کا نقشہ ہی اٹلی کا تیار کردہ نہیں ہے بلکہ وہ واقعی وہیں تیار ہوئی تھیں اور بعدہٗ اس ملک میں لائی گئیں۔ ان تختیوں کے درمیان کے گل بوٹے قطعی ہندوستانی وضع کے ہیں اور وہ ہندوستان ہی کی صنعت ہے جن میں اطالوی اثر کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ہیتوِل نے حال ہی میں دہلی کے تخت پر ایک مضمون "دی نائن ٹینتھ سینچری اینڈ آفٹر" میں شایع کیا ہے جس میں انھوں نے یہ تحریر کیا ہے کہ تخت مذکور کی پچی کاری کے کام کو شاہ جہاں کے زمانہ کی بیان کرنا غلط ہے بلکہ اس کو اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتدا کا تصور کرنا چاہیے ان کا اس امر پر زور دینا کہ یہ کام بلحاظ صنعت کے تاج محل کے کام سے کمتر ہے بالکل صحیح ہے

—————— وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر یہ پرند اور جانوروں کی تصویریں اورنگ زیب کے زمانہ میں ہوتیں تو یہ محال تھا کہ وہ بت شکن بادشاہ ان کی صورتوں کو بغیر مسخ کیے چھوڑ دیتا لیکن یہ دلیل قابل پذیرائی نہیں کیونکہ ایسی تصویریں مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں کہ جن پر اورنگ زیب کی نظر پڑتی رہی اور وہ اس کے تباہ کن ہاتھوں سے بچ گئیں۔ بلحاظ صنعت کے کمتر ہونے کے بھی اس امر کی کافی شہادت نہیں کہ وہ شاہ جہاں کے بعد کی ہیں۔ لاہور کے قلعہ میں شاہ جہاں کے زمانہ کی پچی کاری تاج کے کام سے کہیں گری ہوئی ہے اور دہلی کے تخت نشیمن ظلِ الٰہی، کلی

کام تو خصوصیت کے ساتھ مشکل تھا کیونکہ یہ آرائش اس طرح پر ہوئی تھی کہ مختلف پیمائش اور غیر مانوس طرز کی متعدد مربع و مستطیل تختیاں ثبت کی گئی تھیں اور مشکل ہی سے ایسے صناع مل سکتے تھے جو ان کو خوشگوار اور پسندیدہ اسلوب پر ترتیب دے سکتے چہ جائیکہ مغل صناع جو پرانے طور و طریقہ کے سختی کے ساتھ پابند تھے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ یہ آرائش عجیب سی معلوم ہوتی ہے یا یہ کہ تختیوں کی درمیان کی منبت کاری تاج محل کے مقابلہ میں گری ہوئی ہے۔"

دیوان عام کی رسومات

برنیئر ان رسومات کا جو دیوان عام میں ادا کی جاتی تھیں اس طور پر ذکر کرتا ہے:

"دو یا ڈیڑھ گھنٹہ کے دوران میں جبکہ دربار کی رسم ادا کی جاتی ہے شاہی گھوڑے تخت کے سامنے کو گذرتے ہیں تاکہ بادشاہ سلامت یہ دیکھ سکیں کہ ان کی اچھی ہوتی ہے اور وہ اچھی حالت میں ہیں۔ اس کے بعد ہاتھی لائے جاتے ہیں جن کی کھال پر خوب دہو کر سیاہ روغن کیا ہوتا ہے اور دو سرخ لکیریں سر سے سونڈھ کے سرے تک کھنچی ہوتی ہیں۔ ان ہاتھیوں پر زری کی جھول پڑی ہوتی ہے اور چاندی کے گھنٹے وزنی زنجیروں میں کمر کے ادھر اُدھر لٹکے ہوتے ہیں اور نیز تبت کی بیش بہا سفید چنوریاں ان کے کانوں سے مثل گل مچھوں کے لٹکی ہوتی ہیں۔ دو چھوٹے ہاتھی نہایت نفاست سے آراستہ ان قوی ہیکل ہاتھیوں کے ساتھ مثل غلاموں کے رہتے ہیں۔ ہر ہاتھی تخت کے ساتھ قدم بڑھاتا ہے گویا کہ اپنی نفیس پوشاک اور شان و شوکت پر نازاں ہے اور جب وہ تخت کے سامنے پہنچتا ہے تو مہاوت جو اس کے گردن پر بیٹھا ہوتا ہے اس کے انکس چبو کر کچھ کہتا ہے یہاں تک کہ وہ دو زانو بیٹھ جاتا ہے اور سونڈ اٹھا کر زور سے چلاتا ہے اس حرکت کو لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ ہاتھی بادشاہ کو تسلیم بجالاتا ہے پھر دوسرے جانور پیش کیے جاتے ہیں مثلاً ہرن نیل گائے۔ گینڈا۔ بنگالی بھینسے جن کے بڑے بڑے سینگ ہوتے ہیں اور ان سے شیر اور چیتے کا مقابلہ کراتے ہیں یا تو چیتے جن سے ہرن کا شکار کرتے ہیں اور

بک کے عمدہ نسل کے شکاری کُتّے جن کے اوپر چھوٹی چھوٹی سرخ جھولیں پڑی ہوتی ہیں اور آخر میں ہر قسم کے شکاری پرندے جو تیتر۔ سارس۔ خرگوش اور ہرن تک کا شکار کرتے ہیں کہتے ہیں کہ یہ شکاری پرندے ہرن وغیرہ پر نہایت تیزی سے جھپٹتے ہیں اور ان کے سر پر بیٹھ کر اپنے پنجے اور بازوؤں سے ان کو اندھا کر دیتے ہیں۔ علاوہ ان جانوروں کے ایک یا دو امراء کی فوج بھی بادشاہ کے سامنے پیش ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر سواروں کی وردی معمول سے بہتر ہوتی ہے۔ گھوڑوں کے اوپر زرہ بکتر پڑی ہوتی ہے اور وہ متعدد قسم کے عجیب سازوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔

بادشاہ کے سامنے آلائش صاف کر کے بھیڑیں بھی لائی جاتی ہیں اور وہ اُن پر تلوار آزمائی کرتا ہے۔ نوجوان امراء و منصب دار و گرز بر داران مُردہ بھیڑوں کو ایک وار میں دو ٹکڑے کر کے اپنے سپہ گری کے کرتب دکھاتے ہیں لیکن ان کھیل تماشوں کے ساتھ خاص امور بھی وابستہ ہوتے ہیں یعنی صرف یہ ہی نہیں ہوتا کہ بادشاہ توجہ کے ساتھ اپنی فوج کا معائنہ کرے بلکہ اس سے یہ نتیجہ بھی مرتب ہوا ہے کہ جب سے لڑائی ختم ہوئی ہے اُس نے ہر ایک سپاہی کا فرداً فرداً ملاحظہ کیا ہے اور ان سے ذاتی واقفیت حاصل کی ہے جن میں سے بعض کی تنخواہ میں ترقی یا تنزل کیا ہے اور بعض کو نوکری سے برطرف کر دیا ہے۔ تمام عرضیاں جو عام رعایا دیوان عام میں آن کر گذرانتی ہے بادشاہ کے سامنے پیش کی جاتی ہیں اور پڑھی جاتی ہیں۔ عرضی دہندہ کو بادشاہ اپنے سامنے بلا کر جرح کرتا ہے اور مظلوم کی اکثر فوراً دادرسی کی جاتی ہے[1]۔

دیوان عام کے عقب میں ایک برآمدہ ہے جس کی نسبت یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس پر چونہ کی سپید استرکاری تھی جو مثل سپیدۂ صبح کے شفاف و چمکدار تھی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے دیوان عام کے شمال میں ایک دروازہ تھا جہاں سے دیوان خاص

---

[1] سفرنامہ برنیر صفحہ ۲۶۱ تا ۲۶۳

کے صحنوں کو راستہ جاتا تھا جو اب منہدم ہو گئے ہیں لیکن ان کی نشان دہی سبز گھاس کے تختوں اور مہندی کی باڑوں سے ہوتی ہے۔ مغربی صحن کے غربی دیوار کے وسط میں ایک دروازہ تھا اور اس صحن سے دیوان خاص کے دوسرے صحن کو راستہ تھا۔ اس دروازہ کے سامنے ایک سرخ پردہ تنا رہتا تھا جو لال پردہ کے نام سے موسوم تھا

ممتاز محل ممتاز محل جہاں اب عجائب خانہ ہے جنوب میں سرے کی عمارت ہے۔ ابتدا میں یہ بیگمات کے رہنے کا محل تھا۔ سرکار انگریزی کے قبضہ میں آنے کے بعد وہاں فوجی قید خانہ بنایا گیا۔ کچھ عرصہ ہوا کہ وہاں سارجنٹ میس تھا۔ ان وجوہات سے اس میں قدرے ترمیم کر دی گئی تھی۔ غدر سے پہلے کے کھنچے ہوئے قلعہ کی پرانی تصاویر و نقشوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ عمارت رنگ محل کے مشابہ تھی جس پر سفید استرکاری ہو رہی تھی۔ چھت کے کونوں پر چھوٹی چھوٹی چھتریاں تھیں۔ بیرونی جانب چوڑا چھجہ تھا ~~تھا~~ موجودہ چھجہ تو تعمیر شدہ ہے اندرونی جانب بعض بعض مقامات پر قدیمی شیشہ بندی نمایاں ہے اس کی کرسی اب تک دبی ہوئی ہے لیکن تجویز ہے کہ یہاں بھی زمین کو اسی سطح پر لایا جائے جیسا کہ شمال میں ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں یہاں کھدائی ہوئی تھی اور اس عمارت کے سامنے ایک سنگ مرمر کا حوض برآمد ہوا تھا۔ اس کو چھوٹا رنگ محل یا خاص محل بھی کہتے تھے اور نہر بہشت مثل شمالی عمارتوں کے اس کے وسط میں کو بھی گذرتی تھی۔ ممتاز محل اور رنگ محل کے درمیان کی جگہ خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہوں کے زمانہ میں عمارتوں سے پر تھی جس کا غدر کے قبل کی تصویروں سے پتہ چلتا ہے اغلب ہے کہ شاہجہاں کے زمانہ میں یہاں ایک اور بارہ دری ہو اور دروں کا وہ سلسلہ جو رنگ محل کے سامنے والے باغ کی جنوبی حد پر تھا۔ شاید یہاں بھی قلعہ کی دیوار پر ہو کیونکہ قلعہ کی مشرقی دیوار کے سلسلہ عمارات میں ہر خالی جگہ پر سنگ مرمر کی جالیاں ہوں گی تاکہ حرم کے رہنے والوں کا دریا کی جانب سے پردہ رہے۔

کہتے ہیں کہ ممتاز محل کے جنوبی جانب بھی ایک مکان تھا جس کا نام خورد جہاں تھا اس کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں ممکن ہے کہ اس میں مختلف قسم کے پھول دار درخت و دیگر اشیاء جمع کر کے یہ کوشش کی گئی ہو کہ یہ عمارت ایک چھوٹے پیمانہ پر دنیا کا نمونہ نظر آئے۔

رنگ محل

رنگ محل ممتاز محل کے شمال میں واقع ہے اس کی وجہ تسمیہ ہے کہ اس میں مختلف رنگ کی نقاشی سے زیبایش کی گئی تھی شاہی محلات میں یہ سب سے بڑی عمارت تھی اور شاہ جہاں کے زمانہ میں اس کا نام امتیاز محل تھا شاہ جہانی مورخ اس کی تعریف میں اس قدر مبالغہ کرتے ہیں کہ وہ شان و شوکت میں عرش و کرسی سے سبقت لے گئی تھی اور چمک دمک میں بہشت سے بڑھ کر تھی لیکن افسوس ہے کہ پرانی نقاشی کے اب محض چند نشانات باقی رہ گئے ہیں۔

یہ عمارت طول میں ایک سو تریپن فٹ چھ انچ اور عرض میں انہتر فٹ تین انچ ہے اندرونی جانب مرغولہ دار در اس کو پندرہ کمروں میں منقسم کرتے ہیں جن میں سے ہر ایک کمرہ بیس فٹ مربع ہے۔ اس کے بارہ پہل ستونوں اور دیواروں کی روکار گیارہ فٹ کی اونچائی تک سنگ مرمر کی ہے اور اس ہی اونچائی سے دروں کے محراب شروع ہوتے ہیں بیرونی دروں کی محرابوں میں سنہری نقاشی اور رنگ آمیزی ہے جس کے نشانات بعض بعض مقام پر اب تک باقی ہیں مشہور ہے کہ اس کی اصل چھت چاندی کی تھی لیکن محمد فرخ سیر کے زمانہ میں ضروری اخراجات پورا کرنے کے لیے اس کو اکھاڑ لیا گیا اور اس کے بدلے تانبے کی چھت لگادی گئی۔ اکبر شاہ ثانی کے وقت میں اس تانبے کی چھت کو بھی اکھاڑ کر لکڑی کی چھت لگادی گئی۔ محمد صالح اس کی اصل چھت کے متعلق لکھتا ہے کہ اس پر سونے کا ملمع تھا اور سنہری گلکاری سے مزین تھی۔

شرقی دیوار میں دریا کی جانب پانچ کھڑکیاں ہیں جہاں سے بیگمات زیر دیوار دریا کی ریتی میں ہاتھیوں کی لڑائی دیکھا کرتی تھیں جس کو بادشاہ نہایت شوق سے مثمن برج سے ملاحظہ کرتے تھے۔ ان میں سے چار کھڑکیوں میں سنگ مرمر کی جالیاں ہیں جن میں شیشے لگے ہوئے تھے غالباً یہ شیشے گہری رنگت کے تھے جس نمونہ کے دو تین شیشے اب تک حمام کی کھڑکیوں میں موجود ہیں۔ وسطی دریچہ باہر نکلا ہوا بنگلہ نما ہے یہ کچھ زیادہ بھلا نہیں معلوم ہوتا اور

فن تعمیر کے اس زوال کا پتہ دیتا ہے جس کی ابتدا شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ سے ہوئی۔
اس محل کے چاروں کونوں پر چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جن میں سنگ مرمر کا ازارہ ہے اور دیوار کے بالائی حصہ پر مصالح میں گلکاری اور منبت کاری کی ہوئی ہے اور نیز چھوٹے چھوٹے آئینے جڑے ہوئے ہیں۔ شاہ نواز خاں مصنف "مرات آفتاب نما" اس محل کے متعلق جو تحریر کرتا ہے اس کا ماحصل اردو میں یہ ہے کہ امتیاز محل (رنگ محل) محلات شاہی میں سب سے بڑا ہے۔
اولاً اس کے درون و ستونوں اور چھت پر سونے اور مختلف رنگوں کی نقاشی ہو رہی تھی۔ اس کے دونوں سروں پر ہوادار کمرے تھے اور اس کے نیچے دو تہ خانہ تھے اور اس کی کرسی سے ملی ہوئی چار چوکھنڈیاں تھیں جو بطور خسخانہ کے استعمال ہوتی تھیں اس کے سامنے ایک باغ تھا جس کا طول ایک سو بیس گز اور عرض ایک سو پندرہ گز تھا۔ اس باغ کے گرد مکانات تھے جن کی چوڑائی سترہ گز تھی۔ چوکھنڈیاں مذکورہ کا اب نشان نہیں ہے البتہ تہ خانے اس کے نیچے اب تک موجود ہیں۔ جن میں سے ایک کا دروازہ ہے اور دوسرے کے دروازہ کا پتہ نہیں۔
چوکھنڈیوں کا ذکر سرسید احمد خاں نے بھی کیا ہے کہ جن میں خس کی ٹٹیاں لگا کر خسخانہ بنایا جاتا تھا۔
آثار الصنادید میں اس محل کا ایک نقشہ بھی[1] ہے۔ جس سے چوکھنڈیوں مذکور کی وضع کا پتہ چلتا ہے اور یہ کہ وہ رنگ محل کے سامنے دونوں کونوں پر تھیں۔ اُسی نقشہ سے مغربی دروں میں بھی جالیوں کا ہونا ثابت ہوتا ہے جن کا ذکر مرأت آفتاب نما کی مذکورہ بالا عبارت میں ہے ان جالیوں کے اوپر چھوٹے چھوٹے دریچے تھے اور ان میں بھی سنگ مرمر کی جالیاں تھیں۔ نقشہ مذکور سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رنگ محل کا مغربی رو کار ابتداءً بہت زیادہ خوبصورت تھا لیکن اس پر سپیدی ہونے سے وہ خوبصورتی و نفاست اب بالکل زائل ہو گئی ہے۔

نہر بہشت رنگ محل کے بیچوں بیچ میں کو ایک نہر گذرتی ہے جس کے وسط میں ایک حوض ہے جو ۱۹۰۸ء تک تو تعمیر شدہ سنگین فرش سے ڈھکا ہوا تھا قلعہ میں علی مرداں خاں کی نہر سے پانی لایا جاتا تھا جو دہلی سے چھ میل اوپر دریائے جمنا سے کاٹی گئی تھی اور اس نہر سے قلعہ

---

[1] آثار الصنادید باب دوم صفحہ ۳۶

کے حوض اور دیگر چھوٹی چھوٹی نہریں لبریز ہوتی تھیں۔ قلعہ کے نہروں میں سب سے زیادہ مشہور نہر بہشت تھی یہ شاہ برج سے نکلتی تھی اور باغ حیات بخش کے شرقی چبوترہ و حمام و دیوان خاص و خوابگاہ میں کو ہوتی ہوئی میزان عدل کے نیچے گذرتی تھی اور وہاں سے رنگ محل و ممتاز محل و دیگر شاہی محلات کو جاتی تھی اور متعدد حوضوں اور فواروں کو پانی پہنچاتی تھی۔ برنیر تحریر کرتا ہے کہ ہر محل میں پانی کے خزانے، باغات، پسندیدہ روشیں، سایہ دار کنج، چشمے، فوارے، اونچے اونچے دالان اور چبوترے تھے جہاں پر رات کو ٹھنڈی ہوا آتی تھی[1]۔ دوسرے مقام پر یہی مصنف بیان کرتا ہے کہ پانی کا یہ انتظام تھا کہ نہر محل سرائے میں کو گذرتی تھی اور اس کے ہر حصہ میں کو ہوتی ہوئی خندق میں گر جاتی تھی۔ رنگ محل کے وسطی حوض میں سے اگرچہ جواہرات نکال لیے ہیں اور پانی اب وہاں نہیں بہتا تاہم وہ قلعہ میں تمام حوضوں سے زیادہ دلکش ہے اور شاید ہی کوئی اور حوض اس سے خوبصورتی اور نفاست میں سبقت لے گیا ہو۔ سید احمد خاں رنگ محل کا ذکر کرتے ہوئے اس حوض کے متعلق اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"اس میں (رنگ محل میں)، ایک حوض ہے کہ اس کی خوبی بیان نہیں ہو سکتی اس حوض کو سنگ مرمر سے اس طرح بنایا ہے کہ ایک کھلا ہوا پھول معلوم ہوتا ہے اور پھر اس میں رنگ برنگ کے پتھروں سے ایسی پچی کاری کی ہے اور گل بوٹے بیل پتے بنائے ہیں کہ جس کا کچھ بیان نہیں ہو سکتا اگرچہ یہ حوض ساڑے سات گز مربع ہے لیکن گہراؤ اس کا بہت کم ہے بعینہ ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح بنایا ہے اس میں خوبی یہ ہے کہ جس وقت پانی بھرتا ہے اور لہراتا ہے تمام بیل بوٹے اس حوض کے ہلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس حوض میں ایک کاسہ سنگ مرمر کا کمرفی بنا ہوا بہت خوبصورت ایک پھول معلوم ہوتا ہے لیکن اس پر بھی اس کی ہر ایک مرغول اور مرغول پر رنگین پتھروں سے گل بوٹے اور بیل پتے بنائے ہیں کہ پھول میں پتے اور بیل میں سے پھول نکلتے ہوئے معلوم

---

[1] سفرنامہ برنیر صفحہ ۲۶۷

ہوتے ہیں اس پیالہ میں ایک سوراخ ہے اور ایک نہر پوشیدہ تلے تلے
آئی ہے اور اس پیالہ میں سے اُبلی ہے پیالہ کے لبوں پر سے پانی کا گرنا اور
حجاب آب سے گل بوٹوں کا لہراتا ہوا دکھائی دینا ایک عالمِ طلسمات معلوم
ہوتا ہے۔"[1]

محمد صالح بھی اس حوض کی تعریف میں بہت رطب اللساں ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ عمارت یعنی رنگ محل کے درمیان میں ایک حوض عجیب و غریب وضع کا اُتھلا نہایت خوبصورت و نفیس ہے اس میں سوراخ ہیں اور نیز فوّارے لگے ہیں جن میں سے پانی اُبلتا ہے اور جس کا نظارہ نہایت لطف انگیز ہے یہاں سے پانی ایک دوسری سنگ مرمر کی حوض میں گرتا ہے جو ایک ہی پتھر سے تراشا گیا ہے اور عجائب روزگار سے ہے یہ سنگ مرمر کی چٹان جس میں سے یہ حوض بنایا گیا ہے مکرانہ کی کان میں سے نکلی تھی اور بادشاہی حکم سے اس کا ایک حوض چار سے چار گز اور ڈیڑھ گز گہرا تراشا گیا اور پھر وہاں سے جرِ ثقیل کی مدد سے شاہجہاں آباد (دہلی) میں لاکر اس مکان میں نصب کردیا گیا۔

ایک پتھّر کا حوض

یہ ایک پتھّر کا حوض جس کا ذکر محمد صالح نے کیا ہے ایک عرصہ تک ملکہ کے باغ میں رکھا رہا۔ ۱۹۱۱ء میں اس کو قلعہ میں واپس لائے اور اب اُس حوض کے بیچ میں رکھا ہوا ہے جو رنگ محل کے صحن کے وسط میں واقع ہے رنگ محل کے سامنے کے باغ اور اس کے اردگرد کی عمارات کا ذکر بشپ ہیبر نے بھی کیا ہے۔ جس نے ابتداء انیسویں صدی میں ان کو دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ جب میں نے قلعہ کو دیکھا تھا تو باغات اور عمارات سب قریب قریب برباد ہو چکے تھے اور ان کی بجائے بدنما مکانات تعمیر ہو گئے تھے تاہم وہ تحریر کرتا ہے کہ یہاں ایک چمن تھا جس کا طول ایک سو پندرہ گز اور عرض ایک سو سات گز تھا اور اس کے اردگرد سرخ پتھّر کی جالی کا ایک جنگلہ تھا جس پر سونے کے دو ہزار کلس لگے ہوئے تھے۔ صحن کے تین جانب خوبصورت مکانات اور نفیس در

---

[1] آثار الصنادید باب دوم صفحہ ۳۶ تا ۳۷

بنے ہوئے تھے جن کی چوڑائی سترہ گز تھی اور یہ باغ مغربی جانب امتیاز محل کی کرسی سے ملحق تھا۔
امتیاز محل کے صحن کے وسط میں جس کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ ایک حوض ہے جس کا طول ایکسو چھبیس فٹ اور عرض ایکسو تیئس فٹ ہے۔ یہ اب بالکل خشک ہے اور چونکہ اس میں پانی بھرا رہنے سے مچھر وغیرہ پیدا ہونے کا خوف تھا اس کی تہ میں گھاس لگادی گئی ہے۔ شاہ نواز خاں اِس حوض کے متعلق اس طرح تحریر کرتا ہے:۔

"در وسط باغچہ حوضے است پنجاہ ذراع در چہل و ہشت ذراع و پنج فوارہ دران مبجو شد و در ضلع شرقی و غربی ایں حوض نہریست از سنگ مرمر کہ دراں بست و پنج فوارہ تعبیہ نمودہ اند بگرد باغچہ محجّر یست از سنگ سرخ کہ دو ہزار قبہ طلا اندود دارد۔"[1]

کھدائی ہونے پر شمال و جنوب کی عمارات کی نیویں برآمد ہوئی تھیں اور یہاں اب ان کی نشاندہی کے لیے مہندی کی باڑیں لگادی گئی ہیں۔ اسی طرح مغربی جانب بھی ایک سلسلہ عمارات کی نیویں تھیں جس کا ایک حصّہ دیوان عام کے عقب میں اب تک موجود ہے یعنی وہ دالان جو نشیمن ظلِّ الٰہی کی پشت پر ہے اور یہاں سے ہو کر بادشاہ کے محل سرائے سے دیوان عام میں جاتے تھے۔ یہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے بادشاہ جب کار و بار عدالت یا غیر ممالک کے ایلچیوں کی ملاقات سے تھک جاتے ہوں گے تو آرام لینے کے لیے اس امتیاز محل یا رنگ محل میں آجاتے ہوں گے جو مختلف رنگوں کی نقاشی سے مزیّن تھا اور جہاں پانی کے گرنے کی دھیمی دھیمی آواز بیگمات کی چہل پہل اُن کے تفریحِ طبع کا باعث ہوتی ہوگی۔

تسبیح خانہ خوابگاہ اور بیٹھک

رنگ محل کے جانبِ شمال ایک عمارت ہے۔ مشتمل بر تسبیح خانہ خوابگاہ و بیٹھک۔

---

[1] مراۃ آفتاب نما ورق ۲۰۷ حصل اس کا یہ ہے کہ باغ کے بیچ میں ایک حوض ہے پچاس گز لمبا اور اڑتالیس گز چوڑا اور اس میں پانچ فوارے لگے ہوئے ہیں شرقی و غربی جانب اس حوض کے ایک سنگ مرمر کی نہر ہے کہ اس میں پچیس فوارے لگے ہیں اور باغ کے چاروں طرف سنگ سرخ کا ایک جنگلہ ہے جس پر دو ہزار سونے کے قبے جڑے ہوئے ہیں (اس سے بشپ ہیبر کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس کا چہرہ سنگ مرمر کا ہے اور اس پر ایک وقت میں رنگ برنگ کی نقاشی ہوئی تھی۔ زمانہ حال تک اس عمارت کے ہر دو سروں پر ایک ایک پشتہ تین فٹ کا چوڑا بنا ہوا تھا۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ پشتے بلحاظ مضبوطی کے ضروری نہیں اور چونکہ وہ اینٹوں کے بنے ہوئے نو تعمیر شدہ تھے اس وجہ سے منہدم کر دیے گئے۔ ان دیواروں کے ٹوٹنے سے اُن کے نیچے کے نقاشی کے نشانات چھجے تک برآمد ہوئے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ نفیس نقاشی جو اس عمارت کے اندرونی جانب ہے۔ بیرونی جانب بھی تھی جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

خاص محل یہ عمارت حمام کے جواب میں دیوان خاص کی جانب جنوب ہے جو نری سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے اور ایک نہر اس کو دو برابر حصّوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اس عمارت اور دیوان خاص کے درمیان کے صحن کا فرش سنگ مرمر کا ہے جو چھیالیس فٹ چوڑا ہے اور اسی طرح ایک صحن اس کے جانب جنوب رنگ محل تک ہے۔ اس عمارت کا نام "خاص محل" بھی تھا۔ تسبیح خانہ اور خوابگاہ اور بیٹھک کی تقسیم اس طرح پر ہے کہ وہ تین کمرے جو دیوان خاص کی جانب ہیں تسبیح خانہ کے ہیں جنوبی جانب کے تین کمرے خوابگاہ کے ہیں اور وہ دالان جس کا رخ رنگ محل کی جانب ہے بیٹھک یا توشہ خانہ ہے خوابگاہ اور تسبیح خانہ کے وسطی کمروں کے بیچ والے در میں ایک سنگ مرمر کی جالی لگی ہوئی ہے جس پر ایک ترازو کی شکل کندہ ہے۔ اس کو میزان عدل کہتے ہیں۔ آنریبل ڈبلو ایم ہیلی صاحب بہادر سابق چیف کمشنر دہلی کے ایماء سے اس عمارت کے مغربی کمرے مغلئی وضع پر آراستہ کیے گئے ہیں تاکہ سیر کنندگان کو یہ اندازہ ہو سکے کہ شاہان مغلیہ کے زمانہ میں کمرے مذکور کس طرح پر سجے ہوتے تھے۔

تسبیح خانہ و بیٹھک میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں البتہ خوابگاہ توجہ کے قابل ہے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ خوابگاہ تین وسطی کمروں کا نام ہے اس کے بیچ کا کمرہ تقریباً پینتالیس فٹ لمبا اور اٹھارہ فٹ چوڑا ہے اور اس کے مغربی و مشرقی کمروں کی پیمائش اس سے نصف ہے ان ہر سہ کمروں میں دروازے لگے ہوئے ہیں اور ان کی دیواروں پر کسی زمانہ میں قیمتی پتھروں سے پچی کاری کی ہوئی تھی۔ جن میں سے اکثر نکال لیے گئے تھے۔ لیکن ان کی از سر نو مرمت ہوئی ہے بیچ کے کمرہ کے شمالی اور جنوبی جانب وہ در ہیں جن کے محرابوں پر شاہجہاں بادشاہ کے مشہور و معروف وزیر

علامی سعد اللہ خاں کا تصنیف کیا ہوا کتبہ کندہ ہے۔ نیز اس کمرہ کے گرد کے چند اشعار اس عمارت کے وصف میں سونے کے پانی سے لکھے ہوئے تھے لیکن اب وہ مٹ گئے ہیں۔

کتبہ جو سنگ مرمر کی محرابوں پر سنگِ موسیٰ سے پچیکاری کیا ہوا ہے اس کا ماحصل درج ذیل ہے:

سبحان اللہ کیا رنگین مکان اور دلنشیں نشیمن ہیں گویا کہ بہشت بریں کے قطعے ہیں جبکہ میں یہ کہتا ہوں کہ فرشتے اس کے دیکھنے کے آرزومند ہیں تو دنیا کے باشندے اگر مثل کعبہ کے اس کا طواف کریں تو بجا ہے اور اہلِ جہاں مثل حجر اسود کے اس کے رفیع الشان چوکھٹ کے چومنے کو دوڑیں تو درست ہے۔ قلعہ والا کے تعمیر کی ابتدا جو آسمان سے بلند اور سد اسکندر سے زیادہ مضبوط اور اس عمارت دلکشا د باغ حیات بخش کی جوان مکانوں میں ایسا ہے جیسا کہ روح بدن میں اور شمع انجمن میں۔ اور نہر اطہر کی جس کا صاف پانی نظر والے کے لیے آئینہ جہاں نما ہے اور عقلمند کے لیے عالم غیب کا پردہ کشا اور آبشاروں کی جو گویا سپیدۂ صبح ہیں یا پھر اسرارِ لوح و قلم اور فواروں کی جن میں سے ہر ایک گویا نور کا پنجہ ہے کہ اہل آسمان کے مصافحہ کے لیے اوپر کو اٹھتا ہے یا چمکدار موتی ہیں کہ اہل زمین کے انعام کے لیے نازل ہوئے ہیں اور حوضوں کی جو تمام آبِ حیات سے بھری ہوئی ہیں اور صفائی میں رشک نورِ آفتاب ہیں۔ ابتدا بارہویں ذی الحجہ ۱۲ سنہ جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۴۸ھ ہجری کو ہوئی اور اس کے اختتام نے جس پر پچاس لاکھ روپے صرف ہوئے ہیں چوبیسویں ربیع الاول ۲۱ سنہ جلوس مبارک موافق ۱۰۵۸ھ میں مقدم مبارک بادشاہ جہاں پناہ شہاب الدین محمد صاحبقراں ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی سے اہل جہاں پر فیض کا دروازہ کھولا۔

کاؤنٹ وان آرلچ جو ۱۸۴۳ء میں دہلی آئے تھے بیان کرتے ہیں کہ مغل بادشاہ کے خلوتگاہ کے دروازہ کے سامنے ایک ترازو کی تصویر پتھر پر کندہ ہے جو یہ بتلاتی ہے کہ وہاں محض انصاف کیا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب ہم اس دالان میں داخل ہوئے جہاں سے بادشاہ کی خلوتگاہ کو راستہ جاتا تھا تو ہم نے یہ دیکھا کہ ایک داستان گو بادشاہ کی خوابگاہ کے سامنے بیٹھا ہوا بلند آواز سے قصہ کہہ رہا تھا۔

قصہ گو اور بادشاہ کے درمیان ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ بادشاہ ایک مسہری پر لیٹے ہوئے تھے اور ان کو سُلانے کے لیے یہ قصہ کہا جا رہا تھا۔[1]

مثمن برج خوابگاہ کے مشرقی جانب مشرف بدریا ایک برج ہے جس پر ایک گنبد ہے۔ اس کو برج طلا یا مثمن برج کہتے ہیں۔ برنیر نے اگرچہ اس کو دیکھا نہ تھا لیکن اس کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ ہشت پہل ہے اور اس کے گنبد پر کسی وقت میں سونے سے ملمع کیے ہوئے تانبے کے پتر جڑے ہوئے تھے مگر اب اس پر چونے کی استرکاری ہے۔ اس کے آٹھ ضلعوں میں سے تین ضلع خوابگاہ میں ہضم ہوگئے ہیں اور باقی پانچ ضلع دریا کی جانب ہیں جن میں سے چار میں سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں اور پانچویں ضلع کے سامنے جو وسط میں ہے ایک چھوٹا نشیمن بطور برآمدہ کے ہے جس کو اکبر شاہ ثانی نے بنوایا تھا۔ اس نشیمن کی محرابوں پر اکبر شاہ ثانی کا ایک کتبہ بھی تحریر ہے — مثمن برج کے مغربی دروازہ پر ایک دوسرا کتبہ ہے جو اکبر شاہ ثانی ہی کا کندہ کرایا ہوا ہے۔

برنیر مثمن برج کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ خواجہ سرائے ایک چھوٹے سے برج کی بڑی تعریف کرتے ہیں جو دریا کے جانب ہے اور جس پر سونے کے پترے اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے آگرہ کے برجوں پر اور اندر کی جانب سے سنہری اور آسمانی رنگ کی نقاشی سے مزین ہے شاہانِ مغلیہ کے محلات میں اس قسم کے برج عام طور پر آگرہ اور لاہور میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہاں سے بادشاہ رعایا کو اپنا درشن کراتے تھے جو قلعہ کے نیچے اس غرض سے جمع ہوتے تھے آگرہ کے برج میں جہانگیر نے ایک گھنٹہ لٹکایا تھا جس کو فریادی بجاکر دادخواہی کرتے تھے۔

جھروکہ درشن شاہانِ مغلیہ رسم درشن کو بہت ضروری خیال کرتے تھے اور روزانہ رعایا کو اپنے درشن کراتے تھے ایسے دَور میں جب کہ بادشاہ کی جان ہر لمحہ خطرہ میں رہتی تھی یہ ہی رسم ایسی تھی جس سے اس کی حیات کی خبر رعایا کو مل سکتی تھی بعض بعض مواقع پر ایسا ہوا ہے کہ بادشاہ بستر بیماری پر پڑا ہوا ہے اور اُس کو اسی حالت میں جھروکہ تک لایا گیا ہے۔ اور اس نے

---

[1] سفرنامہ دان آر پچ جلد دوم صفحہ ۲۵

وہیں سے اپنا درشن کرایا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ رسم کا رونیشن دربار میں بھی ادا کی گئی تھی یعنی شہنشاہ معظم جارج پنجم و ملکہ معظمہ اسی مثمن برج میں ان لوگوں کے درشن کے لیے برآمد ہوئے تھے جو قلعہ کے نیچے دریا کی ریتی میں جمع تھے۔

اس برج کے نیچے خضری دروازہ ہے جس کا مفصل ذکر آچکا ہے۔ مثمن برج کا اصلی گنبد موجودہ گنبد سے بالکل مغائر تھا کیونکہ جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے اس پر تانبے کے پتر پڑے ہوئے تھے۔ لیکن پرائز ایجنٹ نے غدر کے بعد ان کو اور نیز دیوان عام کی چوکھنڈیوں کے پتروں کو اکھیڑ کر بیچ ڈالا۔

دیوانِ خاص

دیوانِ خاص کا دوسرا نام شاہ محل تھا اور اس کے سامنے ہی جانب غرب مثل دیوانِ عام کے ایک صحن تھا جس کے گرد در بنے ہوئے تھے۔

اس صحن کا دروازہ جس کا نام جلو خانہ تھا غرب کی طرف تھا اور اُس کے سامنے ایک پردہ کھنچا رہتا تھا۔ جو "لال پردہ" کے نام سے موسوم تھا یہاں امراء و راجگان بادشاہ کو تسلیم بجالاتے تھے۔ یہ صحن مع اس دوسرے چھوٹے صحن کے جو اس سے جانبِ مشرق ملحق تھا بعد غدر کے منہدم کر دیا گیا لیکن پرانے نقشوں اور کھدائی سے ان کی نیووں کا پتہ چلا ہے۔ اور ان کی نشان دہی کے لیے دیسی مہندی اور بیلواری کی باڑ لگادی گئی ہے۔

دیوانِ خاص کا طول نوے فٹ اور عرض سڑسٹھ فٹ ہے اور اس کی کرسی چار فٹ سے کچھ زیادہ بلند ہے۔ فرگسن کا خیال ہے کہ یہ عمارت شاہجہانی عمارات میں اگر سب سے زیادہ خوبصورت نہیں تو سب سے زیادہ آراستہ ضرور ہے۔ وسطی ایوان کا طول اڑتالیس فٹ اور عرض ستائیس فٹ ہے۔ اس کی چھت مسطح ہے جو مرغولہ دار دروں پر قایم ہے۔ دیوار و ستونوں کے نیچے کے حصہ پر بیش بہا پتھروں سے پچیکاری کا کام ہو رہا ہے اور اوپر کی جانب سنہری نقاشی ہے۔ اس کے وسطی کمرہ کے بیچوں بیچ میں کو نہر بہشت بارہ فٹ کی چوڑائی سے گذرتی ہے اور یہاں ایک سنگ مرمر کا تخت تھا جس پر شاہجہاں کا مشہور و معروف تخت طاؤس جو نو کروڑ روپے کی لاگت سے تیار ہوا تھا اور جس کو نادر شاہ ۱۷۳۹ء میں لوٹ کر لیگیا رکھا جاتا تھا۔ اسی وسطی کمرہ کے شمالی و جنوبی دروں پر یہ مشہور کتبہ سنہری حرفوں میں تحریر ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است   ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

یہ عمارت مغلیہ سلطنت کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے اور اس نے خاندان تیموریہ کے بہت سے انقلابات دیکھے ہیں۔ یہیں پر اس کے بانی شاہ جہاں کے پر شوکت و شان دربار منعقد ہوتے تھے اور یہاں ہی ۱۷۱۶ء میں اسکاٹلینڈ کے ڈاکٹر گیبریل ہملٹن کو شہنشاہ فرخ سیر کا علاج اس کی شادی کے موقعہ پر علاج کرنے کے صلہ میں یہ اجازت عطا ہوئی تھی کہ اس کے ہم قوم یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی دریائے ہگلی کے کنارے ایک فیکٹری کھول لیں اور ۳۸ گاؤں کی ایک بستی بنالیں، یہ عطیہ فورٹ ولیم اور جو کچھ نتائج اس سے مترتب ہے۔ ان سب کا پیش خیمہ تھا یہیں پر ۱۷۳۹ء میں محمد شاہ نے نادر شاہ کے سامنے سر نیاز خم کیا تھا۔ جو خاندان مغلیہ کا پشتہا پشت کا جمع کیا ہوا خزانہ لے گیا۔ شاہانِ مغلیہ کے آخری دور میں یہ عمارت جاٹ، مرہٹہ، روہیلہ لٹیروں کا یکے بعد دیگرے آماجگاہ رہی اور یہیں پر سن رسیدہ بادشاہ شاہ عالم کی غلام قادر خاں روہیلہ نے آنکھیں نکالی تھیں اور اسی مقام پر لارڈ لیک بہادر کا شکریہ ادا کیا گیا تھا کہ انھوں نے سلطنت مغلیہ کو سندھیا کی دست برد سے بچالیا۔ ۱۸۵۷ء میں باغیوں نے اسی محل میں بہادر شاہ ثانی کو دوبارہ تخت پر بٹھا کر ہندوستان کا بادشاہ بنانا چاہا تھا لیکن انھیں یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ صرف سات ماہ کے بعد اس کو اسی عمارت میں بغاوت کے خلاف اپنی صفائی دینی ہوگی۔

دیوانِ خاص مختلف ناموں سے موسوم تھا مثلاً شاہ محل دولت خانہ خاص غسلخانہ محمد صالح کنبوہ نے بہار سخن میں اس کو غسلخانہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

برنیر کا بیان ہے کہ بہت کم آدمیوں کو دیوان خاص کے اندر داخل ہونے کی اجازت ہوتی تھی۔ امراء ہر روز شام کے وقت اس عمارت میں اور صبح کو دیوانِ عام میں باریابی حاصل کرتے تھے اگر کوئی ناغہ کر دیتا تھا تو اس کی تنخواہ کاٹ لی جاتی تھی۔

اس کی چھت کی ہندوستانی مورخین اور انگریزی سیاحوں نے بہت زیادہ تعریف کی ہے۔ محمد صالح لکھتا ہے کہ اس پر نو لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا

"خوابگاہ کے جانب شمال کو ایک بہت بڑا چوک ہے اس چوک کے ضلع شرقی میں ڈیڑھ گز کا اونچا چبوترہ بنایا ہے اسّی گز کا لمبا اور چھبیس گز کا چوڑا اس کے بیچوں بیچ میں دیوان خاص کی عمارت ہے چونتیس گز کی لمبی اور چھبیس گز کی چوڑی سر سے پاؤں تک سنگ مرمر کی اور سرتاسر اس کے بیچ میں چار گز کے عرض سے نہر بہشت بہتی ہے۔ اس عمارت کے بیچوں بیچ میں چوکور ستون بنا کر اٹھارہ گز کے طول اور دس گز کے عرض سے مکان بنایا ہے اور اس کے بیچوں بیچ میں ایک چبوترہ ہے اس چبوترہ پر تخت طاؤس رکھا جاتا ہے جس پر بادشاہ اجلاس فرماتے ہیں اور اس مکان کے گرد پایہ نما ستون لگا کر مکان بنایا ہے در و دیوار و ستون و مرغول اور محراب اور فرش اس عمارت کا سنگ مرمر کا ہے اور اس میں ازارہ تک عقیق و مرجان اور احجار بیش قیمت سے پچیکاری کی ہے اور بیل بوٹے پھول پتے بنائے اور ازارہ[1] سے اوپر چھت تک سونے کا کام کیا ہوا ہے اور سونے کے پانی سے گویا لیپ دیا ہے یہ عمارت جانب شرق سے مشرف بدریا ہے اور اس طرف کے دروں میں جالیاں لگا کر آئینہ بندی کی ہے اور جانب غرب اس کا صحن ہے ستر گز سے ساٹھ گز کا اور اس کے صحن کے گرد کے مکانات اور ایوان سنگ سرخ سے بنے ہوئے ہیں جانب غرب اس صحن کے دروازہ ہے کہ دیوان عام سے اس میں راستہ آتا ہے اور اس دروازہ کے آگے لال پردہ تنا رہتا ہے اور سب امراء بر وقت دربار کے اس لال پردہ کے پاس سے آداب تسلیمات بجا لاتے تھے اور جانب شمال رستہ ہے حیات بخش کا اور جانب جنوب ڈیوڑھی محلات شاہی کی اور اس عمارت کے بیچ کے در کے سامنے صحن کی طرف ایک کٹہرا ہے سنگ مرمر کا اس کو

---

[1] آثار الصنادید میں یہ لفظ غلطی سے اجارہ لکھا ہے۔

چوکھنڈی دیوان خاص کہا جاتا ہے۔ اس کی چھت بھی نری چاندی کی تھی مرہٹہ اور جاٹ گردی میں اکھڑ گئی[1]"۔

چوکھنڈی دیوانِ خاص جس کا سید احمد خاں نے ذکر کیا ہے غالباً غدر کے بعد مسمار ہوگئی۔ اب اس کا کوئی نشان نہیں۔

غلام علی بلگرامی مصنف خزانہ عامرہ تحریر کرتا ہے کہ بادو[2] نے دیوان خاص کی چاندی کی چھت کو اکھڑوا کر اس کے سکّے ڈھلوا لیے۔ کین صاحب لکھتے ہیں کہ اس کی چھت چاندی کی تھی جس پر سونے کا کام ہو رہا تھا اور وہ انتیس لاکھ روپے میں تیار ہوئی تھی۔ مرہٹوں نے جب ۱۷۶۰ء میں اس کو اکھاڑ کر پگلا یا تو اس کے چاندی کی قیمت ۲۸ لاکھ روپے ہوئی۔ یہی مصنف یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ سداشیو راؤ بھاؤ کے زیر کمان مرہٹوں نے یہ لوٹ مار کی تھی جن کو احمد شاہ دُرانی نے ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں شکست دی اس سے قبل ۱۷۵۸ء میں دیوان خاص کو احمد شاہ دُرانی نے بھی لوٹا تھا جو منجملہ اور لوٹ کے اپنے ہمراہ ایک خاندان مغلیہ کی شاہزادی کو بھی بیوی بنا کرے گیا تھا۔

تخت طاؤس

عبدالحمید لاہوری تخت طاؤس[3] کے متعلق نہایت تفصیل کے ساتھ تحریر کرتا ہے:۔

---

[1] آثار الصنادید باب دوم صفحہ ۴۱، ۴۲

[2] بادو مرہٹوں کے ایک پیشوا کا نام تھا۔

[3] بعض مصنفین کا خیال ہے کہ تخت طاؤس دیوان عام میں تھا۔ کار اسٹیفن کی رائے ہے کہ وہ اس سنگ مرمر کے تخت پر رکھا جاتا تھا جو اب دیوان خاص میں ہے۔ برنیر اس تخت کا حال بیان کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے کہ اس کے پایہ کے نزدیک تمام امراء زرق برق لباس پہنے ہوئے اس چبوترہ پر جمع ہوتے تھے جس کے چاروں طرف چاندی کا کٹہرا لگا ہوا تھا بعدہٗ وہ اس عمارت کا ذکر کرتا ہے جس میں یہ تخت رکھا جاتا تھا اور کہتا ہے کہ صحن کے گرد کے مکانات کے متعلق یہ ہے کہ ہر امیر کو یہ حکم تھا کہ وہ اپنے صرف سے ان کی زیبائش کرے اور

ماحصل اس کا یہ ہے کہ زمانہ دراز سے شاہ مغلیہ کے خزانہ میں ایک کثیر تعداد جواہرات کی جمع ہو گئی تھی۔ شاہجہاں نے اپنے پہلے سال جلوس میں۔ ۲ اہل جہاں بھی ان کی دید سے مستفیض ہو سکیں۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ علاوہ خاص شاہی جواہر کے جس قدر لعل، یاقوت، ہیرے، موتی۔ شاہی خزانہ میں ہیں اور جن کی قیمت دو کروڑ روپیہ ہے نظر اقدس میں پیش کریں اور ان میں سے اس نے پچاس ہزار مثقال وزنی جواہرات جن کی قیمت چھیاسی لاکھ روپیہ تھی منتخب کر کے بے بدل خاں دارو غہ زرگر خانہ کے حوالہ کی تاکہ وہ ایک لاکھ تولہ سونے کا جس کی قیمت چودہ لاکھ روپیہ ہوتی تھی ایک تخت سواتین گز لمبا ڈھائی گز چوڑا اور پانچ گز اونچا بنوا کر جواہر مذکور اس میں جڑوائے۔ نیز یہ حکم دیا کہ اس کی چھت کے اندر کی جانب مینا کا کام ہو اور باہر کی جانب لعل و یاقوت سے مرصع کر کے بارہ ستونوں پر قایم کی جائے اور اس پر دو موروں کی تصویر جواہرات سے مرصع اور ان کے درمیان ایک درخت لعل و ہیرے و زمرد و موتیوں سے جڑا ہوا بنا دیں اور اس پر چڑھنے کے واسطے تین سیڑھیوں کا مرصع زینہ قایم کریں، یہ تخت سات سال میں ایک کروڑ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا۔ اس کے گرد گیارہ تختے لگے تھے۔ جن میں سے بیچ کے تختہ میں وہ لعل جڑا ہوا تھا جو شاہ عباس والی ایران نے شہنشاہِ جہانگیر کو تحفہ میں بھیجا تھا۔ اس پر تیمور مرزا شاہ رخ و مرزا الغ بیگ کے نام منقوش تھے۔ اور شاہ عباس نے اپنا نام بھی اس پر درج کرا دیا تھا شہنشاہ جہانگیر نے اپنا نام مع شہنشاہ اکبر کے نام کے اس پر کندہ کرایا۔ بعدہٗ شاہجہاں نے اپنے نام کا بھی اس میں اضافہ کر دیا۔

اِس بیان سے کہ بے بدل خاں کو تخت طاؤس بنوانے کا حکم ہوا تھا برسفورڈ صاحب کے
اُس بیان کی تردید ہوتی ہے جو انھوں نے گائڈ ٹو دہلی میں تحریر کیا ہے کہ تخت اسٹن ڈی بارڈو۔ [illegible]

(بقیہ صفحہ) امراء کا اس زیبائش میں مقابلہ ہوتا تھا کہ کس کے مکان کی آرائش بادشاہ کو پسند ہوتی ہے چنانچہ تمام دالان و در سر سے پاؤں تک کمخواب زربفت سے منڈھ دیے جاتے تھے اور فرش بیش بہا قالینوں کا ہوتا تھا۔ برنیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صحن سے اس کی مراد دیوان عام کا صحن ہے۔ ڈاکٹر برنیر کہتا ہے کہ شاہ جہاں کے پاس نہایت نفیس سات تخت تھے۔ اور ان میں کا خاص تخت دیوان عام میں رکھا جاتا تھا۔

مشہور ہے کہ تخت طاؤس کو نادر شاہ [1] ۱۱۵۲ھ (مطابق ۱۷۳۹ء) میں ایران کو لے گیا۔ [2] ٹورنیر نے اس کی قیمت چونسٹھ لاکھ بیس ہزار جانچی تھی۔ سنگ مرمر کا تخت جس پر بیان کیا گیا ہے کہ وہ رکھا جاتا تھا ۱۸۷۶ء میں پرنس آف ویلز کی تشریف آوری کے وقت دیوان خاص کے بیچوں بیچ میں سے اُٹھا کر اُس کے مشرقی ایوان میں رکھ دیا گیا جہاں کہ وہ اب تک موجود ہے۔

---

[1] مآثر الامرا جلد اول صفحہ ۴۰۸

[2] لارڈ کرزن بہادر کی کتاب "پرشیا اینڈ دی پرشین کوسچن" کے ذیل کے اقتباس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ شاہجہاں کا تخت طاؤس اب تک ایران میں موجود ہے لارڈ کرزن تحریر کرتے ہیں کہ مجھے یقین تھا کہ ایران کے تخت طاؤس کو دہلی کے تخت طاؤس سے کچھ تعلق نہیں اور اس امر کے تحقیق میں میں نے بہت کچھ تاریخ کی ورق گردانی کی۔ میلکام صاحب کی ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحہ ۷۰ میں یہ تحریر ہے کہ نادر شاہ کو شاہجہاں کا تخت طاؤس اس قدر پسند آیا تھا کہ اس نے اس کا ایک مثنٰے تیار کرایا۔ اس لحاظ سے دو تخت طاؤس ہوتے ہیں جو نادر شاہ کے انتقال کے بعد تباہ و برباد ہوئے۔ لیکن میلکام کے اس بیان سے ہماری تحقیق میں کچھ مدد نہیں ملتی۔ کیونکہ ایران کے تخت طاؤس کو شاہجہانی تخت طاؤس کا مثنٰی نہیں کہہ سکتے۔ فریزر صاحب نے کتاب خراساں میں یہ تحریر کیا ہے کہ ایک بوڑھے کرد نے ۱۸۲۲ء میں مجھ سے یہ بیان کیا کہ جب نادر شاہ قتل ہوا اور اس کا کیمپ لوٹا گیا تو تخت طاؤس اور موتیوں کا خیمہ ہمارے ہاتھ لگا جن کو ہم نے وہیں توڑ پھوڑ کر آپس میں تقسیم کر لیا۔ کرد نے اس امر کا واقعہ ہونا قطعی قرین قیاس ہے اور اگر ہم کرد مذکور کے بیان کو صحیح تصور کریں تو اصلی شاہجہانی تخت طاؤس یا مندرجہ بالا دو تخت طاؤس میں سے ایک تخت نیست و نابود ہو جاتا ہے موریر صاحب کے بیان سے مجھے یہ شبہ ہوا تھا کہ ایرانی تخت طاؤس زمانہ حال کی ساخت ہے، وہ تحریر کرتے ہیں کہ یہ مشہور ہے کہ اس تخت کی تیاری میں ایک لاکھ تومان یعنی ایک لاکھ پونڈ صرف ہوئے تھے (غالباً آجکل ایک لاکھ تومان دو لاکھ پونڈ کے برابر ہوں گے) اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایرانی تخت کی لاگت اس ملک میں زبان زد عوام تھی اور لاگت کی تشہیر اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ وہ کسی نئے تخت کے متعلق تھی نہ کہ اُس پرانے تخت کی جو ستر برس گذرے ایک غیر ملک سے لوٹ میں آیا تھا۔ میں نے طہران میں اس شبہ کا اظہار کیا اور مجھے نہایت خوشی

حمّام حمام کے دروازہ کا رُخ دیوان خاص کے شمالی جانب ہے کہتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ اِدھر اُدھر کے دو کمروں میں شاہی خاندان کے بچے غسل کرتے تھے۔ اس حمام کے تین درجے ہیں اور اس کا فرش حوضیں اور کمر کمر تک دیواروں کی ردکار سنگِ مرمر کی ہے۔ جس پر مختلف قسم کے پتھروں سے پچیکاری کی گئی ہے، دریا کے جانب کے درجہ کو "جامہ کن" کہتے تھے۔ یعنی یہاں کپڑے اُتارے جاتے تھے۔ اس درجہ میں دو حوض ہیں جن میں سے ایک میں گلاب کا فوارہ چلتا تھا۔ کھڑکیوں میں سنگِ مرمر کی جالی اب تک موجود ہے اور ان میں سے مشرقی جانب بیچ کی کھڑکی میں چند شیشہ بہت گہری رنگت کے لگے ہوئے ہیں جو شاہجہاں کے زمانہ کے خیال کیے جاتے ہیں۔ دوسرے درجہ کے وسط میں صرف ایک حوض ہے اور اس درجہ کو حسب ضرورت بطور سرد یا گرم حمام کے استعمال کرتے تھے یہاں سنگِ مرمر کی ایک نہایت خوبصورت

(بقیہ صفحہ) ہوئی جب کہ وزیر اعظم ایران نے اس کی تصدیق کی کہ ایرانی تخت طاؤس ہندوستانی نہیں ہے بلکہ اس کو محمد حسین خاں صدر اصفہان نے فتح علی شاہ ولی ایران کے واسطے تیار کیا تھا۔ جس زمانہ میں کہ شاہ ایران نے اصفہان کی ایک خاتون کے ساتھ جس کا لقب طاؤس خانم تھا شادی کی تھی۔

شاہ ایران اس تخت سے اس قدر خوش ہوا تھا کہ شادی مذکورہ کے موقع پر اس کو ایک خاص موذکی نئی شئی منصور کیا تھا۔ اس ایک بیان سے سیکڑوں مصنفین کی تردید ہوتی ہے جنہوں نے لاتعداد صفحے تخت طاؤس کے حالات اور اس کے ایران میں موجود ہونے کے متعلق رنگے ہیں وزیر اعظم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نادر شاہ کے اصل تخت طاؤس کا پتہ جو نہایت شکستہ اور تباہ حالت میں تھا آغا محمد شاہ کو ملا تھا جس نے اس نادر شاہ کے نابینا پوتے شاہ رخ مقیم مشہد مقدس سے مع دیگر جواہرات کے جور و ظلم کر کے چھین لیا۔ اور اس سے زمانہ حال کی وضع و قطع کے مطابق ایک تخت بنوایا جو طہران کے محل میں رکھا ہوا ہے آخر الذکر تخت میں شاہجہانی تخت طاؤس کے جو کچھ ٹکڑے باقی رہ گئے تھے لگے ہوئے ہیں اور فتح علی شاہ کی شادی کا تخت اس شہرت کا مستحق نہیں جو اب تک اسے حاصل تھی اور جس کے متعلق زمانہ حال کے مصنفین نے خامہ فرسائی کی ہے دیکھو پرشیا اینڈ دی پرشین کوسچین مصنفہ لارڈ کرزن جلد اول صفحہ ۳۲۱ تا ۳۲۲)

جانماز بھی رکھی ہوئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ بعد غسل کے فریضہ نماز یہاں ادا کرتے تھے۔ مغربی درجہ محض گرم خانہ تھا۔ اس کے مغرب میں انگھیٹی ہے جس سے اس کو گرم کیا کرتے تھے۔ شرقی درجہ کی طرح ان دونوں درجوں میں بھی روشنی کھڑکیوں سے آتی ہے جن میں پہلے رنگین شیشے لگے ہوئے تھے شاہ نواز خاں کا بیان ہے کہ اس حمام میں نہایت قیمتی پتھروں سے پچیکاری کی گئی تھی اور وسطی حوض کے چاروں کونوں پر طلائی فوارے تھے۔[۱]

شاہان مغلیہ کو حمام نہایت مرغوب تھے۔ موسم سرما میں ان کو انگیٹھی سے گرم کر لیا جاتا تھا۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ قلعہ دہلی کا حمام شاید شاہجہاں اور عالمگیر کے بعد پھر گرم نہ ہوا ہو۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مشہور ہے کہ سوا من لکڑی سے وہ گرم ہوتا تھا۔[۲]

موتی مسجد موتی مسجد کا طول چالیس فٹ اور عرض تیس فٹ ہے اور اُس کی بلندی فرش سے چھت تک پچیس فٹ ہے اور اس کے مرغولہ دار در ساڑھے تین فٹ کی اونچی کرسی پر ایستادہ ہیں۔ اولاً اس کے گنبد سنہری تھے۔ لیکن غدر کے بعد ان کا بھی وہی حشر ہوا جو مثمن برج اور دیوان عام کی برجیوں کا۔ چنانچہ موجودہ سنگ مرمر کے گنبد بعد کے تعمیر شدہ ہیں۔ جن کو بلحاظ جسامت کے مسجد کی عمارت سے زیادہ مناسبت نہیں۔ اصلی سنہری گنبد غالباً اُس سے بہت چھوٹے ہوں گے سید احمد خاں اور کار اسٹیفن اس کا سال بنا ۱۰۷۰ھ مطابق ۱۶۵۹ء تحریر کرتے ہیں لیکن محمد کاظم مصنف عالمگیر نامہ لکھتا ہے کہ اس کی تکمیل ۱۰۷۳ھ میں ہوئی اور اس کی زینت اور آراستگی اس سے بھی ایک سال بعد عمل میں آئی۔ شاہجہاں نے قلعہ میں کوئی مسجد تعمیر نہیں کرائی تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادائے نماز کے لیے جامع مسجد کو جایا کرتے تھے شاہنشاہ اورنگ زیب نے جس کا زہد و تقوی محتاج بیان نہیں اس کمی کو محسوس کر کے مسجد مذکورہ کا قلعہ میں اضافہ کیا۔

جو صورت محمد کاظم نے مسجد مذکور کی بیان کی ہے اور اس کا تطابق عمارت موجودہ سے کافی

---

[۱] مرات آفتاب نما ورق ۲۶۹

[۲] آثار الصنادید باب دوم صفحہ ۴۴

واقع نہیں ہوتا۔ غالباً غدر کے بعد اُس کے موجودہ برج سنگِ مرمر کے بنائے گئے اس کے ایوانوں میں بھی ترمیم و تنسیخ عمل میں آئی اور اس ہی سلسلہ میں اس کی تاریخ بھی جس کا ذکر محمد کاظم نے کیا ہے ضایع ہو گیا۔

ہیرا محل

ہیرا محل ایک سنگِ مرمر کی بارہ دری ہے جو حمام کے شمال میں واقع ہے۔ یہ طول میں بائیس فٹ پانچ انچ اور عرض میں انیس فٹ پانچ انچ ہے۔ اور اس کے ہر ضلع میں تین کھلے ہوئے در ہیں۔ اس کو بہادر شاہ ثانی نے ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کا شاہ جہانی عمارات کے ساتھ مقابلہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آخری دَور مغلیہ کی عمارتیں شاہ جہانی عمارات سے وضع قطع و فن صناعی میں کس قدر گری ہوئی تھیں۔

شاہ بُرج

یہ بُرج قلعہ کی شرقی دیوار کے شمالی کنارہ پر واقع ہے۔ سنگِ مرمر کا دالان جو اس کے جنوب میں ہے نہایت خوبصورت ہے اگرچہ اس سے بھی فن تعمیر کے اُس تنزل کا پتہ چلتا ہے جس کا آغاز اورنگ زیب کے زمانہ سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس کا طول تریسٹھ فٹ تین انچ اور عرض بتیس فٹ ہے شمالی دیوار کے وسط میں ایک خوش قطع آبشار ہے جس کا ڈھلان ایک سنگِ مرمر کے حوض میں کو ہے غدر کے بہت دنوں بعد تک یہاں فوجی افسروں کا مقام رہا لیکن ۱۹۰۲ء میں اس کی مرمت عمل میں آئی آبشار کو درست کر کے جدید ترمیمات جو فوجی افسروں کی رہایش کی غرض سے اس میں کر دی گئی تھیں توڑ ڈالی گئیں۔ ۱۹۰۴ء کے زلزلہ میں اس کو اس قدر نقصان پہونچا کہ یہ ضروری معلوم ہوا کہ اس کو توڑ کر قریب قریب از سرِ نو بنایا جائے۔ برج جو سنگِ مرمر کے دالان کے عقب میں ہے ہشت پہل اور دو منزلہ ہے اولاً اس کی چھت پر ایک گنبد دار چھتری تھی جیسا کہ اسد برج پر ہے جو قلعہ کے جنوب مشرقی گوشہ میں واقع ہے۔ لفٹننٹ فرنکلن دہلی کا حال بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ "شاہی باغات میں ایک بڑا ہشت پہل کمرہ مشرف بدریائے جمن ہے جس کا نام شاہ برج ہے اس میں سنگِ مرمر کا فرش ہے اُس ہی کے دریچہ سے مرزا جواں بخت ولی عہد شاہ عالم ثانی لکھنو کو فرار ہوئے تھے اور چونکہ اُس کی اونچائی زیادہ

نہیں ہے۔ اس لیے شاہزادہ موصوف کی فراری آسانی سے عمل میں آئی۔ لفٹننٹ صاحب کا یہ بھی بیان ہے کہ "آخری دورِ مغلیہ میں حملہ آوروں کے ہاتھوں سے اس عمارت کو بہت کچھ نقصان پہونچا۔ خاص کر غلام قادر خاں کی فوج کے روہیلوں سے جو اس کے سنگِ مرمر کے فرش پچیکاری و منبت کاری کے قیمتی پتھر اکھیڑ لے گئے"۔ روہیلے مذکورہ قلعہ کی عمارات کے فرش کو تین روز تک متواتر اس خزانہ کی تلاش میں کھودتے رہے جس کا اُن کو شبہ تھا کہ شاہ عالم کے محلات میں کہیں نہ کہیں دفن ہے۔ اس عمارت اور حمام کے درمیان چبوترہ پر سنہ ۱۹۱۱ء میں گھاس لگائی گئی تھی اور توپ خانہ کی بیٹری جو چبوترہ کے وسط میں تھی سنہ ۱۹۱۴ء میں منہدم کردی گئی۔

نہرِ بہشت جس سے قلعہ کی تمام نہروں و فواروں کو پانی پہونچتا تھا یہیں سے نکلتی تھی اور قلعہ کے شرقی دیوار پر ہوتی ہوئی دیگر عمارات میں جاتی تھی۔ کین صاحب کا خیال ہے کہ شاہزادہ جواں بخت[1] سلیم گڑھ سے فرار ہوئے تھے جہاں وہ اپنے رہنے کے کمرہ سے پوشیدہ طور پر نکل کر محلات و دیگر عمارات کی چھتوں پر سے ہوتے ہوئے پہونچے تھے۔ رات اندھیری تھی اور شاہزادہ اگرچہ بخار میں مبتلا تھا لیکن وہ اس راستہ سے جہاں سے کہ نہرِ فیض (جس سے نہرِ بہشت میں پانی پہونچتا تھا) قلعہ میں داخل ہوتی ہے سلیم گڑھ کی دیوار پر پہونچ گیا اور وہاں سے رسی کے ذریعے سے اُتر کر دریا کے کنارے[2] اپنے دوستوں سے جا ملا۔

بشپ ہیبر جو سنہ ۲۵-۱۸۲۴ء میں دہلی آئے تھے۔ شاہ برج کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ:۔

"چبوترہ پر گوشہ میں ایک خوبصورت ہشت پہل عمارت ہے جو سنگِ مرمر کی ہے اور اس میں پچیکاری سے بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے وسط میں ایک فوارہ ہے اور ایک گوشہ میں ایک خوبصورت غسلخانہ ہے۔ اس عمارت کے دریچوں سے شہر اور اُس کے

---

[1] جواں بخت ولی عہد شاہ عالم ثانی یہ چاہتے تھے کہ برطانوی گورنر جو لکھنو میں آئے تھے اُن کو دہلی کی ابتر حالت سے مطلع کریں جو مرزا نجف خاں متوفی امیر الامرا کی ہمشیرہ کی سازش سے افراسیاب خاں کے امیر الامراء بنائے جانے کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی۔

[2] فال آف دی مغل ایمپائر مصنفہ کین صفحہ ۱۴۰

قرب و جوار کا بہت اچھا منظر نظر آتا ہے[1] لیکن جب میں نے اُسے دیکھا تھا تو وہ نہایت غلیظ و ابتر حالت میں تھی یعنی حمام و فوارہ خشک پڑا تھا منقش فرش کوڑے کرکٹ سے ڈھکا ہوا تھا اور دیواریں چمگادڑ اور پرندوں کی بیٹ سے لپسی ہوئی تھیں۔"

اسد بُرج اسد بُرج قلعہ کی شرقی دیوار کے جنوبی گوشہ پر واقع ہے اس کی قطع شاہ برج کی سی ہے لیکن اُس کے سامنے سنگ مرمر کا دالان نہیں ہے۔ ۱۸۰۳ء میں ہرناتھ چیلہ کے حملہ سے اس برج کو بہت نقصان پہونچا تھا جبکہ اس کے مقابلہ میں جرنیل آکٹرلونی نے شہر کی حفاظت کی تھی۔ اکبر شاہ ثانی نے برج مذکور کی از سر نو مرمت کرائی۔

باغ حیات بخش اس باغ کے اصلی رقبہ کا صرف نصف حصہ اب باقی ہے۔ مغربی نصف حصہ میں فوجی بارکیں بن گئی ہیں۔ اس کے شمال و جنوب میں ایک عمارات کا سلسلہ تھا جس کے وسط میں ساون بھادوں تھے۔ شرقی و غربی نہروں کے سروں پر بھی جو وسطی حوض میں گرتی تھیں عمارات تھیں۔ لیکن یہ سب عمارتیں سوائے ساون و بھادوں کے اب منہدم ہوگئی ہیں۔ شرقی نہر کے سرے والی عمارت موتی محل کے نام سے مشہور تھی جو مثل دیگر عمارات کے مسمار ہوگئی۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں جب توپ خانہ کی بارکی باغ کے شرقی چبوترہ سے ہٹائی گئی تھی تو البتہ اس کی بنیادوں کے نشانات ملے تھے۔ محل مذکور کا حال آثار الصنادید میں اس طرح پر درج ہے جو مرأت آفتاب نما کا مختصر ترجمہ ہے

"یہ ایک محل ہے سنگ سرخ کا اور اس کو سنگ پٹھانی سے سفید کر کے رنگ آمیزی و طلاکاری کے گل بوٹے بنائے تھے اس میں ایک درجہ ہے پندرہ گز لمبا اور آٹھ گز کا چوڑا مشتمل دو شہ نشینوں پر اور اس کے بیچ میں ایک حوض ہے چار گز کا لمبا اور تین گز کا چوڑا اور ہر ایک شہ نشین کے پیچھے ایک ایک درجہ ہے آٹھ گز کا لمبا اور پانچ گز کا چوڑا اور ایوان رفیع پانچ پانچ در کے کہ جانب شرقی

---

[1] شاہ برج کی چھت پر اولاً ایک گنبد دار چھتری تھی۔ لیکن تیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا کہ اس کو میرٹھ اُٹھا لے گئے۔ جہاں وہ ایک کنوے پر نصب ہے۔

سے مشرق بدر رویہ ہے اور جانب مغرب سے مشرق یہ باغ حیات بخش اور ہر
ایک ایوان کا طول تیس گز کا اور عرض سات گز کا ہے اندر کی عمارت میں ازارہ
تک سنگ مرمر لگا ہوا ہے اور باقی سنگ سرخ کا ہے اور اس کو سنگ پٹھالی
سے سفید کیا ہے اور اس میں حوض و نہر ہے اس میں سے ایک چادر (پانی کی)
دو گز کے عرض سے جانب باغ حیات بخش حوض میں گرتی ہے[1]"

حیات بخش باغ کے مغرب میں ایک اور باغ تھا جس کا نام مہتاب باغ تھا اور وہ اس بازار تک جاتا تھا جس کا سلسلہ نوبت خانہ کے سامنے والے چوک میں کو ہو کر شمالاً جنوباً دور تک چلا گیا تھا۔ اس باغ کے رقبہ پر بھی اب بارکیں بن گئی ہیں اور اس کے متعلق کل عمارات قطعی منہدم ہو گئی ہیں لیکن اغلب ہے کہ زمین کی کھدائی و صفائی ہونے پر حوض اور نہروں کے نشانات ملیں۔

محمد صالح نے "باغ حیات بخش" کی تعریف نہایت مبالغہ کے ساتھ کی ہے وہ اس کو مثل باغ ارم کے تحریر کرتا ہے اور فوارہ دار نہروں اور حوضوں اور مکانات وغیرہ کی توصیف میں رطب اللسان ہے، سید احمد خاں اس باغ کے متعلق ---- تحریر کرتے ہیں جو عمل صالح کا مبتذل اردو ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

"کسی زمانہ میں یہ باغ بہت خوب اور نہایت تیار تھا مگر اب بالکل ویران اور خراب ہے حضور والا ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی، کو اس کی آراستگی پر توجہ نہیں ..... اس باغ کے بیچوں بیچ میں ایک حوض ہے ساٹھ گز سے ساٹھ گز اور اس کے بیچ میں کسی زمانہ میں انچاس فوارے چاندی کے لگے ہوئے تھے اور دن رات چھوٹتے تھے اور اس کے کناروں پر چاروں طرف ایک سو بارہ[2] فوارے چاندی کے تھے کہ وہ بھی نہر کے سبب دن رات چھوٹا کرتے تھے اس حوض کے چاروں طرف سنگِ سرخ کی نہر چھ گز کے عرض سے بہتی تھی اور ہر نہر

---

[1] آثار الصنادید باب دوم صفحہ ۴۴ تا ۴۵ [2] مرات آفتاب نما ورق ۲۶۸

میں تیس تیس فوارے چاندی کے ہر وقت چھوٹتے رہتے تھے

ساون

اس باغ میں جانب جنوب ایک مکان ہے سنگ مرمر کا بہت نفیس و لطیف اس کو بھادوں کہتے ہیں۔ چہرہ اس کا یہ ہے کہ ایک چبوترہ و کرسی دے کر بنایا ہے اور اس پر سولہ ستون لگا کر ایک ایوان دلکشا تعمیر پایا ہے مشتمل اوپر دو ایوان کے جانب شرق و غرب اور دو بنگلے ہیں آگے اور پیچھے کہ ان ستونوں کے سبب بیچوں بیچ میں ایک چوکھنڈی بن گئی ہے اور اس میں ایک حوض[1] سنگ مرمر کا ہے چار گز پندرہ تسو کا مربع اور ڈیڑھ گز گہرا اس مکان میں نہر بہشت سے نہر آتی ہے اور حوض میں چادر ہو کر پڑتی ہے پھر اس میں سے نکل کر آگے ایک اور چادر چھوٹتی ہے اور نہر میں پڑتی ہے یہ عمارت بھی بہت نادر ہے اور اس میں پانی کا پھنا اور چادر کا چھوٹنا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا بھادوں کا مینہ برستا ہے اور اسی سبب سے اس مکان کا بھادوں نام رکھا ہے اب اس مکان میں پانی آنے کا اور چادریں چھوٹنے کا رستہ بالکل بند ہو گیا ہے اس مکان کے حوض اور چادروں میں محرابی چھوٹے چھوٹے طاق بنا دیے ہیں دن کو ان میں گلدانہائے رنگین رکھے جاتے تھے اور رات کو شمع کافوری روشن ہوا کرتی تھیں اور اس کے اوپر سے پانی کی چادر پڑتی تھی اور اندر سے ان پھولوں کی خوشنمائی اور چراغوں کی روشنی عجیب عالم دکھاتی تھی اس کی چھت کے چاروں کونوں پر بھی چار برجیاں چوکھنڈی کی سنہری بنی ہوئی ہیں۔

بھادوں

اسی باغ میں جانب شمال یہ عمارت ہے نری سنگ مرمر کی نہایت نفیس اور بہت تحفہ کہ اس کی لطافت و نفاست حد بیان سے باہر ہے اور چہرہ اس کا بعینہ مثل چہرہ بھادوں کے ہے بال برابر بھی فرق نہیں گویا ایک مکان کو

---

[1] یہ حوض اب نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بعد مرمت کے وقت اس کو پاٹ دیا گیا۔ البتہ ساون کا حوض باقی ہے۔

سلیم گڑھ یا نور گڑھ سلیم گڑھ کو شیر شاہ کے بیٹے اسلام شاہ نے ہمایوں کا حملہ روکنے کے لیے ۱۵۴۶ء میں بنایا تھا اس کا محیط قریباً پون میل کے … ہے۔ اس قلعہ کے انیس برج تھے اور کہتے ہیں کہ اس پر چار لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ سلیم شاہ کے وفات کے بعد یہ قلعہ یوں ہی نامکمل رہ گیا فرید خاں ملقب بمرتضٰی خاں نے جو اکبر و جہانگیر کے دربار کے ایک امیر تھے اس میں کچھ مکانات بنائے تھے۔ ۱۸۲۸ء میں یہ عمارات تباہ ہو چکی تھیں لیکن اکبر شاہ ثانی کی توجہ سے ایک دو منزلہ عمارت اور باغ بہتر حالت میں تھے اور وہ اکثر یہاں ہواخوری کیا کرتے تھے۔

۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کو اندھا کر کے اسی قلعہ میں قید کیا تھا اور چند روز بعد وہ خود مع اپنے ہمراہیوں کے اسی قلعہ کے راستہ سے فرار ہوا تھا جہانگیر نے اس قلعہ کے راستہ کے لیے ایک پُل بنوایا تھا جس کو منہدم کر کے موجودہ ریلوے کا پُل تعمیر کیا گیا ہے۔ جہانگیر کے پُل بنانے کے بعد یہ قلعہ نور گڑھ کے نام سے مشہور ہو گیا تھا (دیکھو آثار الصنادید باب دوم صفحہ ۲۸) جہانگیر پُل کی تاریخ کے دو کتبے پُل مذکور ثبت تھے ان میں سے ایک عجائب خانہ دہلی میں موجود ہے اور دوسرا کہیں ضایع ہو گیا۔

(بقیہ صفحہ) حصص کو سیراب کرتی ہیں اس طرح تحریر ہے۔

۱۳۵۱ء میں شاہنشاہ فیروز شاہ نے ہانسی و حصار میں آبیاری کے واسطے دریائے چوٹنگ سے یہ نہر کاٹی۔ ۱۳۶۸ء میں قصبہ کتھیل متصل کرنال سے آگے یہ نہر بند ہو گئی۔

۱۵۶۸ء میں شاہنشاہ اکبر نے فیروز شاہ کی نہر کو پھر کھدوایا اور دریائے جمن "سومب" سے پانی کو دریائے کنشک میں ڈالکر ہانسی و حصار تک آبا ری کا بندوبست کیا۔ اکبر کی ایک سند بھی اس نہر کے متعلق دستیاب ہوئی ہے۔ ۱۶۲۶ء میں علی مردان خاں شاہ جہاں کے انجنیئر نے دہلی تک ایک نہر تیار کی جو اولاً گوہانہ کو ہوتی ہوئی لائی گئی لیکن جب اس سے کام نہ چلا تو پانی پت اور سونی پت میں کو اس کا اجراء ہوا اس کے بنانے میں ایک کثیر رقم صرف ہوئی تھی اور فن تعمیر کے کمال دکھائے گئے تھے۔

۱۷۸۷ء میں ہریانہ یعنی ہانسی و حصار تک پانی آنا بند ہو گیا۔

نہرِ بہشت اس نہر کے تاریخی واقعات جس کے ذریعہ سے قلعہ شاہ جہاں میں پانی لایا گیا تھا خالی از دلچسپی نہیں۔ مآثر الامراء اور عمل صالح میں اس کے حالات تفصیل کے ساتھ دیے ہوئے ہیں۔ اول الذکر کتاب میں تحریر ہے کہ اس کا نام نہرِ بہشت شاہجہاں کا رکھا ہوا ہے[1]۔ سید احمد خاں جنھوں نے نہر مذکور کے حالات غالباً کتب ہائے مذکورہ و نیز مرأت آفتاب نما سے اخذ کئے ہیں تحریر کرتے ہیں:

"اول بانی نہر کا سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی ہے۔ اس نے سنہ ۶۹۱ھ مطابق سنہ ۱۲۹۱ء کے اس نہر کو سواد پرگنہ خضر آباد میں دریا سے کاٹا اور تیس کوس تک پرگنہ سفیدوں میں جہاں اُس کی شکارگاہ تھی لاکر چھوڑ دیا پھر کسی بادشاہ کو اس کا خیال نہ رہا کہ وہ نہر بند ہو گئی تھی۔ سنہ ۹۶۹ھ مطابق سنہ ۱۵۶۱ء کے جلال الدین اکبر بادشاہ کے عہد میں شہاب الدین احمد خاں صوبہ دار دہلی نے اس نہر کو پھر صاف کرایا اور اپنی جاگیر میں لایا اور نہر شہاب اس کا نام رکھا: مدت بعد یہ نہر پھر بند ہو گئی۔ سنہ ۱۰۴۸ھ مطابق سنہ ۱۶۳۸ء کے شہاب الدین محمد شاہ جہاں نے اس نہر کے سفیدوں تک صاف ہونے کا اور سفیدوں سے قلعہ شاہجہانی تک نئی نہر کھودنے کا حکم دیا۔ چنانچہ یہ نہر تیار ہوئی اور جب قلعہ بن چکا تو قلعہ اور شہر میں جاری ہوئی ایک مدت بعد اس نہر کا وہی حال ہو گیا تھا تخمیناً سنہ ۱۸۲۰ء مطابق سنہ ۱۲۳۶ھ کے سرکار انگریزی نے پھر نہر کو جاری کیا؛ اب تک بدستور جاری ہے اور مرمت اور شکست و ریخت سے تیار اور مصفا رہتی ہے[2]۔"

---

[1] مآثر الامراء جلد سوم صفحہ ۴۶۵ تا ۴۶۶

[2] آثار الصنادید باب دوم صفحہ ۵۳ تا ۵۴۔ دیکھو مراۃ آفتاب نما ورق ۲۷۳۔ ہسٹری اینڈ ڈسکرپشن آف گورنمنٹ کنالس ان دی پنجاب مصنفہ جے ہٹن صفحہ ۱ تا ۳ میں اس نہر کی تاریخ جو اب مغربی جمن کے نام سے موسوم ہے اور جس کی شاخیں اور گولین اضلاع انبالہ و کرنال و حصار و رہتک و دہلی و ریاستہائے پٹیالہ و جند و بیکانیر کے

کتبہ پُل سلیم گڑھ جو عجائب خانہ دہلی میں ہے

اللہ اکبر	بحکم پادشاہ ہفت کشور	جل جلالہٗ	شہنشاہ بعدل و داد و تدبیر	یا فتاح
یا ناصر	جہانگیر ابن شاہنشاہ اکبر	یا فیاض	کہ شمشیرش جہاں را کرد تسخیر	یا حیّ
سنہ ۵	چو ایں پُل گشت در دہلی مرتب	جلوس	کہ وصفش را نشاید کرد تحریر	جہانگیری
باہتمام	پی تاریخ اتمامش خرد گفت	حسین حلبی	پل شاہنشہ دہلی جہانگیر	کتبہ شریف

کتبہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پُل سنہ ۵ جلوس جہانگیری میں حسین حلبی کے زیر اہتمام تعمیر ہوا تھا۔ اور کتبہ مذکورہ شریف نامی خوشنویس نے تحریر کیا تھا۔

